شیرازہ

مغل اور کشمیر نمبر

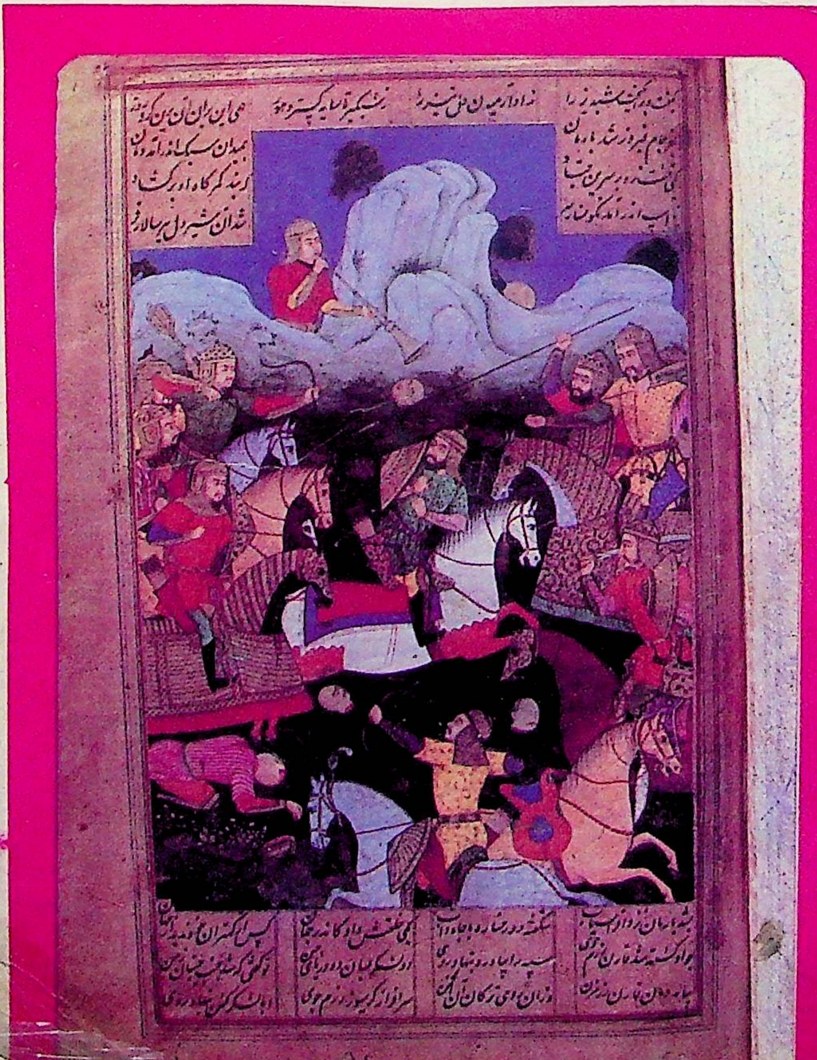

Mughal Aur Kashmir
Number

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر

جلد ۲۸ ★ جنوری۔ مارچ ۱۹۸۹ء ★ شمارہ ۱۔۳

نگران ومدیرِ اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

مدیر

محمد احمد اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

ناشر : سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز۔ سرینگر
کتابت :۔ معراج ترکوی
مطبوعہ : جے، کے، آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی ۶

شرح چندہ :

سالانہ ...... ۲۰ روپے

فی کاپی ...... ۲ روپے

"شیرازہ" میں شائع شدہ مضامین میں ظاہر کی گئی
آراء سے اکیڈمی یا ادارے کا کلّاً یا جزواً متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر "شیرازہ" (اُردو)
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔
لال منڈی ۔۔ سری نگر

سرورق :۔ احمد

ترتیب

پیش گفتار .... محمد یوسف ٹینگ (مدیر اعلیٰ) ۵

مُغل مُصوّری کے دو نادر مرقعے — ایک دریافت محمد یوسف ٹینگ ... ۱۲

کشمیر ابُوالفضل کی نظر میں .... مشعل سُلطانپوری ... ۳۴

بسوہلی مصوری اور مُغل .... سنسار چند شرما ۵۴

مُغلیہ دور میں جموں .... بلدیو پرشاد شرما ۶۱

مُغل دَور کی فارسی شاعری میں کشمیر کا تذکرہ ..... رشید نازکی ۶۵

کشمیر مغل تواریخ میں .... جی، ایم، ربّانی ۸۱

مُغل روڈ — تاریخی پس منظر .... خوش دیو مینی ۹۱

کشمیری اور مغل — محاذ آرائی کے اسباب ...... رشید تاثیر ۱۱۱

سرینگر اور مُغل سلاطین .... مرغوب بانہالی ۱۳۱

کشمیر میں ڈھالے گئے مُغل سکے .... موتی لال ساقی ۱۳۵

جہانگیر اور کشمیر .... سید رسول پونپُر ۱۵۹

شالیمار باغ — قومی یکجہتی کی درخشاں علامت .... اکبر حیدری ۱۷۳

مغل انتظامیہ اور کشمیر ..... ارجن دیو مجبور ۱۹۰

مُغل اور لداخ ..... عبدالغنی شیخ ۲۰۶

مغل دور میں کشمیر کے فارسی شعراء ..... مرغوب بانہالی ۲۱۷

مغل دور کے کشمیری خطاط ..... مولوی محمد ابراہیم ۲۳۲

اورنگ زیب کا سفر کشمیر — برنیر کی زبانی .... برج پریمی ۲۴۴

مُغل فن تعمیر — چند آثار ..... ادارہ ۲۶۴

آصف جاہ کا خواب (افسانہ) ..... جان محمد آزاد ۲۸۹

تین نوشتے — کشمیری انسائیکلوپیڈیا سے ..... موتی لال ساقی ۲۹۴

مترجم :- رحمٰن راہی، جان محمد آزاد

اکادمی کی سرگرمیاں ..... ادارہ ۲۹۹

بزم شیرازہ ..... سری نواس لاہوتی، ۳۱۹

(خطوط سے اقتباسات) ڈاکٹر خورشید سمیع، سید حیات وارثی، عرش صہبائی، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی جی، این، کوترک، خالد عبادی

پیشِ گُفتار

"مُغل" اِصطلاح دُنیا بھر میں خوبصورت باغات، شائستہ فنِ تعمیر اور ذوق کی شرافت (ARISTOCRACY) کا مُترادف بن گئی ہے۔ لیکن مُغلوں کے اصل وطن یعنی فرغانہ اور اندجان میں یہ اصطلاح استعمال میں نہیں ہے۔ اِس لئے اِسے دُنیا کی لفظیات میں ایک ہندوستانی عطا سمجھا جانا چاہیئے۔ سمرقند کے امیر تیمور کے ساتھ رشتہ جوڑتے ہوئے مغلوں کے جد اپنے آپ کو مشرقِ وسطیٰ میں تُرکوں کی سب سے عالی نژاد ذات برلاس سے مُتعلق کرتے ہیں۔ برلاس چغتائی تُرکوں کا ایک قبیلہ تھا اور خود چغتائی عظیم منگول حکمران چنگیز خان کا ایک بیٹا تھا۔ امیر تیمور صاحبِ قرآن اپنے آپ کو "گورگان"[1] کہنے پر بڑا مُصر تھا۔ گورگان کا مطلب خانوادہ چنگیز کا داماد ہے اور تیمور نے یہ رُتبہ چنگیز کے سلسلۂ نسب کی ایک شاہزادی کو اپنے حرم میں شامل کرنے سے حاصل کیا تھا۔ سمرقند میں گورِ امیر کے شاندار مقبرے میں مجھے تیمور کی قبر کا تعویذ غور سے دیکھنے کا موقع مِلا[2]۔ اس پر بہت

---

[1] بعد میں کشمیر کے پہلے مُغل حکمران میرزا حیدر دوغلات بھی اِس لقب کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ میرزا حیدر بابر کے خالوزاد بھائی تھے۔

[2] یہ عجیب اتفاق بھی ملاحظہ ہو کہ روسی حکمرانوں کی تاخت و تاراج کے باوجود آج بھی تیمور کی قبر کے پاس یاک کی دم کا ایک پرچم رکھا ہوا ہے۔ جو چنگیز کا فوجی جھنڈا تھا۔ بلکہ لفظ پرچم منگولی زیارت کا ہے اور اسی جھنڈے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

ہی عرق ریزی سے تیمور کا شجرۂ نسب درج ہے۔ جو اُس کے اور تیمور کے مُشترکہ جدِ امجد بُزن چار تک پہونچتا ہے۔ خود یہ جدِ امجد اسطوری حیثیت رکھتا ہے اور ایک ایسی دوشیزہ کی اولاد بتایا جاتا ہے جس کے ساتھ چاند کی ایک کِرن ہم بستر ہوئی تھی[۱]۔

مُغل دراصل اُزبکستان کے مشرق اور شمال کے بیابانوں سے ہی آئے تھے۔ لیکن چنگیز خان کے وحشی تاتاریوں سے پہلے۔ وہ کئی سو سال پہلے آ کے تُرکی زبان سیکھ چکے تھے۔ جو بابر کے تُزک اور خُوبصورت گیتوں کی بھی زبان ہے اور مغلوں کی نجی اور پرائیویٹ زبان سنہ ۱۷۶۶ء تک رہی۔ مورّخ ہمیں یہ دلچسپ اطلاع دیتے ہیں کہ ایرانی، افغان اور ہندوستانی اُمراء، وُزراء کے درمیان جب کوئی راز ایک دوسرے پر وا انکشاف کرنا چاہتے تو تُرکی زبان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جو صرف اُن کے خونی رشتہ داروں کی سمجھ میں آتی تھی۔ کیا معلوم کسی ایسی ہی صورتحال میں کسی فارسی دان عاشق نے اپنے مُغل محبوب کے ساتھ گفتگو کرتے وقت یہ جُملہ چست کیا ہو ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمے دانم

بہرحال کشمیر کے ساتھ مُغلوں کا پہلا مصافحہ سنہ ۱۳۹۹ء کے قریب ہوا۔ جب امیر تیمور دلّی کی فتح کے بعد کشمیر کے نواح میں دریائے جہلم کے میدانی ساحل سے گُذرا۔ لیکن اُس وقت کے کشمیری فرمانروا سلطان سکندر نے کمال دانائی سے اُس کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجے اور اطاعت کا اظہار کیا اور خود اُسکی مُلاقات کے لئے روانہ ہوا۔ اگرچہ یہ دو عظیم بادشاہ نہ مل سکے لیکن کشمیر کے سُلطان اور کشمیر کے بارے میں تیمور خوشگوار تاثرات لے کر لوٹا اور کشمیر اُس کی افواج کی غارت گری سے محفوظ و مامون رہا۔ جس کے ایک جھٹکے نے ساعت بھر میں دلّی میں پچاس ہزار انسانی کشتوں کے پُشتے لگا دئے تھے۔ بابر ہندوستان کی فتح کے صرف چار سال کے اندر انتقال کر گیا اس لئے اُسے کشمیر کی طرف توجہ کا موقع نہ مل سکا لیکن ہمایوں نے کئی بار کشمیر کو فتح کرنے کے لئے فوج کشی کی۔

---

[۱] تاریخ رشیدی از میرزا حیدر گورگان

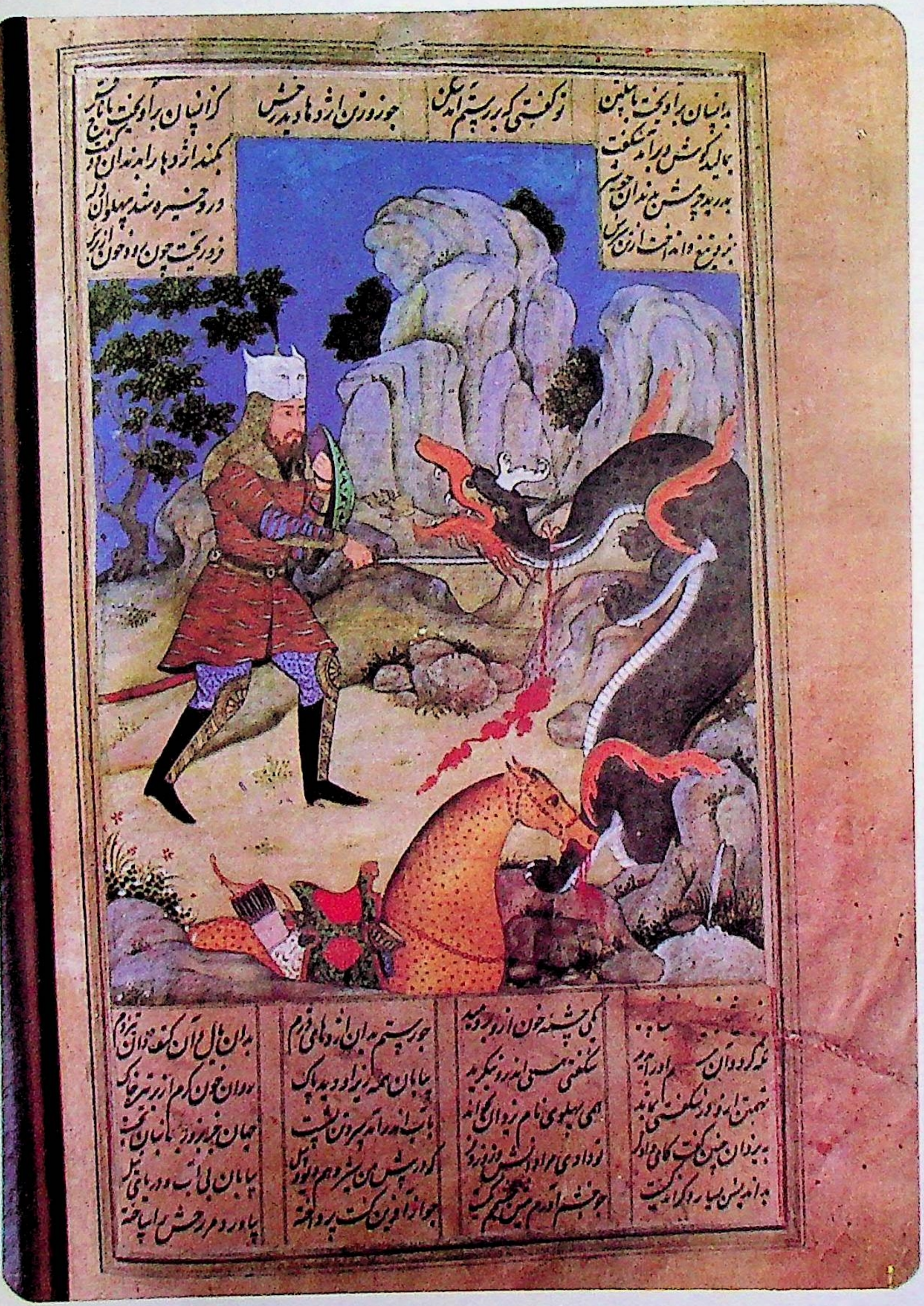

بدانسان برآویخت با پیلتن
تو گفتی که بر رستم آمد شکن
چو زور تن اژدها دید رخش
کزانسان برآویخت با تاجبخش
بمالید گوش و درآمد شگفت
بکند اژدها را بدندان دو کتف
بدرید پوشش بدندان چو شیر
درو خیره شد پهلوان دلیر
بزد تیغ و انداخت از تن سرش
فرو ریخت چون رود خون از برش

[illegible]
یکی چشمه خون از برو بردمید
چو رستم بران اژدهای دژم
بدان یال آن کتف و آن تیز دم
نگه کرد و آن [illegible]
شگفتی همی اندرو بنگرید
بیابان همه زیر او دید پاک
روان خون گرم از بر تیره خاک
تهمتن ازو در شگفتی بماند
همی پهلوی نام یزدان بخواند
باب اندر آمد سر و تن بشست
جهان جز بزور جهانبان نجست
بیزدان چنین گفت کای دادگر
تو دادی مرا دانش و زور و فر
که در پیش من شیر و هم دیو و پیل
بیابان بی آب و دریای نیل
بداندیش بسیار و گر اندکیست
چو خشم آورم پیش چشمم یکیست
چو از آفرین گشت پرداخته
بیاورد رخش را ساخته

کئی بار ناکام ہوا۔ لیکن کشمیری دلّی کے اُبھرتے ہوئے سامراج کی چھیڑ چھاڑ سے اِتنے زچ ہو گئے کہ اُنہوں نے ہمایوں کا نام خلیفہ دوران کی حیثیت سے خطبے میں شامل کر دیا اور اُس کے نام کے سکّے بھی ڈھالے۔ ہمایوں جب شیر شاہ سُوری سے بھاگ کر شمال کی طرف پناہ لینے کے لئے بھاگ رہا تھا تو اُس وقت ایک تجویز کشمیر کے قُدرتی قلعے میں قلعہ بند ہونے کی بھی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا اور وہ کابل پہونچ گیا۔ لیکن ۱۵۴۰ء میں میرزا حیدر نے لداخ کے راستے کشمیر پر دھاوا بول کر کشمیر کا تاج نہ ہی مگر اِسکا حقیقی اِقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یہیں سے کشمیر پر مُغلوں کی تہذیب کے سائے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جو اتنے بے مثل تھے کہ اُنہوں نے ہماری اِس چھوٹی سی وادی کو اپنے وقت کی تہذیب کے بہترین عناصر سے ہم آہنگ کر دیا۔ اُس نے واقعی کشمیر پر آہنی پنجے کے ساتھ حکومت کی۔ لیکن اُس نے کشمیر کو چوب کاری کے جھروکے کی تزئین بھی دی اور ترکی حمام کی گرم آغوش کا لذّت آشنا بھی بنا دیا۔ اِسی طرح اگرچہ بعض لوگ اُسے غلطی سے کشمیر میں شالبافی کا بانی قرار دیتے ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ کشمیری شال میں وہ رنگ، وہ نرمی اور وہ گُل بوٹے اُسی کے وقت میں نکھرے جنہوں نے بعد میں اِسے کشمیری حرفتوں کی آبرو اور خود کشمیر کی شناخت کا پرچم بنا دیا۔ مرزا حیدر کشمیری تواریخ کا ایک بہت ہی مُتنازعہ کردار ہے جس کی قیمت اُسے یہ ادا کرنا پڑی کہ اُس کی ہلاکت کے بعد اُس کے جسد کی حفاظت کے لئے مزارِ سلاطین میں اُس کی قبر پر بہت عرصے تک پہرہ لگا دینا پڑا[1]۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اُس نے کشمیر کی رعنائیوں اور لذتوں کا دامن وسیع کیا۔ وہی تو تھا جس نے کشمیر میں سبزہ پائے کو رواج دیا اور شاد آلو (چیری) اور کچھ دوسرے میوے متعارف کئے۔ اکبر بادشاہ نے اپنے سالِ جلوس کے کچھ ہی عرصے کے بعد کشمیر پر پھر للچائی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ لیکن اُس کی فوجوں کو بار بار کشمیری سورماؤں کے علاوہ کشمیر کے موسم کی لام بندی کے آگے پسپا ہونا پڑا۔

---

[1] مزار جہاں شہمیری خاندان کے اکابر دفن ہیں۔ زینہ کدل میں جہلم کے کنارے واقع ہے۔ مرزا حیدر کی قبر امتدادِ زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی لیکن اُس کے اچھے کاموں کی وجہ سے گذشتہ صدی میں انگریزی سفیر اور سیاح ولیم مور کرافٹ نے اِس پر تازہ لوح نصب کر دی۔

چنانچہ پھر وہ سامراج کے بدترین ہتھکنڈوں پر اُتر آیا۔ اور اُس نے کشمیر کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک کو پیمان شکنی کے ذریعے اپنے وطن سے دور کر دیا۔ اس بدعہدی کا وار خود اُس کے عصر میں اتنا فریب کارانہ تھا کہ خود اُس کے متعمد سپہ سالار راجہ بھگوان داس نے اپنے وعدے کی لاج رکھنے کے لئے اپنے ہی شکم میں خنجر گھونپ دیا۔ اور اس کی وعدہ شکنی کی بدبو چار سو سال کے بعد آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کے ونسنٹ سمتھ سے لکھوائی ہے کہ یوسف شاہ کے ساتھ دھوکہ اکبر اعظم کے عام طور پر صاف ستھرے دامن پر سب سے بدنما داغ ہے۔ کشمیر کے بہت سے مورّخ اور بہت سے سیاسی رہنما عام طور پر اکبر کے قبضۂ کشمیر یعنی ۱۵۸۶ء سے کشمیر کی غلامی کا آغاز کرتے ہیں۔ سطحی اور ظاہری حیثیت میں یہ صحیح ہے۔ لیکن اُس معیار سے تو کشمیر اُس وقت بھی غلام بنا تھا جب پاٹلی پتر کے راجہ اشوک نے کشمیر کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ واقعات گواہ ہیں کہ جس طرح اشوک کے وقت میں کشمیر ایک بہت شاندار اور پُر امکان تحریک و تہذیب کی جست گاہ یا LAUNCHING PAD بن گیا اُسی طرح مغلوں کے کشمیری تسلط کے بعد کشمیر کی کایا پلٹ گئی۔ اس بات پر اختلاف موجود ہیں کہ اُنہیں کشمیر آنے کی دعوت دینا صحیح تھا یا غلط۔ لیکن اس دعوت کی واقعیت سے کسی کو انکار نہیں۔ اور یہ دعوت دینے والے کشمیر کے بہت بڑے دانشور، دیں پناہ اور شرفاء میں سے تھے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کا باطن ایک تبدیلی، ایک تازہ لمس کے لئے آمادہ تھا۔ اور مغلوں نے اپنے پونے ۲سو سال کے راج میں ثابت کر دیا کہ اُن کا قیامِ کشمیر، کشمیری تہذیب کی بالیدگی کا زمانہ ثابت ہوا۔ اُنہوں نے کشمیر کو فرسودگی اور پسماندگی کی ظلمت سے نکال کر ایک جھلملاتی ہوئی دُنیا میں لایا۔ اُن کے اچھے خاصے اندازِ کشمیر کا نقشہ تیار کیجئے تو اُن کی عطا کے بہت سے گوشے سامنے آئیں گے۔ اُنہوں نے یہاں فلاح اور رفاہِ عامہ کے کام شروع کئے اور اس کا اعلان خود مغلِ اعظم اکبر نے ناگر نگر شہر کے ہاتھی دروازے پر رقم کیا۔ اُنہوں نے بیگار کو ختم کیا۔ ورنہ اس کتبے میں "نہ گیرد ہیچ کس بیگار ایں جا" کی عبارت کا مطلب کیا ہے؟۔ اُنہوں نے کشمیر کو صرف فردوس کے تصوّراتی باغات کے حقیقی تحفے ہی عطا نہیں کئے۔ بلکہ اس کا تصوری ایک

وسیع باغ کی حیثیت سے کیا اور جبھی جہانگیر جیسے پکار پکار کر کہتا ہے "اِسے ملک مت کہو، یہ تو ایک باغ ہے۔ قُدرت کا لگایا ہوا باغ۔" اُنہوں نے کشمیر کو ایک نئے فنِ تعمیر کے ذوق اور ذائقے سے آگاہ کر دیا۔ یہ شہمیریں اور چکوں کی چوب کاری کے بعد پھر کشمیر کے قدیم تعمیراتی ذریعے یعنی پتھر کی طرف مراجعت کا اقدام ہے۔ حالانکہ اِس کی کیفیت، تشکیل اور تاثر مختلف تھی اُنہوں نے شالامار باغ کی بارہ دری ایک بند محل کی طرح نہیں بلکہ ایک فراخ اور کشادہ خیمے کی طرح تعمیر کی۔ یہ اُن کی صحرائی خصلت اور عادت کی کچھ غیر شعوری اور کچھ دانستہ بازگشت تھی[1]۔ جہانگیر تو اپنے آخری وقت میں صرف کشمیر کی آرزو کرتا رہا اور کس کو معلوم نہیں کہ اُسکی وصیت، جس کے مطابق اُس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اُسکو ویری ناگ میں دفن کیا جائے، پر اس لئے عمل نہیں ہو سکا کیونکہ اُس کی ملکہ نور جہاں کو اُس میں امورِ مملکت کی مصلحت نظر نہ آئی۔

مغلوں نے کشمیر کی صنعتوں کو عالمی سطح پر پہونچا دیا۔ اُن کے زمانے میں ہی جامہ وار شال اپنی اندر سبھائی نزاکت، نفاست اور نقش نوازی سے ہم کنار ہوا۔ بلکہ یہ بادشاہوں کا لباس قرار پایا۔ جامہ وار کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُتنے طول و عرض کا شال جس سے طبقہ اُمرا کا ایک ملبوس تیار ہو سکے۔ مُغلوں کے بعد کشمیری شال کی صورت زوال پذیر ہوگئی، تقریباً مسخ ہوتی گئی۔ اُنہوں نے کشمیر میں نگینہ سازی کی صنعت شروع کی۔ اُنہوں نے قالین بافی میں کشمیر کو عالمی سطح پر لایا۔ اُنہوں نے کشمیر کے نفیس ترین چشمہ ساروں کی گویا دریافت کرکے اُن پر بہت ہی عمدہ

---

[1] مُغلوں کو اپنے صحرائی خیموں میں بود و باش کس قدر اچھی لگتی تھی اُس کا اندازہ اِس بات سے ہوگا کہ تیمور نے سمرقند میں جہاں تمام وقت کی کچھ سب سے عالی شان اور خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اپنے لئے ایک وسیع باغ میں خیمے میں رہنا ہی پسند کیا۔ اِس باغ کی صدر ڈیوڑھی پر سجے سجائے ہاتھی جھومتے تھے، جن کو ہرے اور لال رنگوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔

تعمیرات بنائیں اور اُن کے ارد گرد چمن زاروں کے رنگین حاشیے بہم کئے۔ اُن کے وقت میں کشمیری حکمران طبقے کے برابر تصوّر ہوتے۔ تواریخ میں یہ روایت موجود ہے کہ مُغلوں کے پاس اپنی عالی نسبی کے ثبوت بہم کرنے کے لئے ہندوستانی نسل کے اُمرا کشمیر آکر یہاں کی عورتوں سے شادی رچاتے تھے، تاکہ اُن کی اولاد میں اُس پاکیزہ رنگت کا پرتو نظر آئے[۱] جو مغلوں کے اپنے ضمیر میں مضمر تھی۔ اُنھوں نے کشمیر میں خطاطی کے فن کو اِس قدر عروج دیا کہ کشمیری اُن کے شاہی خطاطوں میں شمار ہوتے تھے۔ جن میں محمد حسین زریں رقم کشمیری اور محمد مراد شیریں رقم جیسے خوشنویس بھی تھے جو نستعلیق طرز کے سب سے اعلےٰ نمائندوں میں شُمار ہوتے ہیں۔ اس بات کا یقین کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ تاج محل کے بعض طُغرے کشمیری خطاطوں نے تحریر کئے تھے۔ مُغلوں نے کشمیر میں مصوّری کی روائت کو آگے بڑھایا اور یہاں اُس کی کارگاہیں قائم کیں۔ اُنھوں نے کشمیر میں نہ معلوم کتنے نئے اور نایاب پھول اور ثمر دار شجر متعارف کرائے۔ اُن کے زمانے میں کشمیریوں پر زیادتیاں کرنا آسان نہ تھا اور اعتقاد خان جیسے صوبیدار کو اس کی سزا یہ ملی کہ جامع مسجد سرینگر کے صدر دروازے پر اُسکی بداعمالیوں کے سُدھار کے لئے نقش بہ حجر اعلان آج بھی اُس کی رُسوائی کے سامان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مُغلوں نے کشمیر میں فنونِ لطیفہ کی دوسری شاخوں کے علاوہ خاص طور شعر و سخن کو فروغ دیا۔ اُنہی کی سرپرستی اور سایہ آسائی سے اُس زمانے کے چند اکابر سخنوُر کشمیر آئے اور اِسکی شعری روایات میں ہیروں کی طرح جڑ گئے۔ اِنمیں فیضی، عرفی، طالب، کلیم، قدسی اور بیسیوں دوسرے مشاہیر شامل تھے۔ یہ زمانہ کشمیر میں فارسی سُخن سرائی کی عظمت کا زمانہ تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ

---

[۱] کشمیری لوک ادب میں مغلوں سے متعلق بیسیوں محاورے کہاوتیں وغیرہ موجود ہیں جن میں اُن کی شان و شوکت کے علاوہ کشمیریوں کے دلوں میں اُن کے تئیں محبت نہ سہی احترام کا جذبہ جھلکتا ہے۔ "موغلانی" یعنی مُغلانی آج بھی کشمیر میں خوب صورت ترین عورت کے لئے برتا جاتا ہے۔

سنسکرت یُگ کے کشمیر کے بڑے ذہن پھر جاگ اُٹھے ہیں اور اُن کے قلموں پر پارسی سرائی کا سودا سوار ہو گیا ہے۔ اُن کے زمانے میں کشمیر کے تخلیقی سرچشمے اِس جوش سے اُبلے کہ اِسمیں سے صرفی، مُلّا محمد شاہ آبادی، مُلا محسن فانی اور غنی کاشمیری جیسے علم تاریخ اور شعر شناسی کے گوہر سامنے آگئے۔ اورنگ زیب عالمگیر جیسے پرہیزگار بادشاہ نے کشمیر کو قُبۂ اسلام قرار دیا۔ اور اِسے اجمیر شریف کی قیمت پر موئے پاک آنحضور صلعم جیسے منوّر تبرک کی مستقل قرارگاہ قرار دیا۔ یہ تفصیل بہت ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ تو ایک کتاب کا ساحل بھی لبریز کر دے گی۔ کیا ایسے زمانے کو صرف اِس بناء پر غلامی کو توسیع قرار دینا صحیح ہو گا کہ سیاسی لحاظ سے اُن کا مُستقر کشمیر سے باہر تھا؟ ہندوستان کو موجودہ ہندوستان بنانے کا اصل سہرا جس طرح انگریزوں کے سر ہے اُس سے بہت زیادہ کشمیر کو اس کا تہذیبی آب و رنگ عطا کرنے کا افتخار مُغلوں کو ہے۔ انگریز صنعتی انقلاب کے نقیب تھے اور اسکی کچھ برکتیں اپنی خواہش کے برعکس تاریخ کی غیر محسوس مگر جابر قوتوں کے دباؤ کے تحت لے آئے اور کچھ اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل و تحفّظ کے لئے۔ لیکن مُغل فی الواقعی کشمیر سے محبت کرتے تھے۔ اُنہیں ہندوستان کے حرارت کدے میں صرف کشمیر اپنے آبائی وطن یعنی اندجان کے مُتشابہ لگتا تھا۔ اُنہوں نے شعوری اور دانستہ طور کشمیر کو اوپر اُٹھانے اور جمیل تر بنانے کی سعی کی۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں سے پہلے اور مغلوں کے بعد کے کشمیر میں کیفیت کا اتنا بڑا فرق ہے کہ اِس کا سرسری جائزہ لینے سے دیدہ و دل پر حیرانی چھا جاتی ہے۔ مغلوں کی چھتر چھایا سے باہر آنے کے بعد کشمیر کا افاغنہ، خالصہ اور ڈوگرہ وقت میں جو حشر ہوا۔ وہ اُن کی کشمیر نوازی کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اُنہوں نے بھلے سے ہی کشمیر میں چنار مُتعارف نہ کئے ہوں۔ لیکن کشمیر کے بہت سے خوبصورت چنار باغ اُنہی کی یادگار ہیں[1]۔ اور اِسی لئے

---

[1] مُغل کشمیر میں چنار نہ لائے تھے۔ اُس کا ثبوت صرف لل دید کا یہ مصرع ہی نہیں کہ "اُکس آسان چھے رنی زن شیہج بونی"۔ بلکہ تزک جہانگیری کا یہ بیان بھی ہے کہ بادشاہ نے ایک چنار کے کھوکھلے تنے میں درجن بھر گھوڑ سواروں کے ساتھ پناہ لی تھی۔ ایسا تنا سینکڑوں سال کے بعد ہی وجود میں آسکتا تھا۔ اسی طرح باغ داراشکوہ (قتل: ۱۶۵۷ء) میں ایک کے تنے کا گھیر ۱۴.۵ فٹ ہے اور یہ صرف تین سو سال میں تیار نہیں ہو سکتا۔

چنار مبالغے کی خوش فہمی میں اُن کے ساتھ منسوب ہو گئے ہیں۔ اُن کا زمانہ کشمیر میں امن، خوشحالی، موسیقی ریزی نقش پذیری، دانشوری اور علمی چہل پہل کا زمانہ تھا۔ اِس کی تاویل، تفسیر اور تنویر کو عام کرنے سے کشمیر کی آدم ایجاد رعنائیوں کے ملفوف آہو نافے کھولے جا سکتے ہیں اور اُن کی خوشبو کو زیادہ عام کیا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ کشمیر کی پُر آشوب تاریخ کے اِس زرکار اور پُر بہار باب کی ایک گرہ کھولنے کی کوشش ہے اور اُن کو ہمارا ایک خوبصورت خراج۔ ہمارا ارادہ یہ نمبر ۱۹۸۶ء میں نکالنے کا تھا۔ جب کشمیر میں اُن کے باقاعدہ اقتدار کی چار سو سالہ برسی پڑتی تھی۔ لیکن اُس وقت اکادمی خود ایک تاریخی واردات کے بھنور میں ڈول رہی تھی۔ بہر حال دیر اور تاخیر سے ہی سہی۔ یہی بات کیا کم ہے کہ ہماری یہ آرزو آج ثمر بار ہو رہی ہے اور یہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے اِس موقع پر مُلّا صالح ندیم کے اُس مشہور قصیدے کے اشعار یاد آ رہے ہیں۔ جو اُس نے کشمیر کی ایک محفلِ سخن میں شہنشاہ شاہ جہان کے سامنے پیش کیا تھا اور جس نے بد اعمال صوبیدار اعتقاد خان کا سفینہ غرقاب کر دیا تھا ؎

زعفران گوئند سازو اندوہناک را آمدند از زعفراں در گریۂ جمع بے پناہ
عدل را فرما کہ ایں قوم از بلا گردد خلاص داد را ابر کو کہ ایں جمع از الم یابد بہ جاہ

ہمارا خواب اِس نمبر کو اس سے زیادہ بھرپور بنانے کا تھا جس صورت میں یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے لیکن بسیار انتظار کے باوجود ہمارے بعض اکابر مُورخین و مُصنفین نے ہمیں اپنے التفات سے محروم رکھا۔ بہر حال۔ جو کچھ بھی ہم سے بن پڑا ہے، آپ کے سامنے ہے ؎

گُفتن گناہ من نہ شنیدن گُناہِ کیست؟

اِس نمبر کو ہم نے تصاویر سے سجانے کی بھی کوشش ہے۔ لیکن بہتر ذرائع کی موجودگی میں یہ کام زیادہ بہتر طور انجام دیا جا سکتا تھا۔ بہرکیف میں اپنے عزیز رفیق اور مدیر "شیرازہ" محمد احمد اندرابی کا شُکر گذار ہوں کہ اُنہوں نے بساط بھر اس نمبر کو معنی خیز بنانے میں محنت اور لگن سے گُریز نہیں کیا۔

سرینگر
۱۷ نومبر ۸۹ء

محمد یوسف ٹینگ
(مُدیر اعلیٰ)

مُحمد یُوسف ٹینگ

مُغل مُصوّری کے دو نادر مُرقعے

ایک دریافت

مغل مصوری اب دُنیا کی فنکارانہ وراثت کا ایک نہایت جمیل اور نہایت بیش بہا حصّہ بن چکی ہے۔ مغل مُصوری کے تقریباً ہر مرقع ہی کی کیا بلکہ ہر ورق کی اتنی گہرائی کے ساتھ تحقیق کی گئی ہے کہ اب اس ساری داستان میں مشکل سے کوئی نیا سُر دریافت کرنے کی اُمید رہتی ہے، لیکن زندگی کبھی حیرت انگیزیوں اور بوالعجبیوں سے خالی نہیں رہتی۔ اس بات پر پہلے پہلے بہت سے فن شناسوں کو مشکل سے باور آئیگا کہ اس وقت بھی مغل مُصوّری کے دو نہایت ہی نفیس اور نہایت ہی مُستند مرقعے ایسے ہیں جو ابھی تک فن شناسوں کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ آج سے چند سال پہلے لندن کے مشہور نیلام گھر SOTHBYS نے اکبر بادشاہ کی کارگاہِ مصوری میں بنی ہوئی مرقع امیر حمزہ کے ایک ورق کو (جو دراصل ایک نفیس پارچہ تھا۔) کوئی پینتالیس لاکھ روپے کے برابر رقم میں فروخت کیا تھا۔ حیرت ہے کہ اُسی اکبر بادشاہ کی کارگاہِ تصویر سازی میں بنا ہوا یہ نادر روزگار مسوّدہ اور اُسکی ۲۵ تصاویر کا اگر فن شناسوں کو سُراغ ملے تو وہ اسکو کتنا بیش قیمت ٹھہرائیں گے۔

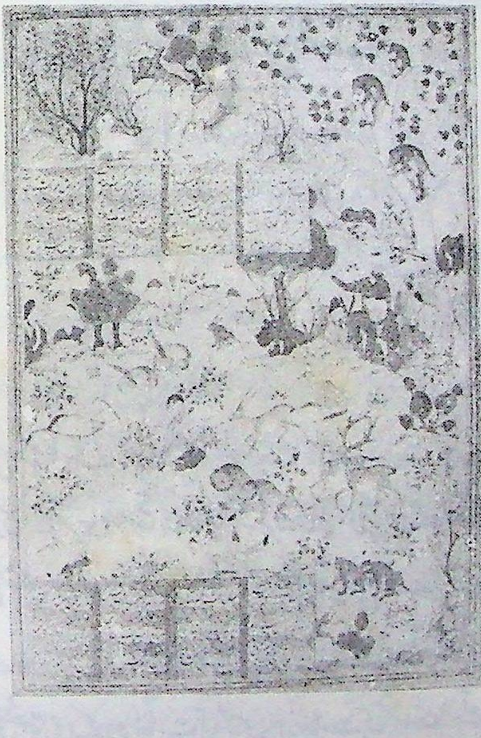

لیلیٰ مجنوں ۔ قیس غزال سے باتیں کر رہا ہے (مغل مینا تور)

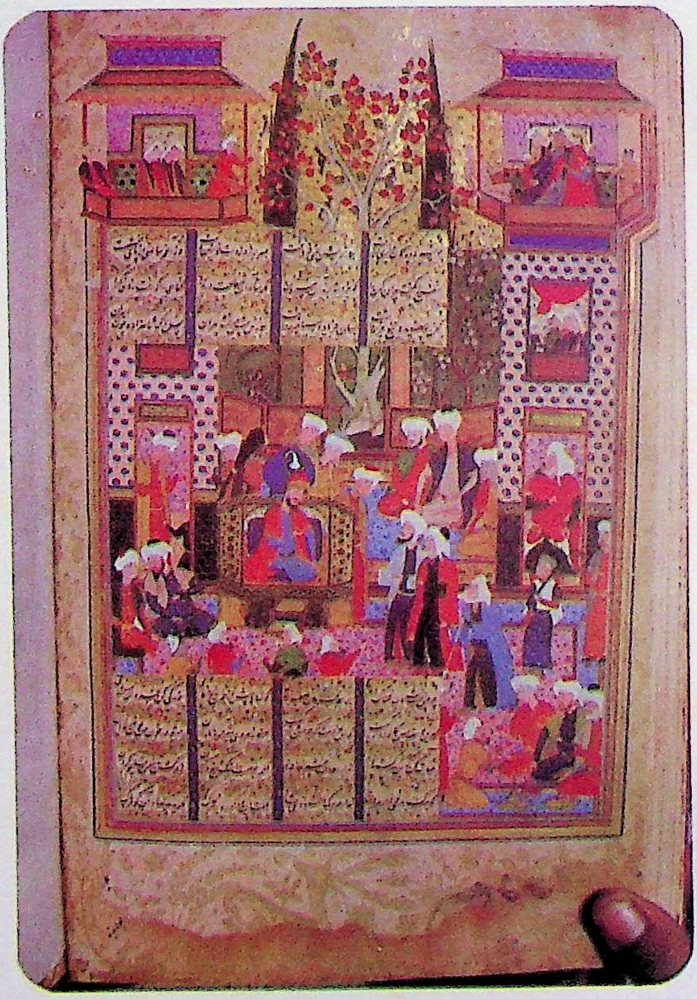

مُغل مکتبِ مُصوّری کے دو الگ الگ رنگوں کے یہ مُرقعے خود ریاستِ جموں و کشمیر میں موجود ہیں لیکن اِن پر بہت کم دوستوں کی نگاہیں گئی ہیں۔ آج کی صحبت میں اِن کا ایک عمومی تعارف کرانا مقصود ہے تاکہ فن شناس اِن کی تعینِ قدر میں پہل کر سکیں۔ یہ دونوں مرقعے اِس وقت جموں کی ڈوگرہ آرٹ گیلری میں موجود ہیں۔ اگرچہ اِس گیلری میں مُغل، پہاڑی، جموّں اور بسوہلی قلم کی سینکڑوں میناتور تصاویر، جموں کے آثارِ قدیمہ کے کچھ نمونے، مورتیوں، دیواری تصاویر وغیرہ کے ٹکڑے اور سامانِ حرب کے کچھ نمونے وغیرہ موجود ہیں، لیکن مخطوطوں (MANUSCRIPTS) کے لحاظ سے شاید یہی دو مخطوطے قابلِ لحاظ ہیں۔ اِن میں خطاطی کے علاوہ مُغل تصویریں متن کیساتھ پیوست ہیں جو انہیں ساری ریاست میں ہی نہیں ملک بھر میں نہایت ہی بیش بہار اور بیش قیمت خزانوں میں سے ایک بناتے ہیں۔ اِن دو مخطوطات (تفصیل آگے آئیگی) میں سے ایک اکبر بادشاہ اور ایک شاہجہان کے وقت میں تیار ہوا ہے اور اِس بات کا یقین کرنے کی وجوہات ہیں کہ یہ نہ صرف شاہی کارگاہوں میں تیار ہوئے ہیں بلکہ یہ بھی کہ یہ شاہی کُتب خانوں کا حصہ بھی رہے ہیں۔

یہ بات بڑی پُراسرار ہے کہ بادشاہی توشہ خانے کے یہ بیش بہار موتی جموں جیسی جگہ میں کیسے پہنچے جو بڑے اور قدیم شہروں سے دور اور کُتب خانوں اور شہروں سے الگ تھلگ واقع ہے۔ میری اطلاع کے مطابق بخشی غلام محمد صاحب کی وزارتِ اعظمیٰ (۱۹۵۲-۶۳ء) کے ابتدائی برسوں (۱۹۵۴ء) میں ایک شخص سے انہیں جموں کے بُزرگ آرٹسٹ شری سنار چند بڈو کے ذریعے چار ہزار میں خرید کر ڈوگرہ آرٹ گیلری میں رکھا گیا۔ حالانکہ اب انکی قیمت لاکھوں میں ہو سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تاراج لاہور کے وقت یہ گنج گرانمایہ اُس کے ہاتھ آیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جموں کے چند ڈوگرہ خاندانوں سے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ لگتا ہے کہ مہاراجہ کی وفات کے بعد لاہور دربار میں جو طوائف الملوکی پھیل گئی، اُس میں کسی فن شناس نے انہیں جموں منتقل کر لیا اور یہ بعد میں کسی خاندان میں پڑے رہے۔ اس صدی کی چھٹی دہائی میں ابھی ملک میں فن شناسی کا وہ شعور بیدار نہیں ہوا تھا جو بعد میں دھماکے کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کے علاوہ ابھی روپے کی بھی کچھ توقیر تھی۔ بہرحال لگتا ہے کہ کسی سفید پوش خاندان کو چند ہزار روپیوں کی احتیاج پیدا ہو گئی اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ یہ کسی آرٹ سمگلر کی بجائے ایک سرکاری ادارے

کی تحویل میں آگئیں[1]۔ اگرچہ یہ دونوں مسوّدے بہت اچھی حالت میں نہ رہے تھے۔ لیکن بعد میں اِنہیں راقم الحروف نے اپنی نظامت آثار قدیمہ کے زمانے میں لکھنو بھجوایا اور وہاں کی ماہر لیبارٹری سے اِن کی جزُوبندی LAMINATION کرا کے اِنہیں خاصی بہتر حالت میں بحال کروایا۔

اکبری دور کی تصاویر :۔

اِن دو مسوّدات میں سے پہلا یعنی "پنج گنج نظامی" قدیم تر ہے اور یہ اکبر کی کارگہ کی پیداوار ہے۔ پرانے ہاتھ سے بنائے ہوئے کاغذ پر لکھے گئے۔ اس مخطوطے کی تقطیع ۱۵" × ۹" ہے۔ اِس میں نظامی گنجوی کے پنج گنج کی مندرجہ ذیل مثنویاں موجود ہیں۔

۱۔ مخزنِ اسرار ۲۔ خسرو وشیریں[2] ۳۔ لیلیٰ ومجنون ۴۔ ہفت پیکر
۵۔ نامۂ سکندری (اول و دوم)[3]

اِس مخطوطے کا اندراج ACC NO:- 21268 کے تحت ہوا ہے اور اِس کے کل صفحات ۹۱۵ ہیں۔ کتاب کی ہر مثنوی کے آخر میں خطاط کا ترقیمہ ہے۔ جس میں اُس نے اپنا نام اور نقل کی تاریخ دی ہے۔ کاتب کا نام خلق اللہ ابن محمود عنایت اللہ شیرازی ہے اور اُس نے ہر جگہ نقل کی تاریخ

---

[1] ایک روایت کے مطابق اِنہیں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جنرل ہری چند نے جو دیوان کرپارام ایمن آبادی کا بیٹا تھا، نے اُس وقت دلی کی لوٹ میں حاصل کر لیا جب اسے رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں غدر کے دنوں میں باغیوں کے خلاف انگریز سرکار کی امداد میں فوج کے ساتھ بھیج دیا۔ جس شخص نے ان مسودات کو بیچا اُس نے خاص طور اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی درخواست کی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ کتنا پُراسرار ہے۔ [2] عام طور پر اس مثنوی کا نام 'شیریں خسرو' یا شیریں فرہاد کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ لیکن نظامی کے یہاں اسکی وہ صورت ملتی ہے جسمیں خسرو کا نام پہلے آجاتا ہے۔ شاید بادشاہی کارگہ میں پہلے بادشاہ کے نام کو درج کرنا آداب میں شامل سمجھا گیا (م ی ٹ) [3] یہ سکندر ذوالقرنین کی کہانی ہے۔ ذوالقرنین کے معنی مشہور ماہر نفسیات کارل گستاؤ ینگ کے نزدیک دو سینگوں والے کے ہیں۔ جو زائچے کے مطابق TARUS کی تعبیر ہے۔ کہتے ہیں کہ ذوالقرنین اِسی بُرج میں پیدا ہوا تھا۔

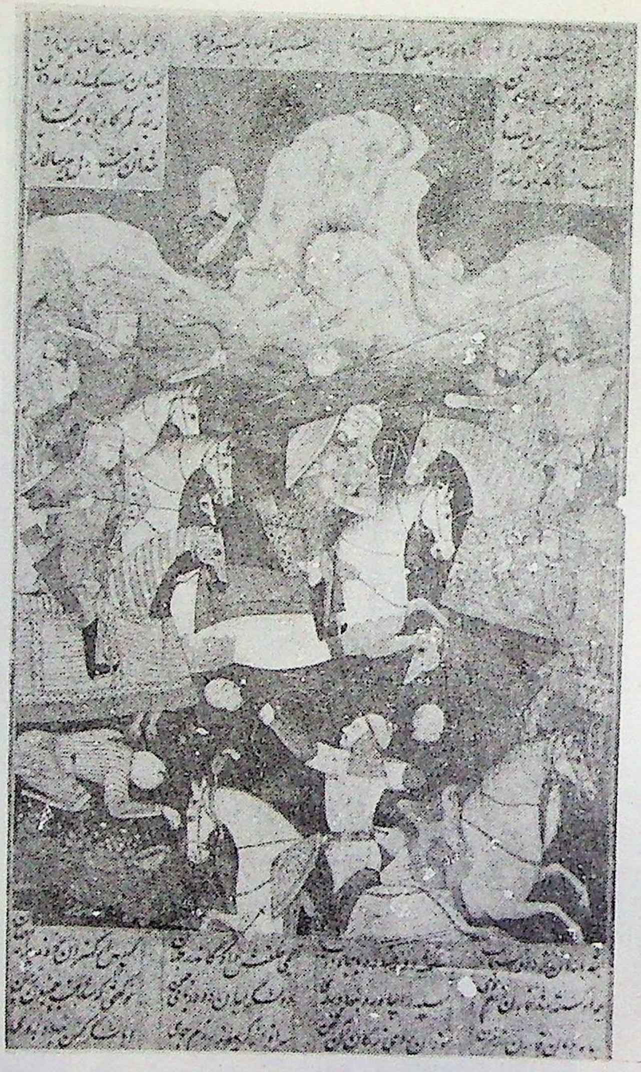

مغل میناتور۔ میدانِ جنگ کا منظر (شاہ نامہ)

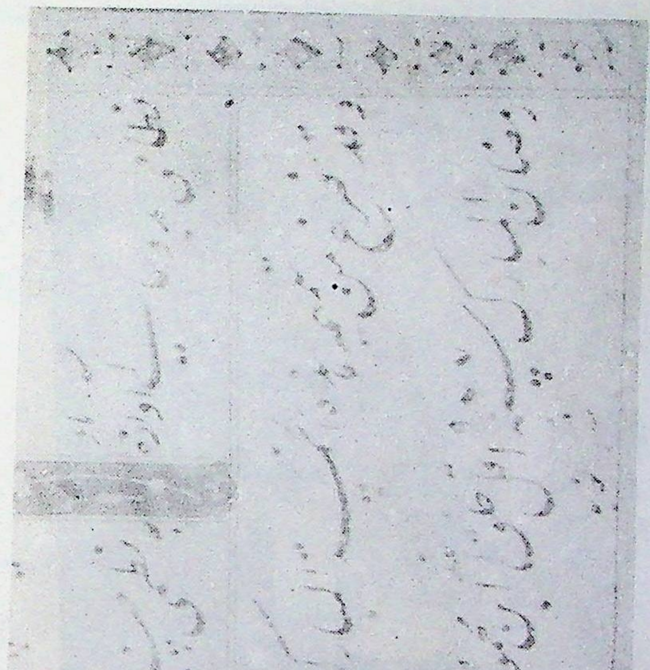

عکس تحریر از سکندرنامہ

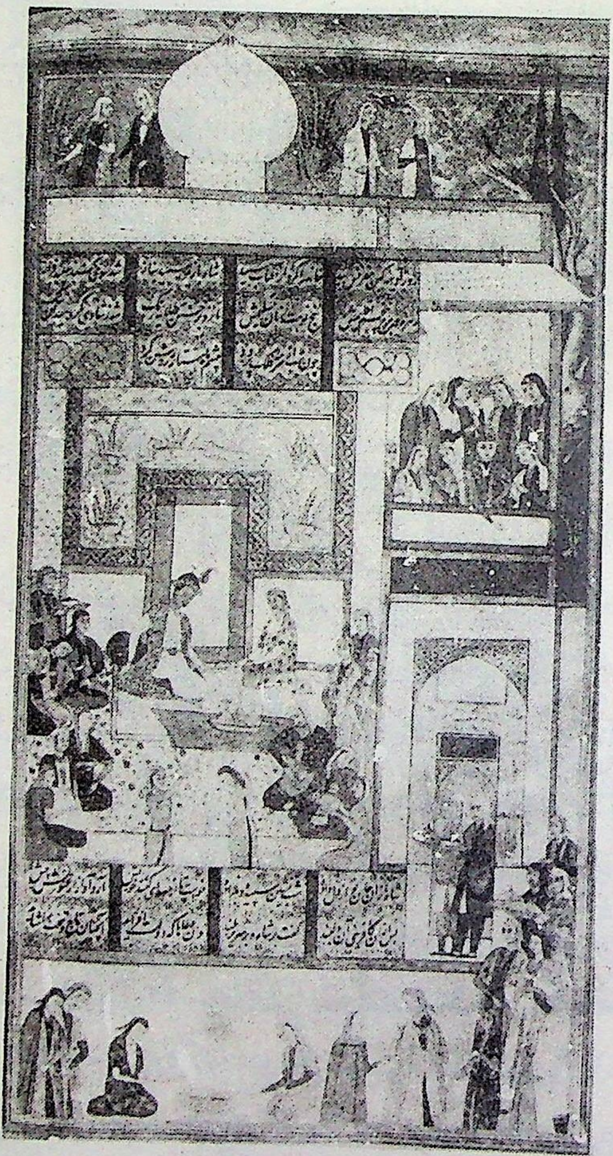

شاہی دربار کا ایک منظر (اسکندر نامہ)

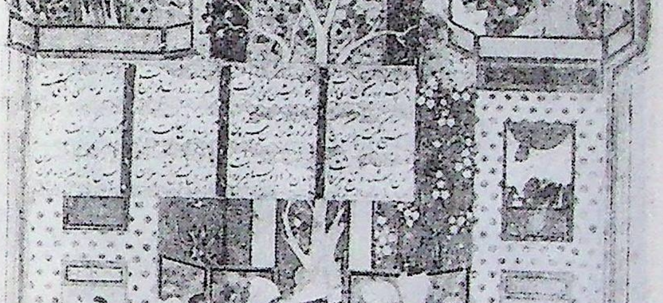

شاہی دربار ـــــ سکندر نامہ

۹۷۷ھ تحریر کی ہے۔ بلکہ ایک جگہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ بھی درج کی ہے۔

کتاب نہایت ہی شاندار خط میں تحریر کی گئی ہے۔ ہر مثنوی کے پہلے دو چار صفحات زبردست مُذہب اور طلاکار ہیں۔ اشعار کے ارد گرد موٹے آبِ زر کی دیوار جیسی بنائی گئی ہے اور عنوانات میں زرکاری کے علاوہ پھول پتے اور بیل بوٹے مختلف رنگوں سے بنائے گئے ہیں۔ ہر مثنوی کے چند صفحات کے حاشیوں پر خالص سونے سے جانوروں، پھول پتیوں اور چرند و پرند کے خاکے (DRAWINGS) دئے گئے ہیں اور یہ جگہ جگہ مقرر ہوتے ہیں۔

اُن دنوں رواج تھا کہ متن کی کتابت ایک خطاط کرتا تھا اور حاشیے کی تہذیب کوئی دوسرا فنکار کرتا تھا۔ اسی طرح عنوانات کوئی اور شخص تحریر کرتا تھا اور اصل تصاویر کوئی فن کار بناتا تھا۔ اس نسخے میں جہاں متن کی تحریر پُختہ ہے۔ وہاں عنوانات کسی قدر کم پُختہ ہیں اور اصل نسخے میں پیوند کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ حاشیوں کے خطوط بھی سنہری ہیں اور چار کالموں میں تقسیم کئے گئے متن کے اندرونی خطوط بھی سُنہری ہیں۔

بہرحال۔ نسخے کی اصل دولت اس کی پچیس تصاویر ہیں۔ یہ تصاویر اس طرح بنائی گئی ہیں کہ کہیں کہیں صفحے کے بالائی حصّے سے درمیانی حصّے کو اپنی لپیٹ میں لے کر صفحے کی تہہ میں مُکمل ہو جاتی ہیں اور بیچ میں متن کی سطور کو ایسے آغوش میں لیتی ہیں جیسے کسی خوبرو عورت کے جسم پر پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے ہوں۔

اکبر کے وقت میں مغل فنِ مصوّری ابھی ایرانی روایات کے اثر میں تھی اور ابھی ان بادلوں سے اُبھرنے اور اپنا انفرادی تشخص قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ چنانچہ اس مجموعے کی پچیس تصویروں میں یہی صورت نظر آتی ہے۔ پھول پتی، پیڑ پودوں اور جنگلی جانوروں کی افراط اور کثرت، چہروں کی ساخت ایرانی اور تورانی۔ پس منظر کے علاوہ چٹانوں کی صورت اور عمارات کا اسلوب ایرانی اثرات سے مملو ہے۔ اس کے علاوہ لاجوردی اور گہرے نیلے رنگوں کا وفور ایرانی سائیکی کا سُراغ دیتا ہے اور ہندوستان کا پیلا اور ہلکا نیلا ابھی کھُل کر سامنے آنے میں کامیاب نہیں۔ یہاں تک کہ آسمان پر بادلوں کے بادبان چینی اثرات کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے چین کا قومی نشان DRAGON یعنی اژدہا پھُنکارتا ہوا آسمان میں جا رہا ہے۔

جس چیز نے مجھے بہت مُتاثر کیا وہ ایک ایسے درخت کی نقاشی ہے جس کے متعلق ایک سے

زیادہ شہادتیں اس بات کا اشارہ کرتی ہیں کہ یہ چنار کا درخت ہے۔ اس کے پتے کبھی خزاں کے چنار کی طرح سُرخ، کبھی بالکل سبز اور کبھی اوائل خزاں کے دِلوں کی طرح بعض پتے زردی مائل اور بعض ابھی ہلکے سبز ہیں۔ جہاں جہاں یہ درخت نقش ہوا ہے اس کی ٹہنیوں تے سارے صفحے کو اپنی چھتر چھایا میں لایا ہے۔ اسی طرح چنار کا تنا موٹا اور کبھی دو شاخا نظر آتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب چنار کا درخت تنے سے اوپر اُٹھ کر شاخوں کی صورت میں چار سُو پھیلنا شروع کر دیتا ہے تو اسکا رنگ ایسا لگتا ہے جیسے کسی گوری چٹی اور صحت مند عورت کی گدُاز رانیں۔ اس رنگ سے وہی لوگ شناسا ہیں جنہیں چنار کے درخت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مصوّر نے اس رنگ کو اتنا نرم و ملائم بنایا ہے کہ چنار کی اِن شاخوں کا لمس جیسے عورت ہی کے گورے انگوں کی طرح پھیلتا ہوا اور ریشم آسا نظر آتا ہے۔

اِن تصاویر میں ایک اور بات جو کشمیر کے حوالے سے بہت اہم نظر آتی ہے یہ ہے کہ عورتوں کے سروں پر جو پہناوا HEAD GEAR نظر آتا ہے وہ اُس قصابہ سے بہت مُشابہ ہے۔ جو چند سال پہلے تک کشمیری پنڈت عورتوں کے سر پر نظر آتا تھا اور جس پر ایک سفید اوڑھنی (پُوٹِز) ٹنکی ہوتی تھی۔ راقم الحروف نے روسی قزاقستان کے ایک دُور افتادہ علاقے میں کشمیری پنڈتوں کی خاص لحمی ضیافت "کبرگا" کا جو سُراغ لگایا ہے اُس کے پیش نظر عجب نہیں کہ اِس "قصابے" کا اصل وطن بھی ایران و توران میں ہی کہیں رہا ہو اور اُس کے بعد کشمیر میں باقی رہا ہو۔

مجُھے اس نسُخے کی جس تصویر نے خاصا متاثر کیا وہ مجنوں (قیس) کی تصویر ہے۔ رنگ دھڑنگ چٹانوں اور بے آب و گیاہ بیاباں میں مجنوں وحوش اور طائروں کے نرغے میں بس نیم برہنہ حالت میں بیٹھا ہوا ہے اور ایک آہو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لیلیٰ کی آنکھوں کا رنگ جھلکتا دیکھ رہا ہے۔ وہ آہو سے باتیں کرتا ہوا لگتا ہے اور مصوّر کا کمال ہے کہ آپ اس مکالمے کے الفاظ گویا کانوں میں رس گھوستا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور تصویر میں بادشاہ محفل نشاط میں ہے۔ عورتیں دف اور دوسرے ساز لیکر نغمہ سرا ہیں اور کچھ پشواز پہنے رقص کر رہی ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور ساری فضا پر مستی چھائی ہے۔

مخطوطے کے ہر صفحے کو چار کالموں میں بانٹا گیا ہے۔ ہر صفحے میں سولہ سطریں یعنی ۳۲ اشعار ہیں۔ لیکن جن صفحات پر تصاویر ہیں وہاں اُن کی مناسبت سے چند اشعار ہیں اور بس۔ نسخے کی ابتدا پوری تصویر اور انتہا بھی پورے صفحے کی تصویر سے ہوتی ہے اور اِن کے صفحات بڑے زبردست طریقے پر طلاکاری سے مُزیّن ہیں ۔

شاہ نامہ :- دوسرا نسخہ فردوسی طوسی کے شاہ نامہ کا ہے اور یہ واضح طور پر شاہ جہان کے وقت میں تیار ہو
نسخہ شاہ نامے کے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جن میں اصل کے ساٹھ ہزار اشعار کے برعکس کُل تعد
اشعار درج ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اِس نسخے کی دوسری جلد کہیں پر جُدا ہو کر کھو گئی ہے ۔ اس نسخے تقطیع بھی ۱۵" × ۹" ہے۔ اِس کا اندراج نمبر ACC NO. 1/267 ہے اور اسمیں ۶۲۸ صفحات ہیں۔ خطاطی نُسخے کے مقابلے میں زیادہ کھِلتی ہوئی ہے اور عنوانات بھی بہتر تحریر ہوئے ہیں۔ اِس میں حاشیے پر اگرچہ طلا خطوط ملتے ہیں لیکن وہ فراخدلانہ طلاکاری اور حاشیوں کے خاکے کہیں نظر نہیں آتے جو پنج گنج کی خصوصیا ہیں اور اِس لئے اُس کے مقابلے میں یہ شاہ نامہ سادہ اور AUSTERE لگتا ہے۔ لیکن اسمیں شاہ نامہ داستان سے متعلق ۸۰ بہت ہی شاندار تصاویر موجود ہیں اور یہی اِس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے دولت بھی ۔

کتاب کا متن سید جلال بُخاری نے خط کیا ہے اور اپنا نام تحریر کرنے سے پہلے اُس نے کا یہ مرغوب شعر نقل کیا ہے ع

دستم چو زیر خاک خواہد شُدن تباہ
بارے بیادگارِ بماند خطِ سیاہ

اِس نُسخے میں چار کالم ہیں اور ۲۵ سطریں۔ جس کا مطلب ہے کہ پورے صفحے میں پچاس دئے گئے ہیں۔ لیکن جن صفحات پر تصاویر ہیں وہاں کم اشعار ہیں۔ شاہ نامہ میں پنج گنج کے برعکس ایک خاص سانچے میں مُنضبط کی گئی ہیں۔ پنج گنج میں تصاویر جیسے موقلم سے ایک خود رو بیل کی طرح اور بقول غالب ع

دریدہ بر تنِ نازک قبائے تنگش را

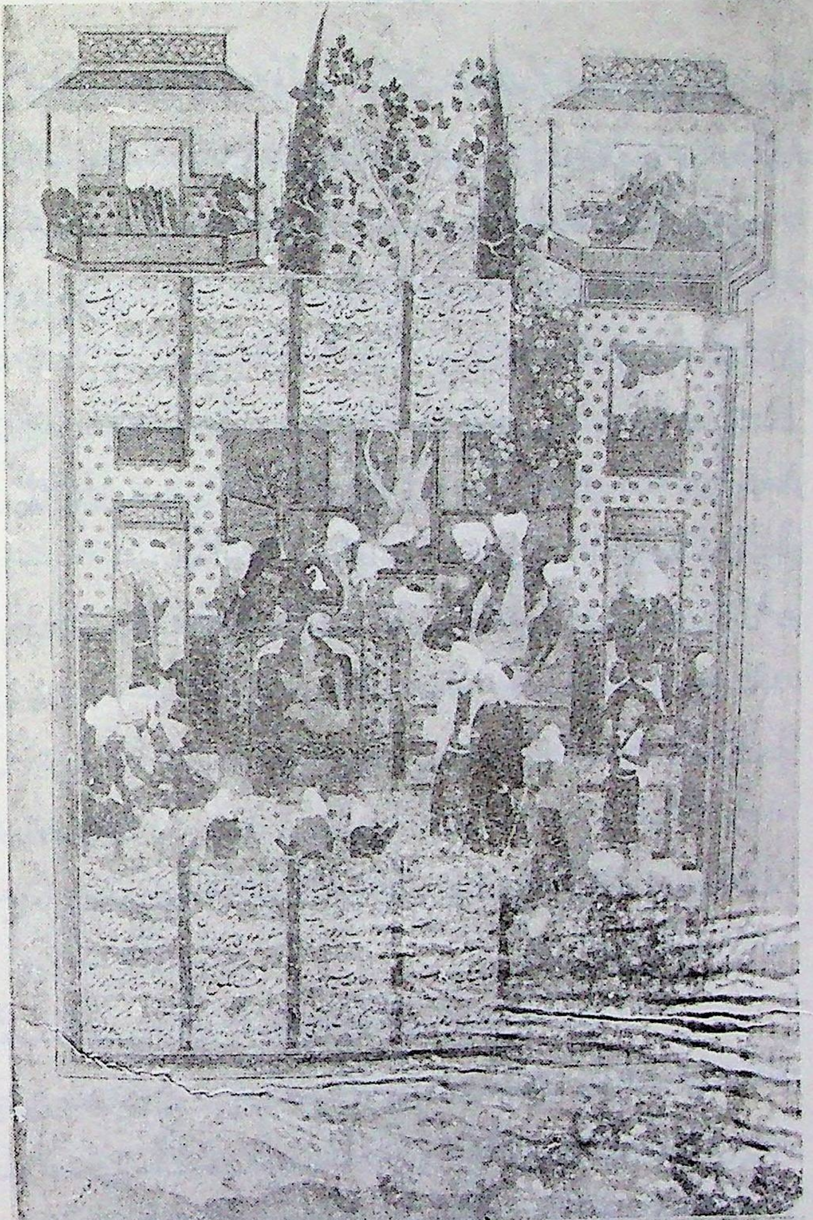

دربارِ شاہ ـــ (سکندر نامہ)

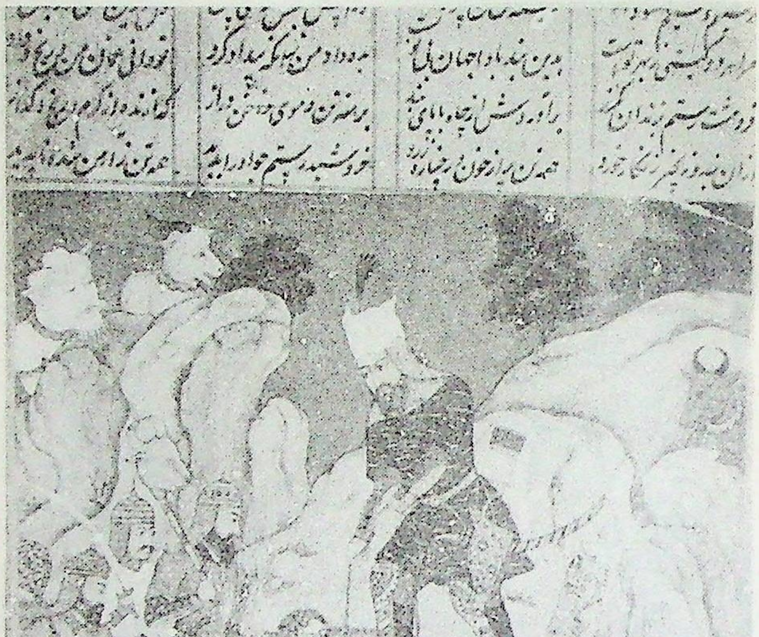

رستم عورت کو چاہ سے نکال رہا ہے۔ الاؤ کا منظر بھی قابل دید ہے۔

(شاہ نامہ)

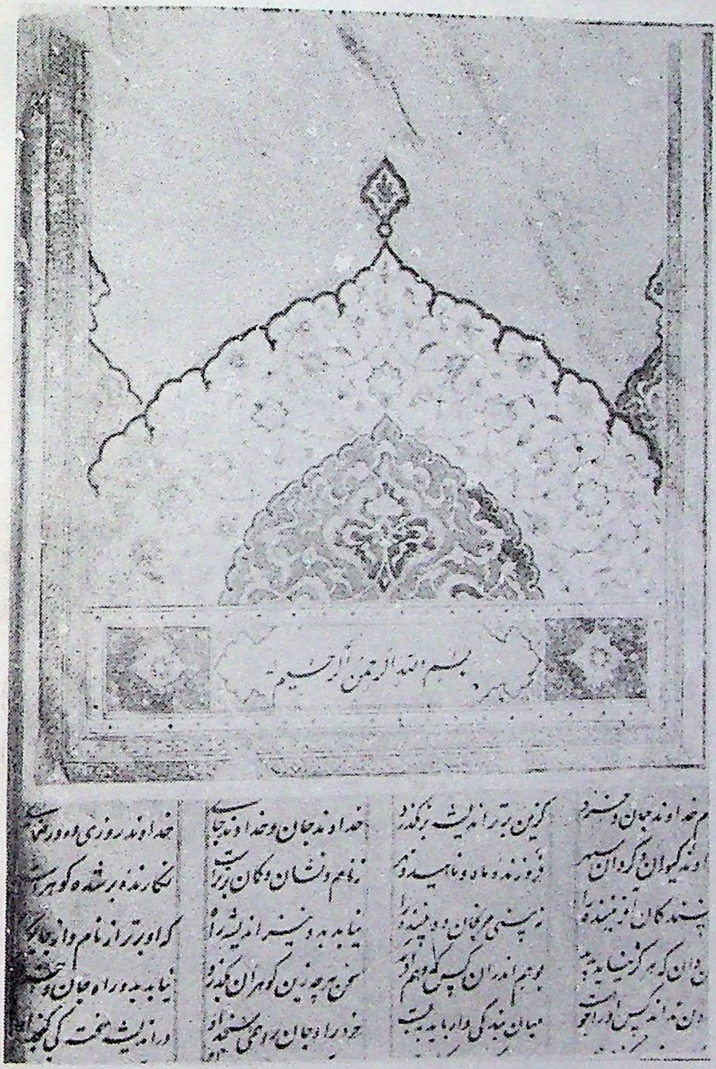

شاہ نامہ - ابتدائی صفحہ - عنوان کی تہذیب

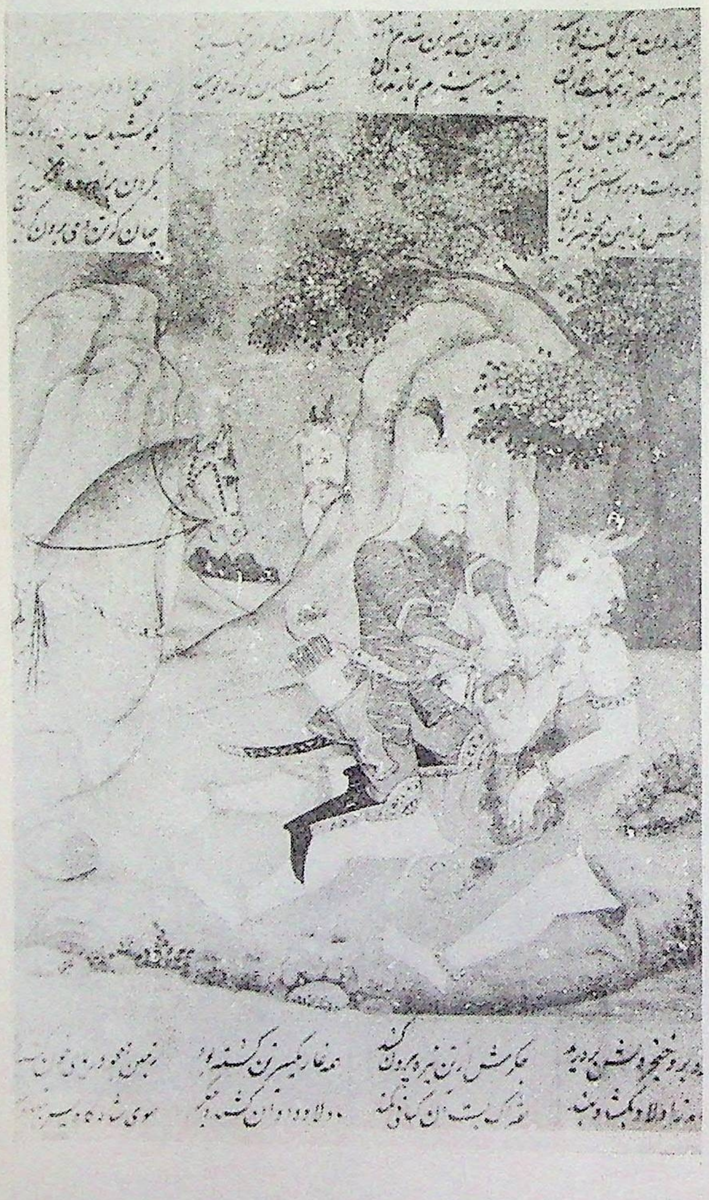

مغل مینارتور ــــ ایک منظر (شاہ نامہ)

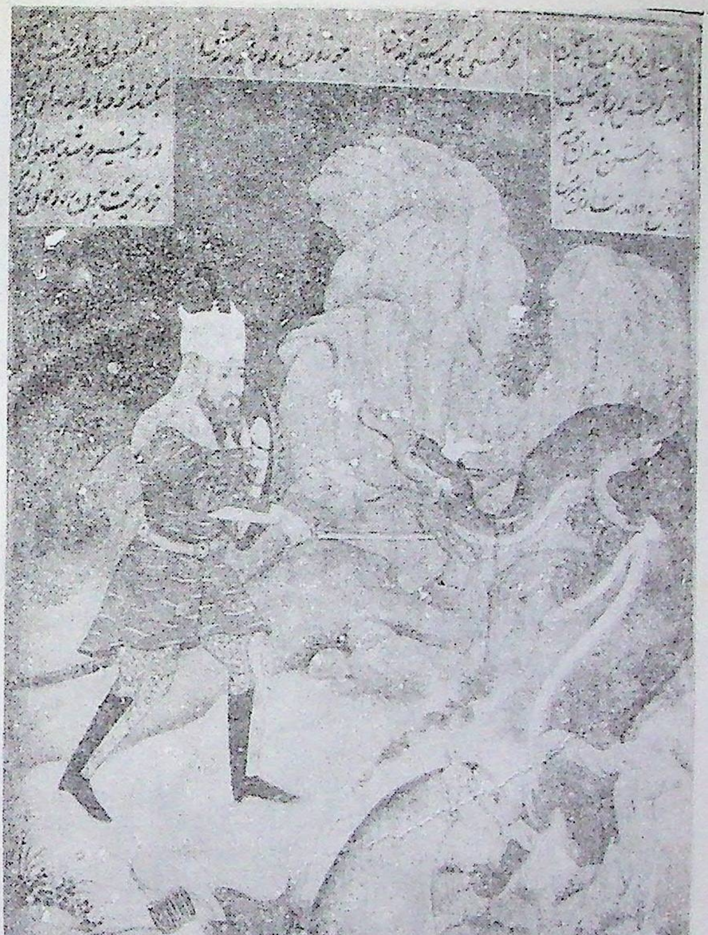

رستم اژدہے کو ہلاک کر رہا ہے (شاہنامہ)

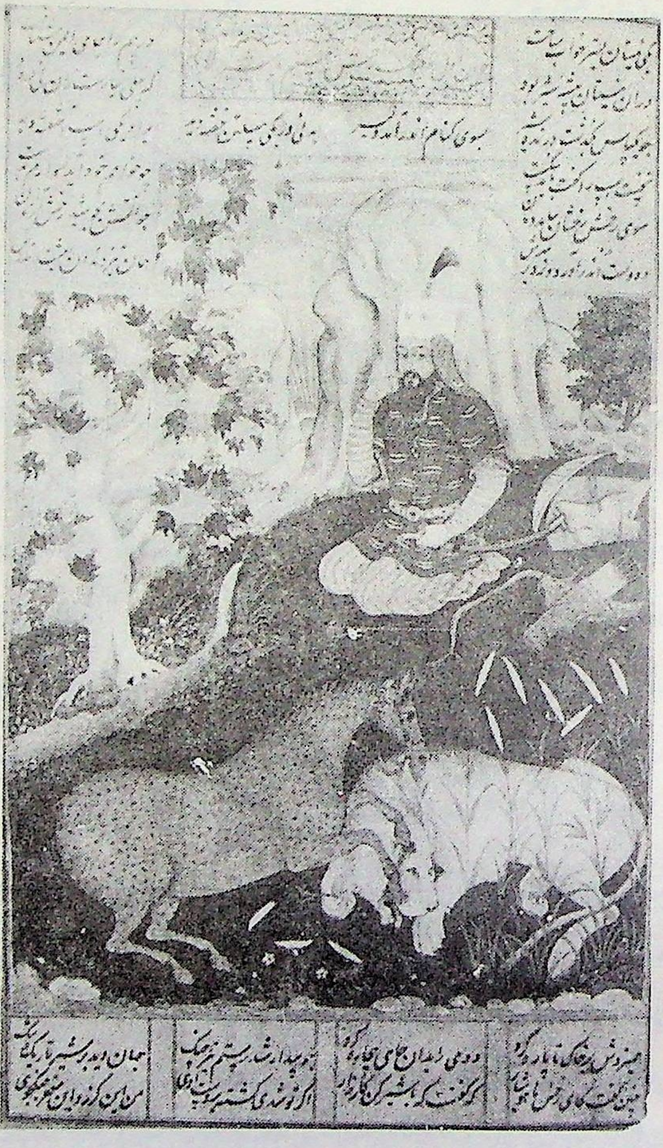

رخش، رستم، شیر نیستان (شاهنامه)

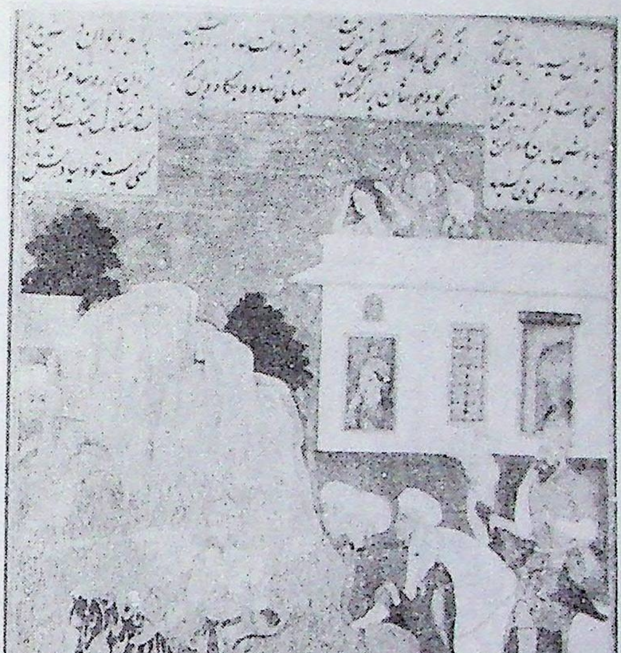

شاہنامہ سے ایک اور منظر

چاروں طرف صفحات میں رنگ اور سبزے کا وفور ہے۔ لیکن شاہ نامہ میں وہ ایک خاص فریم میں مُقید ہیں۔ اِن تصاویر میں پسِ منظر کی تاک جھانک پیڑ پودوں اور وحوش وطیور کی تانک جھانک تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ البتہ میدان جنگ اور اُس کی چٹانوں کا تاثر اُبھارا گیا ہے۔ صاف لگتا ہے کہ اکبر کے دور کی ابتدائی کاوش کے بعد اور دورِ جہانگیری کے کسب وکمال کے بعد اب مُغل مُصوری کا اپنا انفرادی لب ولہجہ (IDIOM) اُبھر آیا ہے۔ لیکن شاہ جہان کے وقت میں نظم وضبط کے شکنجے میں زوال کی طرف آنا شروع ہو گیا ہے چہروں کے خطوط صاف اور واضح ہیں۔ اُن کے خدوخال سُتواں اور آریائی ہیں۔ کرداروں کے پہناوے پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ یا تو وہ چینی ریشم ودیبا یا رنگین ململ کے ملبوسات میں نظر آتے ہیں۔ صرف رُستم کے بدن پر شیر کی کھال کے MOTIFF کا لباس نظر آتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح ٹیپو سلطان کے مقبرے واقع سرنگا پٹنم میں دیوار پر شیر کی کھال کا ڈیزائن اُبھارا ہوا ہے۔ اِس کے علاوہ رُستم کے سر پر ایک سفید شیر کا مکھوٹا MASK لگا ہوا نظر آتا ہے۔

پنج گنج کے برعکس شاہ نامے کی ابتدا میں چند اہم مُہریں نظر آتی ہیں۔ اِن میں عنایت خان شاہ جہانی، لطف اللہ خان فرزند سیف اللہ خان، فاضل خان اور دوسرے اہم شاہ جہانی امرا کی مُہریں نظر آتی ہیں۔ کتاب کی ابتداء اور انتہا دونوں جگہ سنہ ۱۰۷۵ھ سن اور دوازدہم رجب کی تاریخ بھی دی ہوئی ہے۔

تصاویر میں تقریباً ہر جگہ رُستم نمایاں نظر آتا ہے[٭]۔ کبھی کمند سے دُشمنوں کو زمین پر لُڑھکاتا ہوا، کبھی تلوار سے اُن کے جسم کے دو ٹکڑے کرتا ہوا اور کبھی خنجر سے اُن کو موت کے گھاٹ اُتارتا ہوا۔ ایک تصویر جو مجھے خاص طور بھائی۔ وہ شاہ نامہ کے مشہور کردار سیاوُش کے قتل کے بعد کا منظر ہے۔ اُس کی لاش پلنگ پر پڑی ہوئی ہے۔ ایک نازنین اس کے قد کے ساتھ قد ملاتی ہوئی لیٹی ہوئی ہے۔ چند عورتیں بال کھولے ہوئے بین کر رہی ہیں اور ایک عورت اپنا گریباں چاک کر رہی ہے۔ لیکن مُغل مُصوری کی روایات کے مطابق عورتوں کے چہروں،

[٭] یہ بات عیاں ہے کہ یہ تصاویر ایک ہی نقاش کے موقلم کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ رستم کی تصویر تقریباً ہر فریم میں آئی ہے لیکن اُس کا حُلیہ، خدوخال وغیرہ ہر جگہ بالکل ہم آہنگ ہیں اور ایسی ہم آہنگی کیمرے سے پہلے صرف ایک واحد فنکار کے فن سے اُبھر سکتی تھی۔

ہاتھوں اور پاؤں کے علاوہ اُن کے جسم کی چاندی کہیں نہیں دمکتی۔ اِسی طرح دریا جیحوں کے عبور کرنے کا منظر ہے۔ بہت سے لوگ ایک پرندنما کشتی میں آرہے ہیں اور چند بہادر گھوڑوں پر دریا عبور کر رہے ہیں۔ دریا کے پانی میں مچھلیاں پوری طرح نظر آرہی ہیں۔ خاقانِ چین اور رُستم کی لڑائی کا منظر بھی بہت خوب ہے۔ خاقانِ چین رُستم کے آریائی خدوخال کی بجائے اپنا منگول حُلیہ دکھاتا ہوا ایک سفید ہاتھی پر بیٹھا ہوا ہے۔ رُستم کے پیچھے ایران کا جھنڈا نظر آرہا ہے جو سُرخ کپڑے سے بنا ہے۔ خاقانِ چین کے لشکر کے پیچھے اُس کا پرچم نظر آرہا ہے۔ اوپر اور نیچے پیلی دھار کے پارچے ہیں اور بیچ میں سبز۔ اِسی طرح سہراب کے قتل پر رُستم کے کپڑے چاک کرنے کا منظر۔ عام طور پر اِن کرداروں کے چہروں پر کسی قسم کا تاثر نظر نہیں آتا۔ وہ قتل کر رہے ہیں۔ لیکن چہرہ سپاٹ ہے اور نظر خلاؤں میں گھور رہی ہے۔ لیکن اِس تصویر میں صورتِ حال کے گداز نے، رُستم کے چہرے کو بھی متاثر کیا ہوا ہے۔ اِسی طرح ایک بہت ہی مُتاثر کُن تصویر ضحاک کی ہے۔ جب وہ فریدون کے پاس بحیثیتِ قیدی کے لایا جاتا ہے اُس کے کندھوں سے دو سانپ پھن اُٹھا رہے ہیں اور اُس کی کنپٹیوں کو ڈس رہے ہیں۔ پیچھے محل سرا کے دیوان خانے کی شاندار آرائش نظر آرہی ہے اور ضحاک کے پیکر کو اور بھی ہیبتناک بنانے میں مدد کرتی ہے۔

اِن تصاویر میں بھی آسمان اور بادلوں کی نقاشی میں چینی اثرات نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے کہ بادل ایرانیوں اور مُغلوں کو ہمیشہ پریشان کرتے تھے اور وہ چینی اسلوب سے ہی اِس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ الاؤ کا منظر دکھایا گیا ہے۔ شعلے اُٹھ رہے ہیں اور اُن کی زبانیں لہرا رہی ہیں۔ لیکن شعلوں کا رنگ سُرخ نہیں بلکہ خالص سُنہری خطوط سے نمایاں کیا گیا ہے البتہ اگر اِن پر چند لمحوں کے لئے نظر گڑی رہے تو شعلوں کا اصل رنگ آنکھوں کے سامنے اُبھرنا شروع ہو جاتا ہے۔

صفحے میں چار کالم اور پچیس سطور ہیں جن میں پچاس اشعار سما جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ دونوں مجموعے تصاویر کے اعتبار سے بے مثل ہیں اور اِن تصاویر کی طباعت مُغل مُصوّری کے عرفان کو اور زیادہ گہری کر سکتی ہے۔ میں نے ان دونوں عظیم کتابوں کے مصوّر نمونے بہت سی جگہ دیکھے ہیں۔ لیکن میں کسی قدر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پنج گنج کا اتنا طلاکار اور شاندار طور پر مُصوّر نسخہ شاید ہی کسی اور جگہ موجود ہے۔ اِسی طرح اگرچہ شاہ نامہ کا صفوی مُصوّر نسخہ اپنی نظیر آپ ہے۔ لیکن شاہ جہانی نسخے میں

کرداروں کو اُبھارنے اور اُن کی پوشاک اور سامانِ حرب کی نقاشی کے لئے جتنی محنت کی گئی ہے وہ اُسے دُنیا بھر میں مُصوّر شاہ ناموں میں ایک اہم مقام عطا کرتی ہے ۔ ضرورت ہے کہ اِس کی کھوئی ہوئی دوسری جلد کا ہندو پاکستان کے کتب خانوں میں سُراغ لگانے کی کوشش کی جائے ۔ اور ان دونوں مرقعوں کو جدید ترین ٹکنالوجی سے ان کے اصل رنگوں اور کیفیت کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ کیا جائے ۔

شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات

- ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو
- ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری و تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں
- ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں ۔
- فن تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ معاوضہ دیا جا سکتا ہے
- منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں ۔

مشعل سلطانپوری

کشمیر ــــ ابوالفضل کی نظر میں

کشمیر کی تعریف میں فارسی ادب کا معتد بہ حصہ مغل دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مغل دربار سے وابستہ ادباء و شعراء کے علاوہ اس دور میں درباری دائرہ سے باہر زندگی گزارنے والے فارسی شعرا بھی کشمیر کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ دربار سے وابستہ شعراء کی کشمیر سے دلچسپی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خود مغل بادشاہ یعنے ان شعراء کے خداوندان نعمت کشمیر سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔ اسی عشق کی بنا پر مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر سے لے کر جلال الدین اکبر تک کشمیر فتح کرنے اور اسے اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوششیں ہر مغل بادشاہ نے کیں۔ بابر اور ہمایوں تو ان کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن اکبر اعظم کا نیر اقبال فتح کا سورج بن کر ان کے سر پر ضیا پاشیاں کرنے لگا۔ بابر کا زمانہ سلطنت قائم کرنے کی کوششوں میں گزرا اور ہمایوں کا دور شیر شاہ سوری کی صلاحیتوں اور اُن کی حکمرانی کے باعث ایک عبوری دور ثابت ہوا۔ اصل میں مغل سلطنت کے مستقل قیام اور اسے استحکام بخشنے کا سہرا جلال الدین محمد اکبر کے سر ہے جس کے زمانہ میں امن و امان کے دور دورہ، ملک کی خوشحالی اور انعامات و عنایات کے غلغلے نے بیرون ملک دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو ہندوستان آنے پر راغب کرنے کے ساتھ ساتھ اندرون ملک بھی باصلاحیت لوگوں کو جولانیٔ طبع دکھانے کے مواقع

فراہم کئے ۔ اکبرؔ کی جوہر شناس نگاہوں نے پتھّروں سے ہیرے تلاش کئے اور انہیں چُن چُن کر اپنے دربار کی زینت بنادیا۔ عنایاتِ خسروانہ کی شعاعوں سے ان ہیروں کی آب وتاب میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ابوالفضل کا شمار بھی ان ہی بیش قیمت ہیروں میں ہوتا ہے۔

اس صدی کی چھٹّی دہائی میں مجھے ابوالفضل کی چند تصانیف دیکھنے اور ان کے سرسری مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ ترجموں کے ذریعے نہیں، براہِ راست اُسی زبان میں جس میں یہ لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں دفترِ ابوالفضل یعنے اُن کے مکاتیب، آئینِ اکبری اور اکبر نامہ کی دو ایک جلدیں مطالعہ میں آنے کے بعد میں نے ابوالفضل کے بارے میں جو تاثرات قائم کئے تھے، تیس برس گزرنے کے بعد وہ اب میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ مجھے ان کا دقیق اندازِ بیان دیکھ کر غصہ نہیں آیا تھا بلکہ میں مرعوب سا ہوگیا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس دور میں بھی، جب مجھے یہ معلوم ہوچکا ہے کہ اس قسم کے اسلوب کو خود ایران کے ادیبوں نے "سبک ہندی" کا نام دے کر ناپسند کردیا تھا اور یہ اندازِ بیان دور از کار اور پیچ در پیچ استعارات، بے جا طوالت پُر تصنّع و پُر تکلّف زبان اور محاورے کے ابہام و اہمال کی بناء پر علم وفضل کی فضول نمائش کے سوا اور کچھ نہیں، میں ابوالفضل کی طرزِ تحریر سے برابر مرعوب ہوں۔ اُن کی عبارت آرائی، رنگین بیانی، فارسی زبان پر قدرت، ان کی نازک خیالی اور اُن کے تخیّل کی بلند پروازی آج بھی اپنا لوہا منوا سکتی ہے۔

آج جب میں نے یہ مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تو بسیار کوششوں کے باوجود ابوالفضل کی یہ تصانیف فارسی میں دستیاب نہ ہوسکیں، بمشکل اُن کے انگریزی ترجمے حاصل کئے۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں سے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تو آسان ہے لیکن اُن کی تحریروں کی روح تک پہنچنا ناممکن۔ بہرکیف جہاں آدمی کا بس نہ چلے، حسرت وافسوس کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

کشمیر کے بارے میں ابوالفضل کی دو کتابوں سے معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ آئینِ اکبری اور اکبر نامہ۔ اُن کے خطوط میں تو صرف چند اشارے پائے جاتے ہیں۔ آئینِ اکبری کی دوسری جلد اور اکبر نامہ کا تیسرا حصّہ اس سلسلے میں زیادہ کارآمد ہے۔ اکبر نامہ، دربارِ اکبری سے متعلق ایک قسم کا روزنامچہ ہے جس میں اکبر کے دورِ حکومت میں پیش آنے والے وہ واقعات جو کسی نہ کسی طرح شاہی دربار سے تعلق رکھتے ہیں سال بسال

یا ماہ بماہ ہی نہیں، روز بروز درج ہیں۔ اس میں ہمیں اکبر کی فتوحات تو تفصیل سے ملتی ہی ہیں ان کے ساتھ ساتھ، شاہی مزاج، اس کے عادات واطوار، اس کی پسند وناپسند، اس کے مشاغل، اُس کے جذبات وخیالات کے علاوہ ملکی حالات کے بارے میں بھی کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ 'آئین اکبری' اکبر کی حکومت کا دستور ہے۔ دستور العمل ملکی انتظام، صوبوں کی تقسیم، اراضی اور پیداوار کا تعین، صوبوں کا محل وقوع اور اُن کے جغرافیائی حالات اس کتاب کے اہم موضوعات ہیں۔

اکبر نامہ سے کشمیر کی اس دور کی تاریخ سے متعلق چند اہم باتیں معلوم ہونے سے کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے، یہ بتادینا ضروری ہے کہ ابوالفضل بادشاہ کے اہم ترین وزیروں میں شامل ہونے کے ناطے بادشاہ کا نمک خوار ہے۔ اس لئے اس کی دربار سے وفاداری قابل تعریف ہے۔ لیکن اپنی تصانیف میں وہ بادشاہ کا وفادار ملازم ہی نہیں، اُس کا عاشق، اُس پر مفتون اور اُس کا والہ وشیدا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی مورخانہ غیر جانب داری کو بھی اسی عشق کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ بالکل سعدی کے اس شعر کے مصداق ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

وہ جگہ جگہ اکبر کی غیر معمولی صلاحیتوں کا کلمہ پڑھتا نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادبار اور کس مپرسی کے عالم میں پروان چڑھنے، تعلیم وتربیت سے محروم رہنے اور صاحبان علم وفضل اور فہم وذکا سے فیض نہ پانے کے باوجود اکبر کی ذہنی، فکری اور انتظامی صلاحیتیں سر برآوردہ لوگوں کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈالتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے قریب رہنے والے لوگوں کو بادشاہ کے الہام پانے، علم لدنی عطا ہونے اور فوق الفطری درجہ ملنے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ لیکن ابوالفضل کو اپنی مورخانہ ذمہ داریوں کا احساس تو ہونا ہی چاہئے تھا اور اُسے اپنی عقل سلیم کو آنے والی نسلوں کے ہدف ملامت ہونے سے بچانے کا خیال رہنا چاہئے تھا۔ جن باتوں کو محض اتفاق کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے اُن کو بھی بادشاہ کے عالم الغیب ہونے سے تعبیر کرنے کی کمزوری کا شکار ہونے سے اپنا آپ بچانے میں ابوالفضل ناکام رہا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعات۔ ۱۔ اکبر جب کشمیر

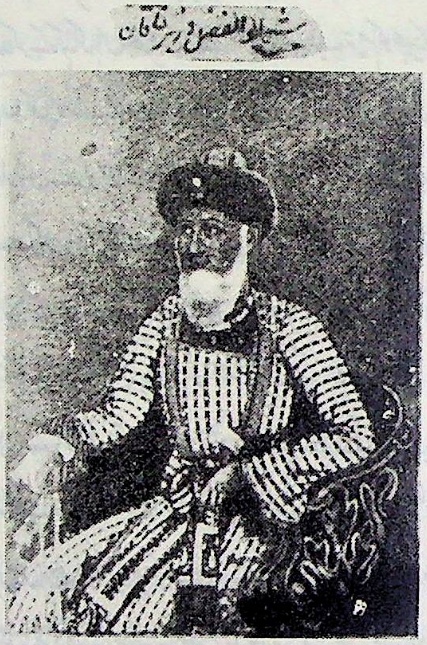
شبیہ ابو الفضل وزیر شاہان

ابوالفضل - ایک قلمی شبیہ

آیا اور یوسف شاہ کے محلات دیکھنے گیا تو کئی کئی منزلوں کے سرِ بفلک محلات اور ان کے اونچے اونچے جھروکے دیکھ کر ششدر رہا۔ وہ تعجب سے انہیں دیکھا جاتا تھا کہ کسی نے اُسے بتا دیا کہ یوسف شاہ نے ایک بار نشے کی ترنگ میں آکر ایک حرم کو جھروکے سے نیچے پھینک دیا۔ اکبر نے محل کے آس پاس گھومتے وقت ایک جھروکے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس جھروکے سے اُس بدنصیب حرم کو پھینکا ہوگا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بادشاہ کی بات سچ تھی۔ اس پر سب لوگ عش عش کرنے لگے۔ (۲) ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ گانے کی آواز سُنائی دی، اکبر نے درباریوں سے پوچھا مغنیہ کی عمر کیا ہوگی؟ غور کرنے کے بعد وہ کہنے لگے چالیس برس سے زیادہ اور پچاس برس سے کم۔ بادشاہ نے کہا بیس برس سے زیادہ اور تیس برس سے کم۔ جب اصلیت کا پتہ چلایا گیا تو بادشاہ کا اندازہ صحیح تھا۔ ایسی باتوں پر بھی بادشاہ کو ملہم غیب سمجھنا، جانے ابوالفضل کی زمانہ شناسی، موقع پرستی اور چاپلوسی کا نتیجہ تھا یا مورخانہ بصیرت کی کمی اور عقل سلیم کی ناتوانی کا۔

ابوالفضل نے تاریخ کشمیر سے متعلق جو کچھ کہا ہے، اُس کی بُنیاد زیادہ تر راج ترنگنی پر قائم کی گئی ہے۔ وہ خود بھی لکھتا ہے کہ ”جب پہلی بار اکبری دربار کشمیر پہنچا تو انہیں سنسکرت میں لکھی ہوئی ایک کتاب راج ترنگنی پیش کی گئی جس میں چار ہزار برس دوران کشمیر پر حکومت کرنے والے بادشاہوں کے حالات درج تھے۔ وہاں کے بادشاہوں کا یہ طریقہ تھا کہ عالموں کو اپنے دور کے حالات لکھنے پر مامور کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔“ ابوالفضل نے ستی سر کی کہانی دہرانے کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کی فہرست، اُن کا زمانہ حکومت اور اُن کے خاندانوں کا شجرہ راج ترنگنی سے لیا ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں ملا احمد کی تاریخ کشمیر کے علاوہ، مقامات اولیاء کشمیر از بابا حاجی ادہمی (بڈشاہ) تاریخ قاضی ابراہیم (در عہدِ حسن شاہ) اور تاریخ سید علی (در عہد چیکاں) جیسے فارسی ماخذ بھی آسانی سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اس سے ابوالفضل کی طبیعت میں تحقیق و جستجو سے لگاؤ نہ ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابوالفضل نے اکثر و بیشتر گول مول باتیں کی ہیں اور اصل واقعات پیش کرنے میں جانب داری سے کام لیا ہے اور بادشاہ کی غلطیوں سے چشم پوشی کی ہے۔ پھر بھی جہاں وہ بادشاہ کی بڑائی جتاتے ہوئے اس کی مطلق العنانی اور شاہی دبدبے کا ذکر کرتا ہے اس کے قلم سے ایسے واقعات صفحۂ قرطاس پر آ ہی جاتے ہیں جن سے بادشاہ کی قہاری، شقی القلبی اور بے رحمی بے نقاب ہوتی ہے۔ ایک

جگہ وہ لکھتے ہیں کہ کسی درباری زبان سے ایک شہزادے کی شان میں ایک قابلِ اعتراض لفظ نکلا اور شہزادہ خفا ہو گیا تو بادشاہ نے درباری کی زبان کا ایک حصہ کٹوانے کا حکم دیا۔ اسی طرح زندہ شخص کی کھال اُتروانا، ہاتھی کے پاؤں میں ڈالنا، کولھو میں پلوانا وغیرہ ثابت کرتا ہے کہ بادشاہ کی طبیعت میں چنگیز کی خونخواری کا شائبہ بھی تھا۔

اکبر کے کشمیر پر قبضہ کرنے کا حال بیان کرتے ہوئے سب سے پہلا واقعہ یوسف شاہ کے اکبری دربار میں آنے کا ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اُس کا باپ علی شاہ کشمیر کا بادشاہ تھا۔ وہ چوگان کھیلتے گھوڑے کی زین کے گھنڈے سے زخمی ہو کر مر گیا۔ امرا نے یوسف کو تخت پر بٹھایا۔ اُس کے چچیرے بھائی ابدال نے تخت چھیننا چاہا۔ یوسف نے اُس کے مکان کو گھیرے میں لیا اور ابدال مارا گیا۔ سید مبارک، عبدالمعالی، اُس کے بیٹے علی خان، حیدر چک، علی ملک جیسے اُمرا نے یوسف کے چچیرے بھائی یعنے حسین خان کے بیٹے یوسف کو بادشاہ بنانا چاہا، شر پسندوں نے سید مبارک کو اُکسایا تھا۔ یوسف شاہ بادشاہ کے ساتھ عیدگاہ میں جنگ ہوئی تو حکمران یوسف شاہ میدان میں آنے سے پہلے ہی بھاگ گیا۔ وہ پیر پنچال پار کر کے تھنہ پہنچا تھا کہ اُسے کشمیری امرا نے خطوط لکھ کر واپس بلایا۔ یوسف شاہ واپس گیا لیکن خطوط لکھنے والوں نے ساتھ نہ دیا۔ سید مبارک مقابلے پر آیا تھا۔ یوسف شاہ پھر بھاگ کر مرزا یوسف خان اور راجا مان سنگھ کے پاس لاہور پہنچا۔ بادشاہ کے دربار میں آکر زمین بوسی کی اور عنایات خسروانہ سے نوازا گیا"[1] یہ بات ذہن میں رکھنا مفید ہوگا کہ اکبری دربار اور کشمیر کے تعلق سے اس زمانے میں تین اہم آدمی ہم نام تھے۔ ریاست کا حکمران یوسف شاہ چک، اُس کا چچیرا بھائی یوسف بن حسین چک اور اکبر کا ایک خاص امیر مرزا یوسف خان۔ ان تینوں کو اکثر خان بھی لکھا گیا ہے۔ اس سے ان کا ذکر کہیں کہیں غلط ملط بھی ہوتا ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب مرزا یوسف خان کو کشمیر کا صوبیدار بنایا جاتا ہے۔ بہرحال ابوالفضل یہ نہیں لکھتا کہ یوسف شاہ چک مدد مانگنے آیا تھا۔ یہ اکبر کی تخت نشینی کے چوبیسویں سال کا واقعہ ہے۔ اکبر نامہ کی اسی جلد کے صفحہ نمبر ۴۱۵ پر تخت نشینی کے پچیسویں سال میں ہونے والے واقعات بیان کرتے ہوئے ابوالفضل یوسف شاہ کے کشمیر

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۴۸۸ ترجمہ H. BEVERIDGE انڈین ایڈیشن ۱۹۷۳

لوٹنے کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سید مبارک کو دو ماہ کے اندر اندر تخت سے اُتارا گیا تھا اور یوسف شاہ کے بچیرے بھائی لوہر چک کو تخت سونپا گیا تھا۔ یوسف شاہ نے دربار میں آداب بجا لا کر واپس کشمیر جانا چاہا تو اسے اجازت دی گئی اور پنجاب میں موجود افسروں کو اُس کے ساتھ کچھ فوج بھیجنے کی ہدایت کی گئی۔ کشمیریوں نے یوسف شاہ کو خطوط لکھے اور اپنے ساتھ فوج لانے کے نتیجے سے آگاہ کیا اور کہا کہ اکیلے چلے آؤ تخت تمہارا منتظر ہے۔ فوج تیار کر لی گئی تھی لیکن وہ چپکے سے چلا گیا، بہرام گلہ میں اُس کا استقبال ہوا۔ وہاں کا حکمران مقابلے پر آیا۔ یوسف شاہ نے تاب مقاومت نہ پا کر سوپور کی راہ لی۔ لوہر چک نے پیچھا کیا۔ وہاں یوسف شاہ نے دریا کو عبور کیا تو دیکھا کہ اُس کے ساتھ تھوڑی فوج ہے، مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا، لوہر چک کو گرفتار کر کے اُس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی۔

ابوالفضل نے اکبر کے توسیع پسندانہ عزائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ اکبر نے اس سلسلہ میں کسی قسم کی پیش قدمی کی۔ لیکن بین السطور یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اکبر کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے بے چین تھا۔ ابوالفضل ان واقعات کا عینی گواہ ہے۔ اس کے بیانات سے یہ غلط فہمی مکمل طور پر دور ہو جاتی ہے کہ کشمیر کے سربرآوردہ لوگوں نے (جن میں حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ شامل تھے) اکبر کو کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اکبر کو کشمیر پر تسلّط جمانے کا موقع خود یوسف شاہ چک نے فراہم کیا۔ وہ اکبری دربار میں تھا کہ اُس کے بیٹے یعقوب نے کشمیر میں حکومت سنبھالی اور کچھ ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں نے اکبر تک معاملہ پہنچایا۔ اس لئے نہیں کہ اکبر کشمیر پر قبضہ کرے بلکہ اس لئے کہ اکبر یعقوب کو تنبیہ کرے اور ظلم و ستم سے باز رکھے۔ کشمیر اس وقت بھی اکبر کی باج گزار ریاست تھی اور خود یوسف شاہ نے اس کی اطاعت کا طوق گلے میں ڈالا تھا۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب اکبر نے صالح عاقل کو یوسف شاہ کے پاس کشمیر بھیجا تو یوسف نے اپنے چھوٹے بیٹے حیدر کو تحفہ تحائف دے کر دربار میں بھیجا اور اطاعت کا ثبوت دیا۔

ابوالفضل صفحہ ۵۵۰ پر لکھتا ہے "عالم پناہ اپنے عہد کے شہزادوں سے اطاعت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے، جب وہ اطاعت چاہتے ہیں تو شاہی طاقت استعمال نہیں کی جاتی"۔ اسی سلسلے میں صفحہ ۵۷۶ پر لکھتا ہے۔

"جب صالح نے حکمرانِ کشمیر کی اطاعت کی خبر دی اور کہا کہ یوسف نے اکبری عنایات سے محروم ہونے کی حسرت کا اظہار کیا ہے تو اکبر نے شیخ یعقوب کشمیری کو بھیجا اور اس کے ساتھ حیدر کو یوسف کے لئے اعزازات

دے کر رخصت کیا“۔ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۷۶ پر درج ہے کہ ”یوسف نے دیکھا کہ دربار میں اُس کی عزّت افزائی ہو رہی ہے تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے یعقوب کو عالم پناہ کی خدمت سے فیض اُٹھانے کے لئے دربار میں بھیجا۔ اُس نے آکر تسلیمات و کورنشات بجالائے اور انعام و اکرام سے سرفراز ہوا“۔ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۷۰ پر لکھا ہے کہ جب اکبر ۱۵۸۵ء میں پنجاب روانہ ہوا تو کلانور پہنچ کر اُس نے یوسف کو بلوانا چاہا۔ یوسف خان حاکم کشمیر اکبر کو تحائف بھیجا کرتا تھا اور اپنے آپ کو بادشاہ کا مطیع مانتا تھا۔ دربار میں حاضری دینے میں وہ طویل مسافت بہانہ بناتا تھا۔ چونکہ پنجاب آنا مشکل نہ تھا اور یوسف نے بھی چند خطوط لکھ کر خود نذر گزارنے کی خواہش کی تھی۔ اس لئے یوسف کو بلایا گیا۔ یعقوب کو کچھ شبہ ہوا تو وہ بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ یہ ۲۲ اگست ۱۵۸۵ء کا واقعہ ہے۔ یوسف شاہ کو لکھا گیا کہ یعقوب کو تادیب کی جائے اور اُسے واپس بھیجدیا جائے۔ اکتوبر میں حسن ابدال کے مقام پر حکیم علی اور بہاء الدین کمبو کشمیر سے واپس آکر حاضر ہوئے۔ اُن کے ساتھ یوسف شاہ ہی تھا نہ یعقوب۔ اس لئے لشکر کشی کا حکم دیا گیا“۔

حیدر ملک چاڈورہ لکھتا ہے کہ اکبر یعقوب کے دربار میں آنے سے خوش نہیں ہوا تھا۔ یعقوب کے پہنچنے پر کہا تھا ”یوسف تو خود نہیں آیا، پہلے ایک بچے کو بھیجا جو خدمت کے قابل نہیں پھر یعقوب کو جو پاگل پن اور شرارت سے جدا نہیں۔ اس بات کے پیش نظر یعقوب فتح پور میں دو برس رہ کر بھی دربار سے بھاگ گیا۔

۲۰ دسمبر ۱۵۸۵ء کو شاہ رخ بہادر، بھگوانداس، شاہ قلی محرم، مبارک خان کے ہمراہ زیر کمان محمد علی اکبر شاہی فوج بھیجی گئی۔ پہلے طے پایا کہ بھمبر کے راستے سے جائیں، جب سرما ختم ہو تو درے عبور کریں۔ لیکن پھر پکھلی سے جانے کا حکم دیا گیا۔ یوسف خان نے مقابلہ کرنا چاہا۔ اُس نے دریائے نین سکھ پر قلعہ بندی کرنے کے لئے تجربہ کار لوگ بھیجے۔ اُس کی فوج بارہمولہ سے چھ کوس آگے گئی تھی کہ اکبری یلغار کی خبر ملی۔ امراء نے زمستان اور ناقابل عبور درّوں کا حوالہ دے کر اُسے غافل کر دیا۔ اکبری فوجیں بلیاس پہنچیں تو انہیں ہوش آگیا۔ ابوالفضل اپنی فوجوں کی شکست کے بارے میں کچھ نہیں لکھتا۔ نہ یہ کہ اکبری سالار نے صلح کرنے کی پیش کش کی۔ بلکہ یہ لکھتا ہے کہ ایک دن یوسف فوجوں کے معائنہ کے بہانے کوارمست میں نمودار ہوا اور اپنی آرزو ایلچی کے ذریعے بھیجی۔ لیکن اُس کا یہ اشارہ کہ شاہی افسر اور سپاہی سردی سے تنگ آئے تھے، غور کرنے پر آمادہ کرتا ہے کہ

پسپائی کس طرف سے تھی۔ بہر حال صلح ہوئی اور طے پایا کہ یوسف دربار میں آئے گا۔ بادشاہ نے یہ صلح منظور کی لیکن اُسے فوجوں کا لوٹنا ناپسند ہوا۔ وہ کشمیر کو فتح کر کے یوسف کے حوالہ کرنا چاہتا تھا۔ یوسف جب دربار میں پیش ہوا تو بادشاہ نے اُسے اپنی غلطیاں یاد دلائیں۔ یوسف شرمندہ رہا اور خاموش۔ بادشاہ نے اُسے کشمیر واپس کرنے کا ارادہ کیا لیکن امراء نے مشورہ دیا کہ اُسے یہیں رکھا جائے۔ پہلے کشمیر کو فتح کیا جائے پھر اسے سونپا جائے (ملاحظہ ہو صفحہ ۷۲۸) اسے ٹوڈرمل کے حوالہ کیا گیا۔ اکبر نامہ میں بھگوانداس کے اقدام خودکشی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ بہر حال یعقوب نے کشمیر کی حکومت سنبھالی۔ جب اُس کے متعلق شکائتیں دربار میں پہنچیں تو پھر فوج بھیجی گئی۔ اس بار بھی ابوالفضل اپنی شکست کا ذکر نہیں کرتا۔ اسی کتاب کے صفحہ ۷۶۲ پر درج ہے کہ "یعقوب نے معاہدہ توڑا اور مشیروں نے اُسے شاہ اسمٰعیل کا لقب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اُس نے ظلم کا دروازہ کھولا سنّیوں کو ستانے لگا، قاضی موسیٰ کو شہید کیا، شمسی اُس کے خلاف اُٹھا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور شمسی چک کو صلح کرنے پر کمراز کا علاقہ ملا۔ لیکن یعقوب نے جلد ہی چھین لیا۔ غرض بدامنی کا دور دورہ تھا۔" ۱۱ ستمبر ۸۶ء کو پھر فوج کشی ہوئی۔ بھمبر کے راستے سے فوج گئی، کشمیریوں نے مقابلہ کیا۔ یعقوب خود شہر میں تھا۔ جب وہ ہیرہ پورہ پہنچا تو پتہ چلا کہ کوئی اُس کا ساتھ نہ دے گا۔ اُسے مشورہ دیا گیا کہ کشتواڑ چلا جائے۔ کشمیریوں نے پہلے حسین چک اور پھر شمسی چک کو سردار بنالیا۔ لڑائی ہوئی اور مغل فوج ہار گئی (ابوالفضل اس شکست کے بارے میں بھی خاموش ہے)۔ اسی سال مغلوں نے دوسری بار حملہ کیا اور قاسم خان میر بحری خود فوج کے ساتھ تھا۔ مغلوں نے اپنے ساتھ آنے والے کشمیریوں کو قید کیا، کشمیریوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ناکام رہے۔ اور مغل فوج سرینگر میں داخل ہوئی۔ یہ اکتوبر ۱۸۸۶ء کا واقعہ ہے۔ ۱۸۸۷ء میں یعقوب کشتواڑ سے آیا اور چھاپہ مار لڑائی شروع کی۔ اب مرزا یوسف خان، قاسم خان کی جگہ کشمیر کے صوبیدار مقرر ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ حاکم خان کشمیریوں کی چھاپہ مار لڑائی سے تنگ آیا تھا اور اس نے واپس بلائے جانے کی درخواست کی تھی (ملاحظہ ہو اکبر نامہ جلد ۳ صفحہ ۷۹۶)۔

اب اکبر نے خود کشمیر جانے کا ارادہ کیا اور بھمبر کا راستہ منتخب کیا۔ یہ سال ۱۸۸۹ء کا واقعہ ہے۔ کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنے کے بعد وہ پکھلی کے راستے واپس گیا۔ یعقوب چک نے پہلے بھائی کے ذریعے اور پھر خود آکر معافی مانگی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اُس نے لکھا تھا "جوانی کی ترنگ میں جو ہوا سو ہوا" اب بادشاہ

اپنا چپل بھیجے جسے میں اپنے تاج پر رکھ کر حاضر ہو جاؤں"۔ صفحہ ۸۷۷ پر لکھا ہے کہ چند کشمیری امرا، بھاگ کر کشمیر گئے اور علی ریزنہ کے پاس پناہ لی۔ وہاں اُنہیں مغل حاکموں نے پکڑ کر سری نگر میں پھانسی دے دی صفحہ ۸۸۳ پر یعقوب اور اُس کے بھائی کے فرار ہونے کی کوشش کا ذکر ہے جسے ناکام بنایا گیا اور انہیں مان سنگھ کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے تین سال بعد اکبر دوسری بار پیر پنچال کے راستے کشمیر آیا۔ شمسی چک کی بیٹی داخل حرم ہوئی اور حسین چک کے بیٹے مبارک خان کی بیٹی سلیم کے حرم میں شامل ہو گئی۔ خواجہ شمس الدین صوبیدار ہوا۔ اس کے پانچ سال بعد اکبر تیسری بار وارد کشمیر ہوا۔ ہیرہ پورہ کے راستے سے آیا اور اسی راستہ سے لوٹا۔ پہلے وہ پکھلی کے راستہ سے لوٹا کرتا تھا۔ اس بار ریاست کا بندوبست ہوا، ملکی انتظام پر توجہ ہوئی اور ناگر نگر کے گرد فصیل تعمیر ہوئی۔

ابوالفضل کشمیر میں شہنشاہ اکبر کے جن مشاغل کا ذکر کرتا ہے، اُن میں دریائی سیر، آبی جانوروں کا شکار، ولر کی سیر، صوفیوں سنتوں سے ملاقات، گھوڑ سواری، چناروں کی چھاؤں سے لطف اندوزی، ولر میں کشتی رانی، زعفران کے کھیتوں میں تفریح اور تعمیرات سے دلچسپی اور اس سلسلے میں اقدامات شامل ہیں۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ کشمیر میں اکبر دریائی سفر کا شوقین تھا۔ وہ کھنہ بل تک کشتی میں جاتا تھا۔ ایک بار اچھابل گیا تو گھوڑے پر سوار ہو کر۔ اُن دنوں آبی جانوروں کے شکار کا طریقہ بڑا دلچسپ تھا۔ لوگ باز پالتے تھے اور اُن کو کندھوں پر بٹھا کر کشتی میں سوار ہوتے تھے۔ جونہی آبی پرندے نظر آتے اپنے سے باز اُڑاتے۔ یہ باز کافی اونچائی تک اُڑ کر زور سے پرندوں پر جھپٹتے اور ان کو پنجوں میں پکڑ کر ان کی پیٹھ پر کھڑے رہ کر، انہیں پانی میں تیرا کر کشتی تک لے آتے۔ یہ بڑا دلکش نظارہ ہوتا تھا۔ اکبر نے بھی یہ شکار کھیلا، اسلام آباد جاتے ہوئے انہوں نے واحد صوفی کی جھونپڑی پر جا کر اُس سے مُلاقات کی۔ کشتی ہی کے ذریعے دوسرے اور تیسرے سفر کے دوران زعفران کے کھیت دیکھنے گئے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ "گلاب کے باغ دلفریبی اور خوشبو میں لاجواب ہیں۔ اگرچہ کنول جیسے دلکش نہیں لیکن ان کی دلکشی بے مثال ہے۔ اکبر جہاں سیر کو جاتا وہاں صرف تفریح میں محو نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا اور اپنے مشاہدہ سے بھی خوب کام لیتا تھا۔ ابوالفضل کے بیانات، زبان، جغرافیائی حالات، تہذیب و تمدن اور حکومت کے اعتبار سے کشمیر کو ایک الگ تھلگ دیس ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ دیس بالہنان سے اوڑی

تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا حدود اربعہ، مشرق میں پرستان اور چناب، جنوب مشرق میں بانہال اور جموں کی پہاڑیاں، شمال مشرق اور شمال مغرب میں تبت، جنوب مغرب میں گکھر اور مغرب میں پکھلی اور کشن گنگا قرار پاتا ہے۔ وہ اس کی لمبائی ۱۲۰ کوس اور چوڑائی دس سے پچیس کوس (کوس = پونے تین میل) درج کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ اس کے چاروں طرف ہمالیہ کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کشمیر سے باہر جانے کے چھبیس راستے ہیں جن میں سے بھمبر اور پکھلی کے راستے گھوڑ سواری کے قابل ہیں اور بھمبر کا راستہ نزدیک ترین ہے۔

وہ یہاں کے لوگوں کی زبان کو کشمیری کا نام دیتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ لفظ کشمیری سنسکرت سے تعلق رکھتا ہے یا فارسی سے۔ لیکن یہ بات واضح کرتا ہے کہ کشمیر کے لوگ یہ لفظ استعمال نہیں کرتے۔ وہ اپنے ملک کو "کشیر" اپنے آپ کو "کاشُرک" اور اپنی زبان کو "کاشُر" لفظوں سے یاد کرتے ہیں۔ وہ کشمیری کو ایک ہی زبان سمجھتا ہے اور لکھتا ہے کہ جموں صوبے اور وادیٔ چناب کی بولیوں، پوگلی، سراجی اور رام بنی کا تعلق بھی اسی زبان سے ہے۔ ان کی شکلیں اس بنا پر مختلف دکھائی دیتی ہیں کہ یہاں کشمیری، ڈوگری میں ضم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ریاسی ضلع کی کئی بولیاں کشمیری زبان کے لہندا کی بولی چبل سے ملنے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں۔ کشمیری کی ایک خاص بولی صرف کشتواڑ میں پائی جاتی ہے۔ کشمیر میں تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ کی رُو سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بولی میں ذرا سا فرق ہے۔ وہ کشمیری زبان کو دردی اور شنا خاندان کی زبان قرار دیتا ہے اور سنسکرت سے اس کے رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس زبان کو سنسکرت جتنی قدیم زبان سمجھتا ہے۔

ابوالفضل کے زمانے میں مغل سلطنت انتظامی امور کے پیش نظر صوبوں میں منقسم تھی اور صوبے سرکاروں میں، سرکاریں پرگنوں یا محالوں میں اور محال، دستوروں میں یعنی صوبہ موجودہ زمانہ کی سٹیٹ اور سرکار، ڈویژن یا پراونس، پرگنے یا محال، موجودہ زمانہ کے ضلعے ہوں گے۔ کشمیر کی حیثیت ایک سرکار کی تھی اور یہ سرکار صوبہ کابل میں شامل تھی۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق کشمیر سرکار کے دو حصے تھے، مراز اور کمراز، سرینگر مراز میں شامل تھا۔ مراز تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ سری نگر، شمال مشرقی پرگنہ اور شمال مغربی پرگنہ۔ اوّل الذکر تین محالوں، ثانی الذکر سات محالوں اور ثالث الذکر گیارہ محالوں پر مشتمل تھا۔ یعنی مراز کے

کل اکیس محال تھے۔ کمراز کے صرف سولہ محال، کمراز خود ایک محال کا نام بھی تھا، جب کہ مراز کسی محال کا نام نہ تھا۔ مراز کا مالیہ ۱۷،۹۲،۸۱۹ خروار مقرر تھا اور کمراز کا ۱۲،۱۸،۷۹۹ خروار۔ مراز میں رسالہ فوج تھی ۱۶۲۰ اور پیدل ۶۰۰۴۔ کمراز میں پیدل فوج ۱۶۹۶۵ اور رسالہ ۱۵۹۰۔ ظاہر ہے کہ کمراز فوجی اعتبار سے اہم تھا اور مراز زرعی اعتبار سے۔

لگان کے سلسلے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ "یہاں مالیہ نقد میں وصول کرنے کا رواج نہیں صرف سائر المواضع میں کہیں کہیں نقد میں لیا جاتا ہے۔ پیداوار کا ایک تہائی لگان مقرر تھا لیکن عملاً دو تہائی لیا جاتا تھا۔ اکبر نے نصف پیداوار لینا مقرر کیا۔" ابوالفضل کے بیان کی رُو سے بڈشاہ کے زمانے میں مالیہ کا تخمینہ ۷۷ لاکھ خروار تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہمیریوں کے نالائق جانشینوں اور چکوں کے دور کی خانہ جنگی اور بدامنی کے علاوہ بیرونی حملوں سے تباہی کے نتیجہ میں اکبر کے زمانہ میں لگان کا تخمینہ تیس لاکھ خروار کے لگ بھگ ہی تھا۔

اکبر نے لگان کے علاوہ لئے جانے والے د ۵ ٹیکس معاف کئے، خصوصاً باج اور تمغہ جس سے لگان میں ۲۷،۰۲۴ خروار کی کمی ہوئی۔ اکبر نے یہ اقدام نہ صرف اس غرض سے کیا کہ ریاست میں خوشحالی کا دور دورہ ہو بلکہ اس لئے بھی کہ لوگوں کے دل جیتے جاسکیں۔ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کے لئے اکبر نے ناگر نگر (قلعہ ہاری پربت کا علاقہ) کے گرد بہت چوڑی اور اونچی فصیل تعمیر کرنے کا حکم ہی نہ دیا جس سے بہت سے لوگوں کے روزگار کی سبیل پیدا ہوگئی بلکہ دوسری بار کشمیر آنے پر عیدگاہ میں نقد رقم بھی تقسیم کی اور تیسری مرتبہ دورہ کشمیر کے دوران چودہ مقامات پر لنگر کھولے اور ہر ایت دار کو لوگوں میں نقد رقم تقسیم کرتے رہے۔ عوامی، فصلی اور مذہبی تہواروں میں شمولیت کی اور چک شہزادوں کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کیں۔ اکبر کے ان اقدامات سے جہاں اُس کی سیاسی حکمت عملی، اعلیٰ تدبُر اور عوام الناس کی نفسیات سمجھنے کی صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اکبر نے طاقت استعمال کرنے کے سارے حربے بے کار ثابت ہوتے دیکھے تو فیاضی، دریادلی، جود و سخا اور مہر و محبّت کے ساتھ ساتھ ترغیب و تحریص کے ذرائع بھی کام میں لائے۔ اس سے جہاں کشمیریوں کی بہادری، دلیری اور شجاعت جیسی خوبیوں کی داد دینے کو جی چاہتا ہے وہاں ان کے ہوس زر، ذات پسندی، نا اتفاقی اور شکم پروری جیسی برائیوں

پر افسوس ہوتا ہے۔ ابوالفضل کے بیانات اُن لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ زور زبردستی اور دباو یا دھمکیوں سے کشمیریوں پر حکومت کی جاسکتی ہے۔ ان پر آزمانے کا بہترین نسخہ ہے خلوص و محبّت، ایثار و ہمدردی، رواداری اور بھائی چارہ۔

ابوالفضل کی تحریر کشمیریوں کے دلوں میں کشمیریت کے شدید احساس ہونے پر بھی مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سُنّی، امامیہ اور نور بخشیہ ایک دوسرے کے ساتھ مستقل طور دست و گریباں ہیں لیکن یہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں خاص کر ایران اور ترکستان سے۔ خود کشمیری بھی انہیں جذب نہیں کر سکتے۔ ان کے خیال میں اصلی کشمیری بہت امن پسند ہیں، اور پیار و محبت کے بھوکے۔ علم و فضل کے لئے وہ ہندوؤں کی سراہنا کرتے ہیں اور برہمنوں کو معزز ترین طبقہ قرار دیتے ہیں جو "رسم و روایت کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی ضرورت کے باوجود خدا کے سچّے پُجاری ہیں"۔ مغلوں کے زمانے میں بھی بقول ابوالفضل علمی کتابیں سنسکرت میں تھیں، کشمیری صرف بولی جاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "پرانے زمانے میں ہندوؤں کا علم مروج تھا لیکن ان دنوں کئی علوم سیکھے جاتے ہیں"۔ کشمیریوں کے نجوم اور ہیئت کے علوم ان کے بقول ہندوؤں کی طرح کے ہیں۔ اُس زمانے میں یہاں بھوج پتر لکھنے کے کام آتا تھا۔ وہ اس کے لئے "توز" لفظ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ ایک درخت کا چھلکا ہے جو نہوں کی صورت میں درخت سے کاٹ کر اُتارا جاتا ہے۔ اُن کے تمام پرانے دستاویزات اسی پر لکھے ہوئے ہیں"۔ مسودات کی تیاری اور سیاہی بنانے میں وہ کشمیریوں کی مہارت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سیاہی دھونے سے جاتی ہے نہ مٹانے سے مٹتی ہے۔ ابوالفضل نے کشمیر میں سادات اور علماء کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن اُن کا رشیوں کی تعریف کرنا اور اُن کی تعداد دو ہزار بتانا ثابت کرتا ہے کہ اُن کے زمانے میں ریشی سلسلہ نہایت مقبول تھا۔ لکھتے ہیں "وہ مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو بُرا بھلا نہیں کہتے، بھیک نہیں مانگتے نہ تنگ کرتے ہیں۔ راستے میں ثمر دار درخت لگاتے ہیں اور لوگوں کی بھلائی کے کام آتے ہیں۔ وہ گوشت نہیں کھاتے اور شادی نہیں کرتے۔ اس قسم کے قریب دو ہزار لوگ ہوں گے"۔

ابوالفضل کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ مغلوں کو کشمیر فتح کرنے میں کوئی اقتصادی فائدہ نہ تھا۔ وہ فوجی لحاظ سے بھی اسے اہم نہیں سمجھتے تھے۔ کشمیر کی جو کچھ اہمیت تھی وہ صرف ایک تفریح گاہ کی

حیثیت سے تھی مغلوں کو یہاں پہنچنے میں ناقابل بیان مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ باد و باران کا شکار ہونا، پہاڑوں پر سے لڑھک جانا، برف اور یخ پر پھسل کر گہری کھائیوں میں گرنا، سپاہیوں اور گھوڑوں کا نقصان، سردی سے ہمراہیوں کا لقمۂ اجل ہونا وغیرہ وغیرہ۔ خود اکبر دو ایک بار گھوڑے سے گر کر بمشکل جان بچا سکا۔ لیکن جب وہ ان تمام صعوبتوں کا سامنا کرنے کے بعد اس جنّت ارضی میں پہنچ جاتے تھے تو سارا دکھ درد اور سفر کی تمام صعوبتیں بھول جاتے تھے۔ ان کے لئے کشمیر کی حیثیت ایک بہترین سیرگاہ کی تھی۔ ابوالفضل نے یہاں کے سبزہ زاروں، آبشاروں، برف پوش پہاڑوں، کھنکتے پانیوں، چھلکتے چشموں، جھنجھناتے جھرنوں، نغمہ زن نالوں ندیوں، انواع و اقسام کے پھولوں اور شیریں و خوش ذائقہ پھلوں کی خوب تعریف کی ہے۔ لیکن ان تعریفوں میں ادیبانہ انداز سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ایک سفرنامہ نویس کی طرح جیسے لکھنا تھا، لکھا گیا ہے۔ وہ اس ملک کو مسحور کن سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک سربفلک قلعہ کے ارد گرد جیسے دائمی بہار لیا ہوا باغ ہو۔ یہ دنیا داروں کے لئے طرب افزا ہے اور زاہدوں کے لئے خلوت گاہ، اس کے چشمے ذائقہ کے لئے شیریں، اس کے آبشار سامع کے لئے نغمہ، اس کی آب و ہوا زندگی بخش، ترکستان اور ایران جیسی، بارش اور برف وہاں سے ملتی جلتی، موسمی بارشیں ہندوستان کی طرح، پھول دلفریب اور طرب افزا۔ بنفشہ، گلاب اور جنگلی نرگس سے میدان بھرے ہوئے ہیں۔ پھولوں کی تفصیل بتانا ناممکن ہے، بہار اور خزاں حد درجہ حسین ہیں" وہ پہلی بار اکبر کے ہمراہ کشمیر آتے ہوئے بہرام گلہ پہنچا تو لکھا "خوبصورت جگہ ہے، پھولوں کے انواع اور آب و ہوا میں چند ہی جگہیں اس کا جواب ہیں۔ پشیانہ میں جنگل سے بھری پہاڑیوں، بے شمار پھولوں اور آبشاروں سے دل کو فرحت ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ درختوں، پھولوں، فرحت بخش ہوا، آبشاروں کے نغمے حیرت میں ڈالتے گئے اور راستہ کی تکلیف بھلاتے گئے۔ لیکن جب میدانوں میں آئے تو ایک نئی دنیا سامنے تھی، نئی جنّت نے چہرے سے نقاب اٹھائی"۔

ابوالفضل کشمیر میں بہنے والے دریا کے لئے "بہت" (وتھ) لفظ استعمال کرتا ہے اور دریا اور ندیوں پر کدل (پل) ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے زمانے میں دریا پار کرنے کے لئے لکڑی کے بنے ہوئے پُل تھے اور لکڑی کی بنی ہوئی کشتیاں۔ کشتی رانی عام تھی، دریائی ٹرانسپورٹ ہی

کارواج تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے یا بوجھ ڈھونے کے لئے کشتیاں تھیں۔ کشتیوں کی کئی قسمیں تھیں، شکارہ، ڈونگے، باربردار کشتیاں (بُہتر) اور (زدہ ہرتہ) یعنے شکاری کشتیاں۔ دریائی جلوس نکالنے کا رواج تھا۔ حکمران طبقہ یا رئیسوں کی دریائی سیر کے وقت پرندے کام میں لائے جاتے تھے۔ اکبر کشتی ہی کے ذریعے اننت ناگ اور بارہمولہ جاتے تھے۔ کشتی میں ہی ڈل کی اور ولر کی سیر کو جاتے۔ کشتیوں اور لکڑی کے مکانوں کے رواج سے نجاروں اور ہانجیوں کی چاندی تھی، یہ دونوں پیشے خوب نفع بخش تھے۔ سڑکیں نہیں تھیں۔ خشکی کا سفر گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر کیا جاتا تھا یا پیدل، خشکی اور پہاڑی علاقوں میں باربرداری کا کام گھوڑوں اور گدھوں کے علاوہ بیلوں اور بھیڑوں سے لیا جاتا تھا۔ آدمی بھی بوجھ ڈھوتے تھے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ ہاتھی اور اونٹ اس ملک میں نہیں ہوتے۔ گائیں کالی اور بھدی ہوتی ہیں لیکن ان کا دودھ نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ گھوڑے پست قد ہیں لیکن مضبوط اور دشوار راستوں پر چلنے والے۔ بھیڑوں کی ایک عمدہ قسم ہے جسے ہنڈو کہتے ہیں۔ ان کا گوشت بہت لذیز ہوتا ہے اور صحت بخش۔

معاشرتی حالات میں ذرائع آمد و رفت کے ساتھ ساتھ وہ کھانے پینے کے عادات اور لباس کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ پٹّو کا لباس پہنتے تھے جو عام طور پر ایک ہی کپڑے پر مشتمل ہوتا تھا یعنے "پھرن" (پیراہن) ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ کئی سال چلتا ہے۔ یہ لوگوں کے افلاس کا ثبوت ہے۔ وہ لوگوں کی اقتصادی پسماندگی، ان کے افلاس اور ادبار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہاں کے لوگ اس ملک کا ملال ہیں"۔ عُسرت و تنگدستی، افلاس وفاداری کے باوجود وہ یہاں کے لوگوں کی دو خوبیوں کی طرف خاص طور پر اشارہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "تعجب یہ ہے کہ گزراوقات کے لئے ذرائع کی کمی اور آبادی کی کثرت کے باوجود چوری اور بھک منگی بہت کم ہے"۔ رہائش کا حال لکھتے ہوئے لکڑی کے مکانات کا ذکر کرتا ہے جو اُس کے زمانے چار چار یا پانچ پانچ منزلہ بھی ہوتے تھے۔ شاید یہ امیروں کے مکان ہوں گے۔ مکانات صحن بند نہیں ہوتے تھے۔ پہلی منزل میں گاوخانے اور گودام، دوسری منزل میں رہائش اور تیسری اور چوتھی منزل اسباب خانہ رکھنے کے کام آتی تھی۔ اُس کے بقول لکڑی کی افراط اور لگاتار زلزلوں کی وجہ سے پتھر اینٹ کے مکان نہیں بنائے جاتے۔۔۔ چھتوں پر گل لالہ اُگایا جاتا ہے جو بہار میں عجیب بہار دکھاتا

ہے۔ وہ لکھتا ہے "کہ لوگ چاول اور مچھلی کھاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور سبزیوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ سبزیوں کو سکھا کر بھی رکھتے ہیں۔ چاول شام کو پکا کر رات کو اٹھا رکھتے ہیں اور صبح کھاتے ہیں" یہاں ابوالفضل کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ زیادہ محنت کے لئے وقت بچانے کی غرض سے لوگ صبح کو رات کا بچا ہوا کھانا کھاتے تھے نہ کہ قصداً اٹھا رکھتے تھے۔ انڈے گلگت اور تبت سے لائے جاتے تھے۔ پیداوار کے سلسلے میں اُس کا بیان ہے کہ "چنا اور جو نہیں اُگایا جاتا، گندم کی پیداوار کم ہے اور دانے سیاہی مائل ہوتے ہیں، لوگ بہت کم کھاتے ہیں۔ تربوز، سیب، خوبانیاں اور آلو بخارے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ انگور کافی ہیں لیکن اچھی قسمیں بہت کم۔ انگور کی بیلیں توت کے درختوں پر چڑھتی ہیں۔ توت کم کھایا جاتا ہے کیوں کہ اس کے پتّے ریشم کے کیڑوں کی غذا بنتے ہیں۔ پیداوار کا انحصار بارش پر ہے، مصنوعی ذرائع آبپاشی بھی کام میں لائے جاتے ہیں"۔

دست کاروں اور ہنرمندوں کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ "یہاں پٹو کا عمدہ کپڑا تیار ہوتا ہے، خصوصاً شال بڑے خوبصورت بنتے ہیں۔ اونی پارچے نہایت ملائم ہوتے ہیں۔ اون کی عمدہ قسم تبت سے لائی جاتی ہے۔ یہاں کے ہنرمند بڑے بڑے شہروں میں کام کرنے کے مستحق ہیں۔ ان کی چیزوں کا بازار نہیں لگتا۔ ان کے گھروں پر ہی خرید و فروخت کا کام ہوتا ہے اور بڑی بھیڑ لگی رہتی ہے، یہ لوگ زیادہ تر سرینگر میں ہیں"۔

ابوالفضل کشمیر میں حضرت امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کے خانقاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "وہ کچھ عرصہ اس شہر میں رہے۔ ان کی بنائی ہوئی خانقاہ ابھی اس کی یاد قائم رکھے ہوئے ہے"۔ کشمیر کے مندروں کے کھنڈرات دیکھ کر ابوالفضل ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ ان عمارتوں کو حیرت انگیز قرار دیتا ہے۔ ابوالفضل اس بات پر بھی حیران ہے کہ کشمیر میں زہریلے جانور اور کیڑے مکوڑے جیسے سانپ اور بچھو نہیں ہوتے۔ وہ اس روایت کا ذکر بھی کرتا ہے کہ مہادیو پہاڑ کی چوٹی جہاں جہاں نظر آئے، وہاں سانپ، بچھو نہیں ہوتے لیکن اُس کے بقول جوئیں، پسو، مچھر اور مکھیاں عام ہیں۔

سرینگر کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ "سرینگر شہر راجدھانی ہے، اس کی لمبائی چار فرسخ ہے (فرسخ ½ ۳ میل) بہت، مار اور لچھمن نام کی ندیاں اس شہر میں بہتی ہیں، لچھمن کول میں اکثر پانی

نہیں ہوتا۔ مار کبھی کبھی اس قدر پایاب کہ کشتیاں نہیں چل سکتیں۔ یہ شہر زمانہ قدیم سے پُررونق رہا ہے اور مختلف قسم کے ہنرمندوں کا مسکن ہے۔۔ مشرق میں کوہ سلیمان نام کی ایک اونچی پہاڑی ہے اور شہر سے ملی ہوئی دو بڑی جھیلیں جو ہمیشہ پانی سے بھری رہتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا پانی صحت بخش ہونے کے علاوہ ذائقے میں کبھی خراب نہیں ہوتا بشرطیکہ بدررو جاری رہے۔"

سرینگر کے علاوہ ابوالفضل دوسرے مقامات کا ذکر بھی کرتا ہے۔ خاص کر کشمیر کے مشہور تیرتھوں کا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہاں کے اِن سارے مقامات کی سیر نہیں کی ہے اور اُن کا بیان ذاتی مشاہدہ پر مبنی نہیں۔ انہوں نے لوگوں سے اطلاعات حاصل کرکے درج کئے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں میں مشہور روایتوں، ان کے توہمات اور ان کے عقائد کے بارے میں بھی ابوالفضل خاموش نہیں۔ ان میں سے چند باتیں خود اس کے تجربے میں آئی ہیں۔ مثلاً بہرام گلہ کے راستے سے گزرتے ہوئے پہاڑ پر باد و باران کا شکار ہونا اور اس سلسلے میں یہ روایت کہ "خدا دوستوں نے طلسم باندھا ہے کہ یہاں سے کوئی فوج گزرے، کوئی گھوڑا یا بیل مارا جائے یا ڈھول بجے تو طوفان اُٹھتا ہے، برف و باران ہوتا ہے"۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ "یہ بات ہر بار سچ لگی"۔ اُس نے کسی کسی روایت کی تکذیب بھی کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر ہر بات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ مثلاً اکبر جب شہاب الدین پورہ گیا تو سنگم کے قریب چناروں کی چھاؤں سے بھی لطف اُٹھایا۔ اُسے بتایا گیا کہ اگر یہاں کوڑا کرکٹ یا غلاظت ڈالی جائے تو غیبی طور صاف ہو جاتی ہے۔ اس کی تحقیق کی گئی تو غلط نکلا۔ ابوالفضل نے جن پوتر جگہوں کا نام لیا ہے ان میں ویرناگ، قمبر گاؤں میں بون سندھ کا چشمہ، دیوسر کا بلاوناگ، کٹھار کا چشمہ، نیلہ ناگ، چشمہ بیرو، لار کے چشمے، اشبری اور شکرناگ کے چشمے، تھید کے چشمے، زلون کا چشمہ، کھریو کے چشمے، اچھابل کا فوارہ، مٹن کا مندر، عیش مقام، زیج بہارہ، امرناتھ، برنگ کا تالاب، ککرناگ کے چشمے، باباہال کا مندر، تولہ ملہ، ست پور کا تالاب، ترہگام، نچھ ہامہ کی گھاٹی، شاردا مندر وغیرہ شامل ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

"ہندو سادھو سارے ملک کو مقدس سمجھتے ہیں۔ یہاں مہادیو کے ۴۵، وشنو کے ۶۴، برہما کے تین اور درگا کے ۲۲ متبرک استھاپن ہیں۔ وہ بغیر شاہ ہمدانؒ اور زین شاہ صاحب مسلمانوں کی کسی زیارت کا ذکر نہیں کرتا کئی مقامات کی اہمیت بیان کرنے میں کہیں کہیں وہ کا قلم بھٹک گیا ہے۔ جیسے نیلہ ناگ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ نیل مت

پوران اسی کی گہرائیوں سے حاصل ہوا جب کہ اس کا تعلق ویرناگ سے بتایا جاتا ہے۔ پامٹن کریوے کا وہ تالاب جسے چاہ بابل کا نام دیا گیا تھا۔ پھر بھی ابوالفضل کے بیانات سے کچھ پتے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ شالامار پہاڑی کا نام شاہ کوٹ تھا اور اس گاؤں کا نام باز ڈل یا مرواڈون میں عظیم الجثہ ہنڈو پایا جاتا جو بار برداری کے کام آتا تھا۔

عام لوگوں میں پوتر مقامات سے متعلق روایتوں کو بھی قابل ذکر سمجھا گیا ہے جیسے لار کے پہاڑ کی چوٹی پر موجود تالاب میں گوشت کی بوٹی ڈالی جائے تو یاد و باران کا طوفان آجاتا ہے، دیوسر کے بلاوناگ میں قسمت آزمانے کے لئے اپنا نام لکھ کر چاول بھرا مٹی کا برتن منہ بند کرکے ڈالا جاتا ہے۔ تو کچھ دیر بعد سطح پر تیرنے لگتا ہے۔ اگر اس میں پکے ہوئے چاول پائے جائیں تو نیک شگون ہے اور اگر کیچڑ نظر آئے تو بُرا شگون۔ باہہال مندر میں، دو فریق میں سے کسی کا حق پر ہونا معلوم کرنا ہو تو پکّے چاولوں کے دو برتن رکھے جاتے ہیں جن پر فریقین اپنا نام لکھ رکھتے ہیں صبح کو جس برتن سے گلاب اور زعفران برآمد ہوں، وہ شخص حق پر ہے اور جس میں کیچڑ پایا جائے وہ مورد الزام۔ اگر کسی ماہ کی نویں تاریخ کو شکروار آئے تو شکرناگ کا چشمہ اُبلتا ہے۔ زلیون کے چشمہ میں بوائی کے موسم میں دودھ ڈالا جاتا ہے۔ اگر ڈوب جائے تو فصل اچھی ہوتی ہے۔ اگر سطح پر تیرنے لگے تو فصل کی خرابی کا اندیشہ ہے۔ علیٰ ہذالقیاس۔

زعفران کے سلسلے میں ابوالفضل نے کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اُس کے بقول پانپور گاؤں میں دس ہزار بیگہ زمین پر کیسر کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ مارچ کے آخر سے اپریل تک بوائی ہوتی ہے۔ زمین تیار کرکے کیاریاں بنا کر اس کی گٹھلیاں لگائی جاتی ہیں۔ پودے اُگ کر ستمبر میں جوبن پر آجاتے ہیں۔ تنا انگلی کے برابر ہو جائے تو پھول لگتے ہیں۔ آٹھ پھول لگنے کے بعد پھولوں سے ریشے الگ کئے جاتے ہیں ہر پھول میں چھ چھ پنکھڑیاں اور چھ چھ ریشے ہوتے ہیں۔ تین زرد اور تین سرخ۔ یہی سرخ ریشے زعفران کہلاتے ہیں۔ پھول چُننے کا نظارہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ یہ پودا ایک دفعہ بویا جائے تو چھ سال تک پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان گٹھیوں کو نکال کر پھر سے لگایا جاتا ہے۔ وہ پانپور کے علاوہ پرسپور میں بھی زعفران کی کاشت کا ذکر کرتا ہے۔

ابوالفضل کے بقول یہاں آبی پرندوں کا شکار کھیلنے کے ساتھ ساتھ تیتروں اور بارہ سنگھوں کا شکار بھی کھیلا جاتا تھا اور کبھی کبھی چیتوں کا بھی۔ یہ امیر لوگوں کی ایک دلچسپ تفریح تھی۔ اس زمانے میں چوگان بازی کا رواج ہونے کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ یہ کشمیریوں کا پرانا کھیل تھا۔ نندی مرگ کی خوبصورتی کا ذکر

کرتے ہوئے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نندی مہادیو کی پجاری تھی۔ ایک جوان کے ساتھ، جو یہاں پولو کھیلنے آتا تھا، محبت ہوئی۔ گورنر نے یہ جگہ آباد کروانا چاہی لیکن نندی نے خرید کر چوگان بازی کے لئے وقف کر دی۔

ابوالفضل نے اُس زمانے کے مشہور تیوہاروں کا حال بھی لکھا ہے، خاص کر ۱۳ بھادون کو منایا جانے والا وتستا کے سلسلے کا تیوہار۔ جب چراغ جلاکر دریا میں بہائے جاتے تھے اور دریا کے دونوں کناروں پر چراغاں کیا جاتا تھا۔ اُس نے یہاں کے چند عجائبات کے بارے میں بھی قلم کو جنبش دی ہے۔ ڈل کی سطح پر بہتے ہوئے جزیرے جن پر کھیتی ہوتی ہے اور اُن کی چوری جسے زمین کی چوری کا نام دیا گیا ہے بیا پچھ پرگنہ میں پایا جانے والا شجر لرزان یا ہلتا درخت جس کی صرف ایک شاخ ہلائی جائے تو پورا درخت کانپنے لگتا ہے۔ اس کا نام ہل تَل، ہل دل اور ہل تھل بتایا جاتا ہے۔ آئین اکبری میں ہل تل آیا ہے اور اقبالنامہ میں ہل دل۔ آئین اکبری میں یہ نام گاؤں کے لئے دیا گیا ہے اور تزک جہانگیری میں درخت کے لئے۔ حیدر ملک نے ہل تھل لفظ استعمال کیا ہے۔ تزک کی رُو سے یہ چاڈورہ میں پایا جاتا تھا اور آئین اکبری کے مطابق خام پورہ یا خانپورہ میں۔

ابوالفضل کے زمانے میں کشمیر میں گھاس کی جوتی؎ کا خوب رواج تھا۔ خود اکبر کو پہلی بار سفر کشمیر کے موقع پر بہرام گلہ سے گزرتے وقت یخ اور برف سے آسانی کے ساتھ گزرنے اور پھسلنے سے بچنے کے لئے گھاس کی جوتی پہننے کے لئے پیش کی گئی لیکن وہ اسے پہننے پر رضامند نہ ہوا۔ البتہ اُس کی تحریروں میں کسی جگہ کانگڑی کا ذکر نہیں ملا۔ شاید اس لئے کہ اکبر کو زمستان کے موسم میں یہاں کبھی ٹھہرنا نہ پڑا اور ابوالفضل کو بھی یہ عجوبہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔

مغلوں کے زمانہ میں کشمیر میں اشرفی چلتی تھی اور یہ ہندوستان کی اشرفی سے مختلف تھی۔ وزن میں اُس سے چار سرخ زیادہ۔ ماشہ چھ سرخ کا ہوتا ہے۔ دانگ بھی چھ سرخ کا۔ سونے کی اشرفی سولہ دانگ کی ہوتی تھی۔ تول سولہ ماشے کا ہوتا تھا۔ چاندی کا سکہ نو ماشے کے برابر ہوتا تھا۔ اور اسے روپیہ ساسُن کہتے تھے پیسہ تانبے کا ہوتا تھا ہُرا دام، جسے کُشر کہتے تھے۔

مغل دور تک بھی کشمیر میں سانپوں کو پوجنے کے آثار پائے جاتے تھے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق یہاں سات سو جگہوں پر سانپوں کی شکلیں پتھروں پر کندہ تھیں جنہیں لوگ پوجتے تھے اور جن

؎ اسے کشمیری میں "پُلہور" کہا جاتا ہے (ادارہ)

سے متعلق حیرت ناک کہانیاں کہی جاتی تھیں۔

کشمیر کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ابوالفضل کی تصانیف کافی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ اُن سے ہم کچھ زیادہ تفصیلات کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے کہ یہ زمانہ کشمیر میں مغلوں کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہاں ابھی مغل حکومت اپنے پاؤں ہی جما رہی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کہیں مقامات کے ناموں میں کچھ غلطیاں پائی جاتی ہیں تو وہ اُن ترجمہ کاروں اور منشیوں کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہیں جو ابوالفضل کو سنسکرت میں لکھا ہوا مواد فارسی کے قالب میں ڈال کر پیش کرتے تھے۔

* * *

قلم کار توجہ فرمائیں

- اپنی غیر مطبوعہ و غیر نشر شدہ تخلیقات کاغذ کے ایک طرف خوشخط لکھ کر بھیجئے۔
- شیرازہ میں شائع ہونے والی تخلیقات کا مناسب معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔

* * *

سنسار چند شرما

بسوہلی مصوری اور مغل

- ہر کلا وقت کی مہک ہے [1]
- تصویر ایک بے زبان (بے صدا) شاعری ہے اور بجائے خود شاعری مُنہ بولتی تصویر۔

• — ایک چینی مفکر

ہندوستان میں کئی قومیں پے در پے آتی رہیں اور ہند میں داخلے کے لئے اس سرزمین کی مغربی سرحد کو ہی چُنا مگر ان سب میں مغلوں کے نشان نہ صرف بہت گہرے بلکہ بہت خوبصورت بھی ہیں۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ہندوستان کے تمدن پر نہ صرف یہ کہ نمایاں چھاپ چھوڑی بلکہ اسے چار چاند لگائے، کیونکہ تاتاری قوم کلچر کی پرستار ہی نہیں، حُسن پرست بھی تھی اور اسے اپنی تہذیب پر ناز تھا۔ اسی لئے وہ باقی قوموں پر خود کو افضل سمجھکر ترجیح دیتے۔

بابرؔ باغوں، پھولوں اور آبشاروں کا دلدادہ تھا۔ اُسے شاعری سے لگاؤ تھا۔ ساتھ ہی وہ فنِ مُصوّری کا بھی شائق تھا۔ چنانچہ مذہبی پابندیوں کو کسی حد تک نظر انداز کر کے اُس نے تصویر کشی کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ اُس کے عہد کی بہت سی مصوّر فارسی کتب بطور یادگار ملتی ہیں۔ بابرؔ نے اپنی مہموں میں کامیابی حاصل کی مگر وہ

---

[1] لارنس بنجن (LAWRENCE BINJON)

کامیابی کے نشے میں فرغانہ کو نہ بھول پایا۔ فرغانہ۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اُس کی یاد اُسے بار بار ستاتی اور وہ اُسے بار بار یاد کرتا۔ وہاں کی آب و ہوا اُسے پسند تھی۔ وہ ہندوستان میں زیادہ دیر تک نہیں ٹکا۔ اس بات کا کریڈٹ ہمایوں کو جاتا ہے کہ اس نے ہند کو اپنا ملک سمجھا۔ شیر شاہ سوری سے شکست کھائی اور مارا مارا پھرا۔ شاہ ایران سے رخصت ہونے پر وطنیت جاگی اور دو مصوروں کو تحفتاً اس سے مانگا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد ہند آکر دوبارہ حکومت قائم کی اور مختصر سے عرصے میں اس کے دربار میں تقریباً پندرہ مصوّر محو کار تھے۔

شہنشاہ اکبر کا کیا کہنے۔ وہ تو ہر بات اور ہر پہلو سے دیکھا جائے تو عظیم تھا۔ اس نے اپنی سرحدوں کو ہی نہیں پھیلایا کیونکہ وہ بہادر تھا، جنگی حکمت عملی سے واقف تھا اور کامیابیاں اس کے پاؤں چومتی تھیں۔ اس کے منصوبے بھی عظیم تھے۔ اس نے اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں اور اسے تقویت بخشنے کے لئے ایسے اقدام کئے جو ایک صحیح الدماغ حکمران ہی کر سکتا ہے۔ تمام مذاہب کی قدر کی اور انہیں آغوش عاطفت بخشا اور ہند میں مذہبی رواداری اور سیکولرازم کی بنیاد رکھی۔ بطور حکمران وہ انسانی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھ کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا۔ یہ تو یونہی بات چل نکلی۔ ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

ایرانی قلم ہند میں آچکا تھا۔ اس کا اتّصال راجستھانی قلم سے ہوا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بیرونی اثرات بھی نمودار ہوئے تو انہیں لبیک کہا گیا۔ تقلید تک کو، اگر وہ بہتری کے لئے کی گئی، عیب نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح ایرانی قلم ایرانی نہیں رہا اور وہ مغل قلم کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس عہد میں فنون لطیفہ کو وسیع پیمانے پر سرپرستی ملی اور ماہرین فن کی تعداد سینکڑوں تک جا پہونچی تھی جو انفرادی خوبیوں کے مالک تھے۔ ایک ایک فن میں لاجواب تھا تو دوسرا کسی اور میں باکمال۔ غرض فن مصوّری ایک اچھا خاصا پراجیکٹ تھا۔ فارسی، سنسکرت اور تاریخی و مجلسی کتب حتیٰ کہ قصہ گوئی کو بھی باتصویر بنایا گیا۔ اس ضمن میں گیتا سین کی کتاب "یموز آف اکبرنامہ" میں کئی دلچسپ باتوں کا ذکر موجود ہے۔ تصاویر میں لکیروں (LINES) رنگوں کے نظام (COMPOSITION) رنگوں کی آرائش اور موزونیت، انسانی خطوط اور پیراہن و طریقۂ عمل وغیرہ میں کافی تبدیلی واقع ہوئی۔ کچھ تصاویر میں پانی کی حرکت اور شوریدہ سری کو کمال ڈھنگ سے دکھایا گیا ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ یہ عمل اس عہد کے بعد پھر کبھی بھی نہیں دیکھا گیا۔ پہاڑوں پر وزنی اور بھاری بھرکم توپوں کو چڑھانا دقتوں و مشکلوں پر فتح و نصرت

کے لئے ہمت و عزم کا پتہ دیتا ہے۔ اس ضمن میں جو جوش و ولولہ اور طاقت کا اظہار فن کار نے دکھایا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ دربار کی رونق، شکار کے مواقع اور شاہی دبدبے کی عکاسی میں فنکار نے جان ڈال دی۔

ہندوستان کی مصوری کی تاریخ میں شبیہہ کاری کی داغ بیل اکبر کے عہد میں ڈالی گئی۔ اس سے قبل صرف غیاث الدین کی شبیہہ کی شہادت ملتی ہے۔ اس دور میں امراء، وزراء، مصاحبوں، منصب داروں اور ممتاز ہستیوں نے شبیہہ کاری کو رواج دیا اور اس طرح اکبر کے یک رنگ ہندوستان کے منشاء کو تقویت بخشی۔ ضمناً عرض کردوں کہ یہ اکبر ہی تھا جس نے راجستھانی پگڑی کو رواج دیا جس کو آئندہ نسلیں بھی نہ چھوڑ سکیں اور ان میں اس کا چلن عام ہوگیا۔

جہانگیر نے تصویر کشی کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی بلکہ اسے منظم بھی کیا۔ بادشاہ کو مصوری سے لگاؤ تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی بھی فن پارے کی لکیروں سے ہی فنکار کا نام بتا سکتا ہے۔ اس کے عہد میں تصویر کشی کی تکمیل کے مدارج مقرر ہوئے۔ پہلے ڈرائنگ کی تشکیل، پھر رنگوں کی بھرائی و گھٹائی اور پھر تکمیل FINISHING ! سجاوٹ دابھار۔ جب کوئی تصویر مکمل ہو جاتی، اس کی پشت پر فنکار کا نام فارسی میں لکھا جاتا اور اس طرح تصویر بینام ہونے سے بچ جاتی اور فن کار کا تعارف بھی ہو جاتا۔ یورپ سے سفیروں اور سیّاحوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ بادشاہ ولایتی تصاویر اور یورپی تصویر کشی سے کما حقہ واقف ہوا۔ بھارتی فنکار سہ رخی تکنیک سے واقف ہوئے اور اس کی شہادت مغل قلم سے ملتی ہے۔ اس دوران باہر سے تحفوں میں ملی تصاویر سے ہندوستانی قلم کا موازنہ بھی ہوتا رہا۔ اب پھولوں، پودوں، پھلوں، جانوروں اور پرندوں کی تصاویر بنائی جانے لگیں۔ حاشیے تصاویر کو خوبصورتی اور نفاست بخشتے ہیں۔ تصاویر کو زیادہ پرکشش اور جاذب نظر بنانے کیلئے حاشیوں کو بھی پھولوں، پودوں اور جانوروں کی تصاویر سے مزین کیا جانے لگا اور اس طرح قلم میں اور زیادہ نفاست آگئی۔ لائن شیڈ (LINE SHADE -)، جو اکبر کے عہد سے چلی آرہی تھی، آگے گولائی کی طرف بڑھی جس سے سہ رخی تصویر کشی کا احساس ہونے لگا۔

بادشاہ کو ظلِ الٰہی کہا جاتا اور وہ اپنے ہر فرمان کی تعمیل اسی سپرٹ کے تحت چاہتا۔ بادشاہ کی شبیہہ کے گرداب روشنی کا ایک ہالہ بنایا جانے لگا جو کافی عرصہ تک رائج رہا۔ مغل جاہ و جلال کچھ کم ہوا۔ شاہ جہاں نے اگرچہ فنِ تعمیر میں زیادہ دلچسپی لی مگر پھر بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کے عہد میں دو مصوّر باہر سے یہاں لائے گئے۔

اورنگ زیب نے تمام فنون لطیفہ سے مُنہ موڑ لیا اور اُس کے بعد تو مغلوں کی حکومت سکڑتی گئی

اور بالآخر لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ حکمران عیش پرستی کی طرف راغب تھے۔ ہر سُو مایوسی کا عالم تھا۔ مغل قلم جس کا کبھی دور دورہ تھا، مفقود ہو رہا تھا۔ نادر شاہ کے ناگہانی حملے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو گئے اور پشیمانی اور دربدری فن کے ورثے میں بھی آئی۔ دارا، اورنگ زیب سے ڈرتا، چھپتا چھپاتا جان بحق ہوا۔ وہ ثقافت و تمدن سے واقف اور فن کاروں کا قدردان تھا اور اس حیثیت سے وہ تاج کا صحیح وارث تھا۔ خود اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا اعظم شاہ شاعری کا دلدادہ اور شعراء کا قدردان تھا۔ اُس نے ہندی شعراء کی مجلس بلائی، ست سئی کو ترتیب دیا گیا جس سے نائکا بھید کو CLASSIFY کرنے کی ضرورت درپیش آئی۔

رسک پریا (RASCK PRIYA) پر مینیچر (MINIATURE) تصاویر بنائی گئیں۔ جب فن کاروں کی مجلس برخاست ہوئی تو وہ یہاں وہاں سر چھپانے کو چلتے بنے۔ یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ کچھ فنکاروں نے شوالک کا رُخ کیا۔ سیو (SEV) پنڈت کے دو لڑکے تھے، نین سُکھ جموں میں وارد ہوا اور مانک بسوہلی کی طرف چلا گیا۔ جموں پر اُس وقت مہاراجہ رنجیت دیو کی حکومت تھی اور یہ پورے پنجاب میں محفوظ ترین جگہ تھی۔ باہر سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جموں آ رہے تھے۔ نین سُکھ رنجیت دیو کے بھائی بلونت دیو کے پاس آیا اور اُس کا خاص مصوّر بنا۔ اُس کے قلم سے راجہ کی بہت سی شبیہیں بنیں۔ مانک کے ہاتھ کا گیت گووند بنا۔ نین سُکھ کے جموں میں آنے سے جو وقت گذرا اُسے W.G ASCHER نے FREKANGRA قلم کہا ہے، مانک جیسے مانکو بھی کہا گیا، کے گیت گووند کے متعلق چند شبہات پیدا ہوئے۔ اس بارے میں ایک شخص نے لکھا ہے :

> "... گیت گووند میں مغل پھولوں کی مہک تو پائی جاتی ہے مگر درج ذیل باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ شکوک بھی پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ جو فن کار باہر سے آتے اُن کے لئے ضروری تھا کہ وہ پہلے خالص مغل قلم میں کام کرتے جیسا کہ اس محمد شاہ کے وقت مروج تھا۔

۲۔ شوالک آ کر اتنی جلدی وہ اپنا اسلوب کیوں چھوڑ بیٹھے اور اُنہیں درختوں اور مستورات کے چہروں کے خد و خال بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

۳۔ اپنے نام کو تصویر کی پشت پر دینے کی روایت بھی کیونکر جاتی رہی۔

۴۔ طریقۂ کار کو بدل دینا جلد بازی کا کام نہیں"۔

مانک کے گیت گووند اور مغل طرزِ مصوّری میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ تصویروں میں نفاست آئی ہے، ورنہ پھولوں کا حاشیہ اور SPANDRILL کی گھنی سجاوٹ وغیرہ مغل طرزِ مصوّری کی خصوصیات ہیں۔ عورتوں کے بال برندابن کی مستورات کی طرح پیچھے کو پڑے دکھائے گئے ہیں لیکن پہاڑی علاقوں میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا۔ شوالک میں عورتیں اپنے بالوں کو ماتھے پر سجاتی ہیں اور یہاں چولی اور گھاگرہ کا رواج پُرانے وقتوں سے رہا ہے۔

یہاں بسوہلی کی تاریخ کا ذکر بے جانہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ مغل قلم کے آنے سے قبل یہاں کے مختلف علاقوں میں راجستھانی قلم سے ملتا جلتا قلم رائج تھا۔ ان میں پونچھ سے لیکر مان کوٹ، عب گران، ہری پور، ندوون نور پور، شامگری، نالاگڑھ اور گڑھوال تک کے علاقے شامل تھے۔ اس بات کا ذکر ۱۹۱۸ء کی ایک رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ اس قلم میں رنگوں کے استعمال سے جاذبیت پیدا ہوئی ہے۔ تصویروں میں عورتوں کے چہروں پر کُشادہ ماتھے اور بڑی بڑی آنکھیں بسوہلی کے قلم کی منفرد خصوصیات ہیں۔ بسوہلی مصوری میں حاشیے سُرخ اور کہیں کہیں پیلے رنگ کے بھی پائے گئے ہیں جنہیں بیوپاری لوگ تبتی (TIBTI) کہا کرتے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قلم نیپالی قلم سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ قلم سادگی، صاف گوئی اور مضبوطی کی عکاسی کرتا ہے۔ ناٹکا بھید کی موجودگی انسانی جذبات کو اُبھارتی ہے۔ جو پیار اور بہار کا آئینہ ہے۔

بسوہلی کی راجدھانی پہلے بلاور تھی۔ یہاں کے راجہ اپنا شجرۂ نسب پانڈووں سے جوڑتے تھے۔ [illegible] نے رانا بلّو کو مغلوب کر کے بلاور کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ کچھ مدّت بعد بھوگ پال نے دریائے راوی کے کنارے اپنی نئی راجدھانی بنائی۔ اس ریاست کا پہلا حکمران کرشن پال تھا جس نے اکبر کے دربار میں تحفے تحائف پیش کر کے اُس کی اطاعت قبول کی۔ یہی وہ پال راجے تھے جنکے دورِ حکومت میں بسوہلی مصوری کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے بسوہلی پر حملہ کیا۔ بسوہلی کے راجہ کو شکست فاش ہوئی اور اس طرح یہ ریاست مہاراجہ گلاب سنگھ کے قبضے میں آگئی۔

بسوہلی قلم شوالک میں کب وجود میں آیا، یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ اس قلم کے

رنگوں کی آمیزش، بے ساختگی، اور عمل کا اختصار جیسی خوبیاں کئی اہم باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے نے ایسے لوگوں کو جنم دیا ہے جو بہادری میں یکتا، عمل میں بے دریغ، مغرور، اور فن کے دلدادہ تھے۔ بسوہلی قلم FOLK ART کا اگلا قدم ہے جس میں نفاست کم اور سادگی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بیس سال کے بعد مغل قلم کے آنے کے ساتھ ہی اسمیں مشرق کے اثرات وارد ہوئے۔ چنانچہ کانگڑہ مصوّری کا قلم سارے علاقہ پر حاوی ہو رہا تھا اور اسکی نفاست اور جاذبیت مقبولیت پاتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں بسوہلی مصوری کی مقبولیت کم ہونے لگی۔ البتہ رنگوں کے اختصار اور سادگی کے باوجود اس کی اپنی اور بھی خوبیاں تھیں مثلاً افق کی اونچائی، بادل جھالر کی طرح لٹکے ہوئے، درختوں میں اشاراتی عمل یعنی صرف دو تین پتوں سے درخت کا وجود پیدا کرنا، WEEPING WILLOW کا استعمال مستورات کا زیورات سے آراتہ ہونا، لہنگے کے اوپر باریک پیراہن، ماتھا کھلا، بڑی بڑی آنکھیں، لائن شیڈ سے چہروں میں گولائی کا احساس، سونے کے ساتھ چاندی کے اوراق کا استعمال وغیرہ۔ اس کے باوجود کانگڑہ قلم کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور بسوہلی قلم کی مقبولیت کم ہی سہی، لیکن متاثر ضرور ہوئی۔

ان حالات میں کانگڑہ میں باہر سے آئے ہوئے مُصوّروں کو اپنے نفسانی خیالوں کو تصویروں کی زبان دینے کا کھُلا میدان مل گیا کیونکہ اُن کے سامنے نانکا بھید کے علاوہ ولشنو سمپردرے کے شاعروں کی تخلیقات بھی تھیں۔ دوسری طرف مغل قلم کی نزاکت، نفاست اور رنگینی سے بھی کانگڑہ قلم کو پروان چڑھانے میں کافی مدد ملی اور اس کے نتیجے میں کئی بے جوڑ تصویریں ظہور میں آگئیں۔

یہاں پر یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ مغل طرز کی کچھ تصویریں نور پور قلم میں بھی ملتی ہیں۔ ڈوگرہ آرٹ گیلری میں نور جہاں کی نہایت سادہ ڈھنگ میں بنی دو تصویریں آویزاں ملتی ہیں۔ جہانگیر اور نور جہاں کچھ عرصہ نور پور میں بھی قیام پذیر رہے۔ چنانچہ اس جگہ کو یہ نام نور جہاں کی وجہ سے ہی ملا۔ جہانگیر کے نور پور کے راجہ سے خاص تعلقات تھے۔ نور پور کے راجہ کو جہانگیر کی مدد سے بسوہلی کے راجہ سے پُرانی دشمنی کا بدلہ لینے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ اُس نے بسوہلی کے راجہ کو قیدی بنا دیا۔ بارہ سال قید میں رہ کر وہ فرار ہوگیا لیکن نور پور کے راجہ نے اُسے دبوچ لیا اور قتل کروایا۔

بسوہلی قلم پر مغل قلم کے اثرات کا جائزہ لیتے وقت رس منجری کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو کسی دیوداس نے بسوہلی کے راجہ کرپال پال کو تحفے میں دی تھی۔ اس تخلیق میں ایک اُلٹا سیدھا ARCITECHTURAL ڈیزائن نظر آتا ہے۔ یہ ڈیزائن مغل قلم کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ اس میں بعض جگہوں پر کشمیری ڈیزائن بھی دیکھنے میں آتا ہے، لیکن تصویر میں بستر کی چادر میں حرکت اور SHADE کی موجودگی مغل قلم کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اسی طرح رس منجری میں سامنے کی دیوار کا ڈیزاین اور بستر پر بیٹھی خاتون کا لہنگا مغل طرز اور مغل شہزادیوں کی یاد دلاتے ہیں جبکہ چھتوں پر گنبد اور محراب اسلامی اثرات کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس سے قبل مغل قلم جموں میں آچکا تھا جب نین سکھ راجہ بلونت دیو کی زیر سرپرستی اپنے گاؤں جھیل سروہوین سر اور جموں میں اُسکی شبیہیں بناتا رہا۔ اسی دوران مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنی سلطنت کو لداخ تک پہنچا دیا تھا۔ لوگ خوش تھے اور ہر سو امن کا دور دورہ تھا۔ سلطنت جموں کا باقی پہاڑی راجاؤں سے بھی میل جول اور ربط بڑھتا گیا اور ان کے درمیان آپسمیں رشتے ناطے بھی ہونے لگے۔ جموں شمالی ہند کی ایک مضبوط اور شہرۂ آفاق سلطنت بن گیا۔ آپس کے تعلقات سے گردونواح کے فنکار جموں آگئے اور فنِ مصوّری کو اور زیادہ فروغ حاصل ہونے لگا۔ کانگڑہ اور دیگر علاقوں کی بہت سی تصویریں، جن میں فنِ مصوری کے کئی اہم شاہکار بھی شامل تھے، جموّں میں آگئے کیونکہ ان علاقوں سے آئے ہوئے کئی فنکار جموّں آکر مستقل طور پر یہیں کے ہو گئے۔ اسیطرح مہاراجہ رنبیر سنگھ اور پرتاپ سنگھ کے عہد میں بھی کئی فنکار یہیں آکر بس گئے۔ جموّں میں جو محلات اس دوان تعمیر ہوئے اُن میں کشمیر کے کاریگروں نے بھی اپنے فن کا کمال دکھایا۔ محلاّت میں پھول پتوّں کی سجاوٹ کا کام کشمیری کاریگروں نے ہی انجام دیا۔ ان تمام تخلیقات میں مغل قلم کا اثر نمایاں ہے۔

بلدیو پرشاد شرما

مُغلیہ دور میں جموّں

دہلی میں مُغلیہ سلطنت قائم ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ہی ریاست جموّں کے سیاسی تعلقات دہلی کے ساتھ قائم ہو چکے تھے۔

تاریخ ڈوگرہ دیس میں طبقات اکبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دہلی کے بادشاہ مبارک شاہ نے راجہ ہمیر دیو فرزند راجہ مال دیو کو بائیس راجگانِ پہاڑ کا سرتاج تسلیم کیا اور ایک تانبے کا پٹہ دیا۔ اس پٹہ میں درج ہے کہ راجہ ہمیر دیو کانگڑہ، جسواں۔ داتار پور۔ بھنگال، گلیر، سیبہ، پٹھان کوٹ، منڈی، سکست، کلو، بھوتی، چینہنی، بندراتہ، کشتواڑ اور بھڈو کا سرتاج ہے۔ اور دریائے راوی کے آر اور پار تمام راج اس کے مطیع اور باجگذار ہیں۔ طبقاتِ اکبری میں لکھا ہے کہ جب راجہ ہمیر دیو جموں سے دہلی دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ مبارک شاہ نے بائیس راجگان پہاڑ کا سرتاج بنا کر بھیم دیو کے نام سے موسوم ہونے کی سند عطا کی اور اُسے خلعت دے کر ایک باغی سردار رسمی شیخا کھوکھر کی سرکوبی کے لئے مامور کیا۔ جس (بھیم دیو) نے شیخا کھوکھر کو شکست دی[1]

---

[1] تاریخ ڈوگرہ دیس از نرسنگداس نرگس صفحہ ۶۷

۱۵۲۶ء میں جب بادشاہ بابر نے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی تو اس زمانہ میں جموں کا حکمران گوگھڑ دیو تھا۔ جس نے سلطنت مغلیہ کی اطاعت قبول کر لی اور بذات خود بادشاہ کے حضور نذرانہ پیش کرنے دہلی چلا گیا۔

گوگھڑ دیو کے بعد اس کا بیٹا کپور دیو اس کی گدی پر بیٹھا۔ کپور دیو کے دو بیٹے جگدیو اور سمیل دیو ہم عمر تھے۔ ان کی پیدائش دو مختلف رانیوں کے بطن سے ایک ہی دن ہوئی تھی۔ کپور دیو نے اپنی زندگی میں ہی جموں کی ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کر کے جموں اور باہو کے نام سے دو ریاستیں قائم کر دیں اور جموں کا راج سمیل دیو کو دے دیا اور جگدیو کو باہو کا راجہ مقرر کیا۔ یہ واقعہ ۱۵۷۰ء کا بیان کیا جاتا ہے[۱]۔

اکبر نامہ کے حوالے سے "تاریخ ڈوگرہ دیس" میں لکھا ہے کہ راجہ کپور دیو کا ذکر اکبر نامہ میں کئی بار آتا ہے۔ بادشاہ اکبر کے دوسرے سال ۱۵۵۷ء میں راجہ کپور دیو دہلی دربار میں حاضر ہوا لیکن وہاں سے واپسی پر مغلیہ سرداری قبول کرنے سے منکر ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ اکبر کے آٹھویں سال میں کپور دیو نے بادشاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ آخر صلح ہو گئی۔ مگر ۱۵۹۹ء میں کپور دیو پھر منحرف ہو گیا۔ اکبر نے مرزا قاسم و آصف خان کو فتح کوہستان کانگڑہ و جموں پر مامور کیا تو پہاڑی راجگان نے مل کر مقابلہ کیا، مگر شاہی فوج نے رام گڑھ، جسروٹہ، جموں، منکوٹ، اکھنور وغیرہ کو مطیع کر لیا[۲]۔

اس کے بعد ہمیں بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ہی راجہ جگدیو کے بیٹے پرسرام دیو کا ذکر ملتا ہے جس نے دربار شاہی میں شکایت کی کہ وہ جموں کی گدی کا اصلی وارث ہے۔ جبکہ اس پر راجہ سمیل دیو نے قبضہ کر رکھا ہے۔ بادشاہ نے سمیل دیو کو بھی دہلی طلب کیا۔ طرفین کے دعویٰ سننے کے بعد بادشاہ نے جموں کی ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ باہو کی ریاست راجہ پرسرام دیو کو دے دی اور جموں کی ریاست راجہ سمیل دیو کو ملی۔

آئینِ اکبری کے مطابق بادشاہ اکبر کے پینتیسویں سال میں کئی پہاڑی راجوں نے بغاوت کر دی۔ ان میں راجہ پرسرام دیو بھی شامل تھا۔ بادشاہ نے ضیا خان کو حکم دیا کہ وہ ان پہاڑی زمینداروں

---

[۱] جموں راج (انگریزی) مصنف: ایس، ایس، چارک صفحہ ۸۲۔ [۲] تاریخ ڈوگرہ دیس۔

کو مطیع کرے۔ ان راجواڑوں نے ضیا خان کے سامنے ہتھیار ڈال دئے اور اُس کے ہمراہ دہلی دربار میں حاضر ہوئے۔[1]

اس کے بعد توزک جہانگیری میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ باہو کے راجہ پرسرام دیو کی رضامندی سے پرگنات جموں، رام گڈھ، جبروٹہ، منکوٹ اور اکھنور ایک مُغل فوجدار کے زیر نگین رکھے گئے۔ پہلا مُغل فوجدار راجہ مان سنگھ جاگیردار سیالکوٹ تھا۔[2]

توزک جہانگیری کے مطابق راجہ پرسرام دیو کو جموں اور باہو کا راجہ تسلیم کیا گیا۔ راجہ سنگرام دیو بادشاہ جہانگیر کے ہمراہ دکن کی مہم پر چلا گیا اور ۱۶۲۹ء میں بادشاہ نے جموں کی حکومت اُسکے حوالہ کر دی۔

۱۶۲۰ء میں راجہ سنگرام دیو کو حکم ملا کہ وہ کشتواڑ کے سرکش زمیندار کی سرکوبی کرنے میں دلاور خان کی مدد کرے۔ اس لڑائی میں کشتواڑ کا راجہ بھوپ دیو مارا گیا اور کشتواڑ پر بادشاہ جہانگیر نے قبضہ کر لیا۔ اس خدمت کے صلہ میں بادشاہ جہانگیر نے راجہ سنگرام دیو کو "ڈیڑھ ہزاری" کے لقب سے نوازا۔

۱۶۲۱ء میں مُغل حاکم قاسم خان نے کانگڑہ پر حملہ کیا تو اُس وقت بھی سنگرام دیو نے فوجی مدد بہم پہونچائی جسکے صلہ میں بادشاہ نے سنگرام دیو کو "سہ ہزاری" کے لقب سے نوازا۔

توزک جہانگیری میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ راجہ سنگرام دیو کو شہزادہ خُرم کے ساتھ دکن کی مُہم پر مامور کیا گیا تھا جہاں اُس نے وفات پائی۔ بادشاہ اورنگ زیب کی حکومت کے پہلے سال میں راجہ ہری دیو جموں کی گدی پر بیٹھا۔ بادشاہ نے خلیل اللہ خان کو جموں کا فوجدار مقرر کیا جس نے اپنا فوجی کیمپ زیریں پورانی منڈی قائم کیا جسکو "اُردو بازار" کا نام دیا گیا۔

کچھ برس بعد راجہ ہری دیو بادشاہ کی خدمت میں خود ہی نذرانہ پیش کرنے دہلی گیا اور وہاں سے

---

[1] آئینِ اکبری (انگریزی ترجمہ) صفحہ ۳۶۹

[2] توزک جہانگیری صفحہ ۲۲۷

بادشاہ اورنگ زیب کے ہمراہ دکن کی مُہم پر چلا گیا جہاں وہ ۱۶۹۲ء میں فوت ہو گیا۔ بادشاہ نے گجے سنگھ کو جموں کا راجہ تسلیم کیا۔ گجے سنگھ کے بعد اُس کا بیٹا دھرو دیو گدی نشین ہوا۔ ۱۷۰۷ء میں بادشاہ اورنگ زیب فوت ہو گیا اور بہادر شاہ نے کابل سے واپسی پر لاہور کے مقام پر اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ جموں کا مُغل فوجدار شہباز خان بادشاہ کو سلام کرنے لاہور چلا گیا۔ اُسکی غیر حاضری کا فائدہ اُٹھا کر راجہ دھرو دیو نے جموں سے باقی مُغل حاکموں کو بھی نکال دیا اور جموں کو سلطنت مُغلیہ کے اقتدار سے آزاد کرنے کا اعلان کر دیا۔

راجہ رنجیت دیو (۱۷۳۳ء - ۱۷۸۲ء) بادشاہ شاہ عالم دوئم کا ہمعصر تھا۔ اُس کے زمانہ میں بھی ہمیں پھر سلطنت مُغلیہ کے ساتھ جموں کے سیاسی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

جموں کے سرکاری محافظ خانہ میں شاہ عالم کا ایک فرمان موجود ہے جس پر محرم ۱۱۸۸ ہجری کی تاریخ درج ہے۔ اس فرمان کی رو سے بادشاہ نے رنجیت دیو کو جموں کا راجہ تسلیم کیا۔[1]

سری پرتاپ سنگھ میوزیم سری نگر میں راجہ رنجیت دیو کے زمانہ میں جموں ٹکسال میں ڈھالے گئے چاندی کے سکے موجود ہیں جن کے ایک طرف "سکہ شاہ عالم بادشاہ غازی" اور دوسری طرف "ضرب دارالامان جموں، سنہ جلوس میمنت مانوس ۲۴" کے الفاظ کندہ ہیں۔

○

---

[1] جموں راج (انگریزی) مصنفہ ایس۔ ایس۔ چارک صفحہ ۱۲۲

رشید نازکی

مُغل دور کی فارسی شاعری میں کشمیر کا تذکرہ

مُغل اعظم اکبر بادشاہ کی فوجوں نے اگرچہ کشمیر کو ۱۵۸۶ء میں ہی فتح کیا تھا اور کشمیر کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ کو اسیرِ قفس بنالیا تھا، لیکن اس کے باوجود یوسف شاہ کے فرزند یعقوب شاہ نے مسلسل تین سال تک مغل فوجوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ آخر کار ۱۵۸۹ء میں شکست کھا کر کشتواڑ کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کے فوراً بعد مغلوں نے وادی میں مکمل امن قائم کیا اور اسی سال کے ماہِ مئی میں شہنشاہ اکبر گلگشت کشمیر کے لئے روانہ ہوا۔ اکبر کی روانگی سے قبل اُس کے چیف انجینیر محمد قاسم نے جب مُغل روڈ کو مضبوط و مُستحکم بنالیا، اور اسے قافلۂ شاہی کے سفر کے لئے استوار کیا تو اکبر کا درباری شاعر فیضی پکار اٹھا ؎

بحکم خُسرو والا ز تیشۂ کوہ کنان
ہزار جوئے رواں کرد صاف تر از شیر
چناں بکوہ و کمر خارہ را تراشیدند
کہ بہر کوکبِ شاہی سزد زُمرّد مُسیر
زمینِ عرصۂ کشمیر آسمان بگذشت
بفرِ دولتِ تقبیلِ پائے ہائے سریر

یہ اشعار دراصل فیضی کے اُسی معرکتہ الآرا قصیدے میں شامل ہیں جو اُس نے مغلِ اعظم اکبر کی خدمت میں کشمیر کے گلگشت کے دوران پہلا دربار آراستہ کرنے پر پیش کیا تھا۔ اس قصیدے میں ایک سو ایک اشعار تھے جن میں ایک طرف سے مغلوں کی ظفریابی کے طنطنہ کی گونج سنا کر دیتی ہے تو دوسری طرف سے کشمیر کے حسن پامال

کی خوبصورتی سے اُن کے تحیّر اور حیرت زا انبساط کا اندازہ ہوتا ہے۔ قصیدے کے چند منتخب اشعار کی کیفیت کچھ یوں ہے۔

ہزار قافلۂ شوق می کُند شب گیر — کہ بارِ عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارکَ اللہ ازاں عرصہ کہ دیدنِ او — ورق نگارِ خیال است نقشبند ضمیر
ہوائے او متنوع چو فکرتِ نقاش — زمین او متلون چو صفحۂ تصویر
غبارِ او بتواں خواند چشم را دارد — گیاہ او بتوان گفت روح را اکسیر
بہ تن موافقت آب او چوابرہ و گل — بہ جان مناسبتِ بادِ او چو شکر و شیر
بہ پیش فیضِ نسیمش دمِ مسیح مسموم — بہ نزدِ آب روانش زُلالِ خضر غدیر

اور پھر مغل اعظم کے خطۂ مینو نظیر کو فتح کرنے کی بات چلتی ہے تو طلسم ہوشربا اور حضرت سلیمانؑ کی دیو پری اور باد و باران پر حکمرانی کا نظارہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

دیارِ دلکش کشمیر را مسخر کرد — بدان صفت کہ سلیمان پری کُند تسخیر

اس شعر میں اکبر کو سلیمان اور سرزمین کشمیر کو سیماب صفت پری سے تشبیہ دی گئی ہے۔ غالب نے اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے اُس کے پھولوں کو نواسنج اور اُس کی نرگس شہلا کو تماشے میں مصروف بتاتے ہوئے کور چشمی سے نکال کر تابِ نظارہ اور لذت نگاہ سے بہرہ ور کیا ہے۔ غالب کے ہاں فرد کا یہ تصور بہر حال اُس کے افق تا افق وسیع مشاہدے اور تخیلُ کے باوصف محض شاعرانہ ادّعارہ پاتا ہے۔ لیکن جب مُغل جلال کی جمال پسندیوں نے رعنائی کشمیر کا پہلی بار ملاحظہ کیا ہو گا تو بن کہے لفظوں اور بن بتائے افسانوں میں اُن کی خوبصورتیوں سے شرابور روح پکار اُٹھی ہو گی ؎

گُلت را نوا زگست را تماشا — تو داری بہارے کہ عالم ندارد

فیضی اکبر کے فتحِ کشمیر کی حسن تحلیل کچھ اس طرح کرتا ہے کہ مغل جلالت کی طلبِ کشمیر کی دھڑکنیں صاف دکھائی دے رہی ہے۔

چو داد ایزدش آن ملک خواست تا گردد — در آن زمین سعادت بسجدۂ شکر پذیر

اِس کے بعد فیضی کا قصیدہ تاریخ ماہ وسالِ فتحیابی کی نذر ہو جاتا ہے۔

بسالِ سی وچہاردہ اواسطِ خُرداد   زِ ابتدائی جلوس خدیوِ عالمگیر
زُنہ صد دو ہفت دو ماہِ رجب   کہ یافت کوکبِ اقبال او چُنی تیسیر

اور پھر گریز کرتا ہوا سخن گسترانہ بات یوں کہے دیتا ہے۔ جیسے بلبل پھولوں کے چٹکنے وقت اپنی لحن کو اور تیز کرتا ہے۔

سخن شناسا منِ فیضی ام ثنا گویت   کہ بر بیاضِ سخن بدحشت کنم تحریر
اگرچہ ہند نژادم ولے بہ اقبالت   مرا زِ دانش یونیاں بے دست خیر
دگر سخن بدعاے تو ختم خواہد کرد   چنانکہ نظم شود مُتعکلم بہ حرفِ اخیر

اس سفر میں فارسی کا مشہور شاعر عرفی بھی اکبر کے ہمرکاب تھا۔ چنانچہ اُس نے بھی ایک قصیدہ لکھ دیا جس کی تشبیب کے پہلے دو شعر بہت مشہور ہو گئے ہیں۔

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر در آید   گر مُرغ کباب است کہ باپال و پر آید
بنگر کہ زفیضش چہ شود گوھرِ یکتا   جائیکہ خزف گر رود آنجا گہُر آید

عرفی کے قصیدے کے دو ایک شعر کشمیر کی زیبا شناسی اور آب ہوائے کشمیر کی خوشگواری کا شاعرانہ اظہار ہیں۔ جن میں وہی تحیُّر زائی ہے۔ جو حسن کشمیر کا خاصہ ہے ؎

ایں سبزہ وایں چشمۂ وایں لالہ وایں گُل
آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید
آں چشمہ کہ رضواں چو رود بسویش
کوثر لبرش تیز تر و تشنہ تر آید

منشی غلام حسن طباطبائی نے اپنی کتاب سیر المتاخرین میں اکبر کے ۳۴ سنہ جلوس میں کشمیر کے سیر موقعے پہ چند اشعار تحریر کرتا ہے۔

چہ کشمیر انتخاب ہفت کشور   قسم خوردہ بجاکش آبِ کوثر
نظر چنداں کہ بر دستش گماری   بجُز آبِ زمرّد نیست جاری

دریں گلشن زِ جوش خندۂ گُل   نمی آید بگوشں آوازِ بُلبُل

یہی وجہ تھی، کہ جلالت اکبری حسنِ کشمیر کی جمال پسندیوں میں کسی فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتی تھی۔ کشمیریوں کے بارے میں اُسکا کیا خیال ہے۔ یہ بات ہم موّرخوں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ تاریخ کی چچوڑی ہڈیوں میں عصریت کا رس ڈھونڈھتے ہیں لیکن اکبر کشمیر کی رعنائیوں کا کس قدر نیاز مندانہ طور پر قائل تھا اس کا اندازہ اِس امر سے ہوتا ہے کہ جب وہ پہلی بار کشمیر آیا تو اُس نے اپنی فوجیں شادی پورہ میں فرد کش کیں اور خود باغِ حسن شاہ میں مقیم ہوا۔ اور اسی دوران اپنے گورنر سید یوسف خان رضوی مشہدی کو حکم دیا کہ وہ ناگر نگر کی تعمیر کرے۔ اگرچہ یہ تعمیر مکمل طور پر جہانگیر کے وقت میں مکمل ہوئی لیکن اکبر نے اپنی فوجوں کو اندرون فصیل رہنے کا حکم دیا تھا۔ اور خود اپنے لئے بھی ایک بارہ دری تعمیر کروائی تھی۔ تاکہ فوج اور عوام میں کسی طرح کا اختلاط فتنہ و فساد کی وجہ نہ بن پائے۔ اکبر کشمیر کی تقدس مآب شادابیوں سے کچھ اِس قدر متاثر ہوا تھا کہ اپنی والدہ حمیدہ بانو کو ایک شعر اس التجا کے ساتھ لکھ بھیجا تھا کہ وہ بھی کشمیر کی خوبصورتیوں کو دیکھنے تشریف لے آئیں۔ شعر مجھے یاد نہیں۔ البتہ اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ "لوگ کعبے کی زیارت کے لئے لمبے سفر طے کرتے ہیں۔ کیا میں اُمید کروں گا کہ خود کعبہ میری طرف آجائے" کہتے ہیں کہ اِس شعر کی سماعت پر حمیدہ بانو رختِ سفر باندھ کر کشمیر کی طرف روانہ ہوئی۔ اور اپنے بیٹے سے آملی۔ اور یہیں سرینگر میں اکبر نے جمال الدین انجو سے فارسی فرنگ لکھنے کی ہدایت کی جو ۱۰۱۷ھ میں بعہدِ جہانگیری مکمل ہوئی اور اس کا نام فرہنگِ جہانگیری پڑا۔

اکبر کے عہد ہی سے کشمیر میں فارسی شعرا کی باقاعدہ آمد شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بھی عہدِ بڈشاہی اور دوسرے شاہانِ شہمیر کے وقت میں کچھ شعرا کا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن مُغلیہ عہد میں جس شاعر کا ذکر سب سے پہلا ہے وہ بابا طالب اصفہانی ہے جو چکوں کے زمانے میں کشمیر آیا ہے۔ لیکن عہدِ اکبری تک نواسنج ریاضِ کشمیر رہا ہے۔ حسن اس کے متعلق لکھتا ہے۔ "در زمانِ چکاں بکشمیر آمدہ باحکام انجا تقرب حاصل نمود ...... تا عہدِ اکبر شہ چمن پیرائے باغِ سخن سنجی نمود مگر نہ تو حسن اور نہ کسی اور تذکرے میں طالب اصفہانی کا کوئی ایسا شعر ملتا ہے جس میں کشمیر کے تعلق سے کوئی مضمون ملتا ہو۔

اسی طرح مرزا علی خان کے بارے میں حسن لکھتا ہے "شاعرِ بے نظیر وصاف تقریر بود در سنہ ۹۹ھ در واقعۂ شب خونی یعقوب خان کہ بر فوج بھگوانداس کردہ بود بقتل رسید۔ عبارت سے لگتا ہے کہ یہ صاحبِ سیف و قلم شاعر بھگونداس کے ساتھ کشمیر آگیا تھا یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرزا یعقوب خان کا ساتھی ہو۔ کیونکہ حسن کی تحریر میں یک گونہ ابہام ہے۔

شاہ ابوالفتح کے متعلق حسن البتہ واشگاف طور پر بیان کرتا ہے:

از علماء ایران صاحبِ طبع و خوش بیان بود۔ از ولایت بہ دکھن آمدہ در مصاحبتِ اکبر شاہ تقرب حاصل نمود و در سنہ ۹۵۵ ہجری با اردوے پادشاہ آمدہ درین جا توقف نمود عاقبت بہ تپ لحرقہ مبتلا گشتہ از جہاں درگذشت و در مزار شاعران متصل پلِ در گجن بالائے بلندی آسودہ ۔ اہلِ شیعہ قبر او را مطاف و مرجعِ خود کردند و در مدحِ میر ابوالفتح ممدوح مُلّا عرفی قصیدۂ غرا گفتہ است این شعر ازوست۔

میر ابوالفتح آنکہ لوحِ دانشش بر سرِ الہام و اذہاں دیگر است

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ خود اِس کی موت پر بہت ملول ہوئے۔ اور فیضی نے اس کا زبردست مرثیہ بھی لکھا۔

عہدِ جہانگیری میں ہمیں جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر اور اُس کے بتِ طناز نورجہان نے کشمیر کی رخشندہ و درخشندہ فضاؤں کو اپنی فسانوی محبت کے نگار خانے سے سجا کر تازہ داستانوں کو جنم دیا۔ وہاں یہ بہت عجیب بات ہے کہ اس شاہسوار داستان کو کسی بھی فارسی شاعر نے جہانگیر کے دور میں رقم نہیں کیا۔ اِس سلسلے میں میری حقیر رائے یہ ہے کہ شاید شاہ اور شاہ بانو کی خلوت گاہوں اور شبستانوں کا تذکرہ خلافِ ادب سمجھا جارہا تھا۔ ورنہ جہانگیر اور نورجہاں کے عشق و محبت کی داستان کی شراب خم کشمیر میں پیمانہ گداز تھی۔ اور غزل تو غزل اسیر نہ معلوم کتنی مثنویاں رقم ہو سکتی تھیں۔ حالانکہ جہانگیر کی کشمیر پرستی ضرب المثل ہے۔ وہ آٹھ بار کشمیر آیا ہے۔ اور چھ بار تو شمع شبستانِ حرم نورجہاں گلگشت کشمیر میں اُس کے ہمراہ تھی۔ چنانچہ اُس کی موت کشمیر سے مراجعت پر بمقام راجوری واقع ہوئی تھی، جو خود ایک دلگداز واقعے کا نتیجہ تھی کہ ایک جنگلی ہرن

کے تعاقب میں ایک خوبرو نوجوان پہاڑ سے لڑھک گیا۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے جہانگیر کے قدموں پر اپنی جان دیدی۔ اس سے بادشاہ کا مزاج کچھ اس قدر برہم ہو گیا کہ فقط چند ثانیوں میں اُس کی موت بھی واقع ہوئی۔ چنانچہ بقول کسی نامعلوم فارسی شاعر کے ؎

از شاہِ جہانگیر دمِ نزع چو پُرسند[؎]　　　باحسرتِ دل گُفت کہ کشمیر دگر ہیچ

فارسی شعراء کے بجائے تھامس مور نے لالہ رُخ مثنوی میں جہانگیر اور نور جہان کے گلگشت ارم کا تذکرہ کچھ ایسے الفاظ میں کیا ہے کہ باوصف ایک اوسط درجے کا شاعر ہونے کے تھامس مور کی یہ نظم انگریزی شاعری کی شہکار نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ موقعہ نہیں کہ اس طویل نظم کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ البتہ ابتدائی اشعار کچھ اس طرح اُس رومانوی کیفیت کے غماز ہیں جس سے شاعر نے کشمیر کی گل اندام اور نکہت پیرہن فضاؤں کا تانا نانا بُن لیا ہے۔ اور جہانگیر اور نور جہاں کو اِس گلستان صد رنگ کی قوس قزح بنالیا ہے جو شاداب فضاؤں پر ہوتی ہے۔

Oh ! best of delights as it everywhere is
To be near the loved one what a rapture is,
Who in moonlight and music thus sweetly may glide
O'er the lake of Cashmere with that one by his side!

If women can make the worst wilderness dear,
Think, think what a Heaven she must make of Cashmere

So felt the magnificent son of Ackbar,
Wherefrom Power and pomp and the trophies of war,
He flew to the valley, forgetting them all,
With the light of the Haram, his young Nourmahal,
When free and uncrowne'd as the conquerer roved,
By the bank of that lake, with his only beloved,

He saw, in the wreath she would play fully snatch
From the hedges, a glory his crown could not match,
And preferred in his heart the least ringlet that curl'd

[؎] پُرسند کی جگہ جُستند بھی لِکھا ہے۔ (ادارہ)

Down her exquisite neck, to the throne of the world
There's the beauty for ever unchangingly bright
Like a long sunny lapse of a summer day's light,
Shining on, shining on, by no shadow made tender,
Till love falls asleep in the sameness of splendour

ایک ڈچ پروٹسٹنٹ فرانسکو جہانگیر کے گُلگشتِ کشمیر کو فقط دادِ عیش نہیں جانتا، بلکہ اسے بادشاہ کی زندگی کی ضمانت جانتا ہے۔ اس لئے کہ مسلول بادشاہ کی زندگی کا راز کشمیر کی نزہت گاہوں سے پابستہ رہنا تھا۔ حالانکہ اُس کے امیر، وزیر بادشاہ کی اس شاہانہ عیش پسندی کو زحمت سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے،

> "The reason of the Kings special preference for this country is that when the heat in India increases, his body like a furnace, owing to his consumption of excessively strong drinks and opium, excesses which were still greater in youth. He usually leaves Lahore in March and April and reaches Kashmir in May. The journey is very difficult and dangerous, besides being expensive, for pack animals cannot cross the mountains, and practically everything must be carried on men's heads. All the nobles curse the place, for it makes the rich poor and the poor cannot fill their stomachs there, because everything is excessively dear, but apparently the King prefers his own comfort or pleasure to the welfare of his people".

گویا کشمیر آنا جہانگیر کے لئے مقتضائے حیات سے کچھ کم نہ تھا اور وہ اپنی روح کے سلگتے الاؤ سے کشمیر کے شجرہائے سایہ دار میں کچھ دیر سستا لینے کے لئے ہی نہیں، بلکہ جسم و جان کا تعلق قائم رکھنے کے لئے وارد کشمیر ہوتا تھا۔ شجرہائے سایہ دار کی بات چلی، تو اُن مورخوں کی یاد آئی جنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ جہانگیر پہلی بار چنار

کو کشمیر لے آیا۔ یہ دعویٰ تضحیک کی حد تک محلِ نظر ہے، اس لئے کہ کشمیری زبان کا لفظ "بُوٗنی" جہانگیر سے بہت پہلے کشمیری زبان میں موجود تھا۔ چنانچہ شمس العارفین حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کے کلام میں یہ لفظ کئی بار آیا ہے ؎

کینژن رُنٛ چھے شہج بُوٗنی ۔ ایسے بھی لوگ ہیں کہ جن کی بیویاں سایہ دار چنار کی مانند ہیں ۔

جی، ایم ڈی صوفی نے "کشیر" کی جلد اوّل میں اس بات پر کافی روشنی ڈالی ہے کہ کشمیر میں جہانگیر کے وقت میں بھی بہت بوڑھے چنار ملتے تھے۔ اس لئے کہ خود جہانگیر نے اس کا اعتراف کیا ہے صوفی نے چنار کی تاریخ پر بھی بات کی ہے اور غیر شعوری طور پر اس کے کشمیری نام کو کلاسیکی فارسی سے ملا دیا ہے۔ اُس کے الفاظ یوں ہیں:

> "Shamsul Ulama, Sir Jivanji Jamshedji Modi traces the plame tree to Iran. He finds its mention in the Pehelvi "Bundehesh", gives an account of the creation as told in Zend Avesta. The commentry on one of the twenty books of the Zend-Avesta. Heredotous refers to the plame tree as being held in Estimation by the Achemenian Kings like Zerxes and Darius, the father of Zerxes. Later Persians call the plame tree Darakhtifazal or the tree of grace. Tehran by some is called the city of plame trees and hence Long Fellows lines :
>
> Bright with the sheen of dew each glittering tree of the forest flashed like the plame tree the persian adorned with mantals and jewels.

صوفی نے اس درخت کی تاریخ پر خاصی روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کی بزرگی کی وجہ سے لوگوں نے اس کے متعلق ایک مقدس نظریہ قائم کیا تھا۔ یورپ میں تو اس درخت کو شراب سے سینچا جاتا تھا اور کئی ملکوں میں اس کے سائے میں بیٹھنے یا چہل قدمی کرنے کے لئے ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ اور بڑے بڑے بادشاہ اس کے تنوں میں عظیم الشان جشن مناتے تھے۔ جہانگیر کے متعلق صوفی نے ہی لکھا ہے کہ "جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ ایک بار بادشاہ دس سواروں اور چار خواجہ سراؤں کی معیت میں کہیں جا رہا تھا کہ سخت بارش شروع

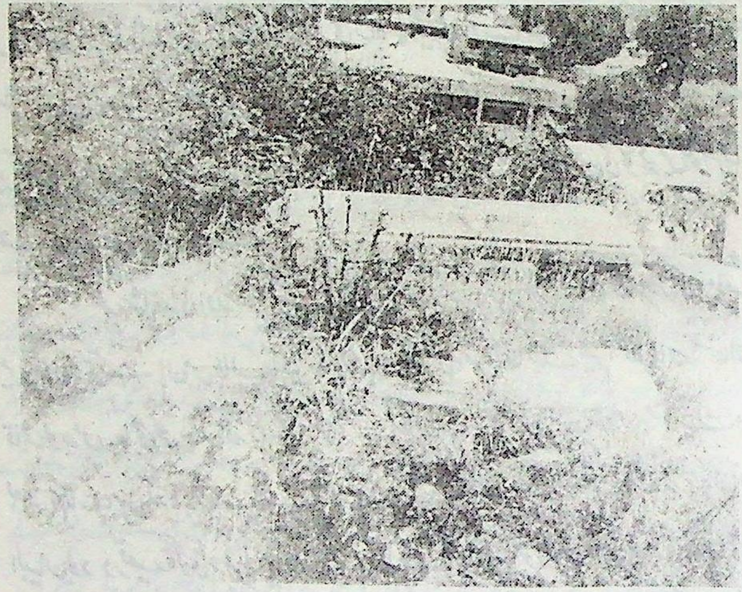

مزار شعراء در گجن سرینگر

جو سلیمان ٹینگ (کوہ سلیمان) کے دامن میں شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵ء — ۱۵۸۶ء) کے دور کی یادگار ہے، کہا جاتا ہے کہ شعراء نے یہ جگہ اپنی آخری آرامگاہ کے لئے اپنے دلکش محل وقوع کے سبب منتخب کی تھی۔ یہاں پر شاہ ابوالفتح: حاجی محمد جان قدسی، طغرائے مشہدی، قاضی ابوالقاسم، محمد قلی سلیم اور مرزا ابوطالب کلیم جیسے معروف شعراء دفن ہیں۔

ہوئی۔ ساتھ ہی ایک بوڑھا چنار تھا جس کے تنے کی کوکھ میں بادشاہ اور ہمراہ لوگ سوار ہوکر ہی داخل ہوئے۔ اور جب تک بارش تھم گئی وہیں قیام کیا"۔ صوفی کے اِس بیان سے دو باتیں صاف ظاہر ہیں۔ اوّل یہ کہ "بُوئی"، لفظ دراصل ژند اوستا کے لفظ "بوندی شاہ" کا کشمیری رُوپ ہے یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ درخت کشمیر سے اپنا نام لیکر ایران گیا ہو۔ اور وہاں اس کا نام بُندی شاہ پڑگیا ہو۔ دوّم یہ کہ جہانگیر کے وقت میں کشمیر میں ایسے چناروں کی کمی نہیں تھی جو سینکڑوں سال پرانے تھے۔ اور جن کی کوکھ میں عوام کیا خواص بھی ضرورت پڑنے پر پناہ لیتے تھے۔

عہدِ شاہجہانی اور عصرِ عالمگیری میں ہمیں پھر عہدِ اکبری ہی کی طرح ایرانی شاعروں کی زمزمہ سنجی وادی میں سُنائی دیتی ہے۔ اِن میں طالب آملو، حاجی محمد جان قدسی، مرزا طالبائے کلیم، ظفر خان احسن اور آصف خان قابلِ توجہ ہیں۔ حاجی محمد جان قدسی کے متعلق حسن رقمطراز ہے۔ "وطنش مشہدِ مقدس رضویست و مجبتِ العزام بعض مہمات بہند آمدہ باریابِ صُحبتِ شاہ جہاں گشت و ملک الشعراؑ واقف شُد۔ تیز زبان و فصیح البیان بود در قصیدہ گوئی و غزل پردازی گوی بلاغت از اقران خود ربود۔ ظفر نامۂ شاہ جہانی را الفصاحت و بلاغت تمام اداکردہ۔ مثنوی در تعریف و توصیف کشمیر و صعوبت راہ بسیار خوب گفتہ است"۔ اس کے بعد مثنوی کے یہ چند شعر نقل کئے ہیں:

بود قطعِ رہِ کشمیر مشکل بحق نتواں رسید از راہِ باطل
مگر زیں راہِ باریکت خبر نیست کہ گوئی کوہ را موئے کمر نیست
ز بیم ایں رہِ باریک و خونخوار خلد موئے کمر در دیدۂ خار
گروہے دست از جاں برفشاندہ دریں رہ چوں گرہ بر تار ماندہ
رہِ فقر از رہِ کشمیر پیداست کہ گامِ اوّل او ترکِ دنیاست
ازیں رہ چوں تواں آساں گذشتن کہ گام اول لست از جان گذشتن
مسافر کے تواند زیں بلا جست مگر لغزیدنِ پا گیر دش دست

رہ ہمچوں دمِ شمشیر باریک
جہاں در چشمِ رہ پیماش تاریک
رہے پیچیدہ تراز موئے زنگی
بہ تندی ہچوں دمِ تیغِ فرنگی
زبس در رفتنش تدبیر کردہ
فلک را فکر ایں رہ پیر کردہ
ازیں پیمانہ ہائے زندگی آہ
کہ پُر می گردد از پیمودنِ رہ

قدسی نے اس نظم میں راہِ کشمیر کی صعوبتوں کا کچھ اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ جیسے ظلمات کو پھاند کر ہی آبِ حیات تک پہنچا جاسکتا ہے۔ لیکن اپنے اظہار میں قدسی نے شاعرانہ نزاکتوں کے ساتھ کشمیر سے اپنی نیازمندی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ باطل کی راہوں سے حق تک پہنچا نہیں جاسکتا، میں کشمیر کو حق تک پہنچنے کے مترادف جانتا ہے۔ اور پھر منظر کشی کرکے جادو کی اس سرزمیں تک پہنچنے کا اظہار کیا ہے۔ یعنی یہ کہ راہ دمِ شمشیر سے زیادہ باریک ہے اور مسافر کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے کہ جو حبشی بالوں سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اور تیزی میں تیغ فرنگی سے کچھ کم نہیں۔ آسمان محض اس راہ کو پاٹنے اور پار کرنے کی کوشش میں بوڑھا ہو گیا ہے اور لوگوں کی زندگانی کے پیمانے اسی راہ کو پالینے میں پُر ہو جاتے ہیں۔

عاقل خان نے اپنے ایک شعر میں قدسی کی مثنوی کا جواب عجب حُسنِ تحلیل سے دیا ہے۔

بے رنج محال است بہ فردوس رسیدن
ہمواریٔ رہ گلشنِ کشمیر ندارد

قدسی کی اکثر غزلوں میں کشمیر کی شادابیاں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع یوں ہے ؎

نکہتِ عشوہ گر و عربدہ ساز است ہنوز
چشمِ مخمورِ تو سر فتنۂ ناز است ہنوز

قدسی کی موت کے بعد حسن رقمطراز ہے:

"گویند موجبِ وفاتِ فرزند خود محمد باقر محزون شدہ باز گشت بوطن نرفت و مدت العمر در ہند بسر بُرد۔ آخر عمر بہ کشمیر آمدہ دریں جا اقامت گزید و در مزارِ شعراء متصل پُل درگجن بخاک آرمید"۔

طغرائے مشہدی ایک اور خوش طبع شاعر گذرے ہیں۔ حسن کا کہنا ہے کہ مشہدی نے تعریفِ کشمیر میں ایک مثنوی رقم کی ہے اور راہ کی دشواریوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن مثنوی کا فقط ایک شعر در وصفِ ناشپاتی نقل کرتا ہے ؎

کنم تحریر وصفِ ناشپاتی   نماید صفحہ کاغذ نباتی

کشمیر کے موسمِ خزاں کے بارے میں مشہدی کے یہ دو شعر بہت مشہور ہیں ؎

کشمیر بود فصلِ خزاں عالمِ نور   بر طالبِ فیض دیدنش ہست ضرور
گوئی کہ دریں باغ چمن سازِ قضا   آوردہ نہالِ شعلہ از خرمنِ طور

قاضی ابوالقاسم عہد شاہجہانی کے ایک اور سخنور ہیں۔ اگرچہ ان کے کلام میں کشمیر کے متعلق کچھ بھی نہیں ملتا۔ لیکن حسن لکھتا ہے کہ "چوں رحلت نمود در مزار شعراء (در گجن) آسود"۔

مرزا طالبائے کلیم کے متعلق حسن رقمطراز ہے۔ "مولدش ہمدان است۔ چون محمد جان قدسی را اکبر شاہ بزر سنجید دلے نہایت رنجید و بغیرت بر خود پیچید و گفت شخصے را کہ زبان بحلق باید کشید عجب اینکہ او را بزر کشیدند۔ فی الحال از اصفہان در شیراز رفتہ و بہرۂ تمام از دانش علوم رسمی یافتہ رہ نورد ہندوستان گردید۔ اگرچہ مدتے در ممالک دکن و اطرافِ ہندوستان سیر می کرد۔ عاقبت بدرگاہِ شاہجہان رسید و در سلکِ ملازمان منسلک گردید۔ آخر عمر او را برائے نظم کردن شاہنامۂ شاہانِ چغتائیہ در کشمیر فرستادند و دانجا رسیدہ بعد چندگاہ از جان در گذشت و در مزار شعرا ماوا گرفت کتب ہائے بسیار تصنیف کردہ است و مثنوی بےنظیر در تعریفِ ہندوستان و کشمیر بسیار دلپذیر"۔ اس کی ایک مشہور غزل کے اشعار بہت مشہور ہیں۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بے تکلف ان کا استعمال کیا ہے۔ غزل یہ ہے:

وضع بہمر ساں کہ بسازی بعالمے   با ہمتے کہ از سرِ عالم توان گذشت
بدنامیِ حیات دو روزے نبود بیش   گوید ترا کلیم کہ آنہم جہاں گذشت
یکروز صرفِ بستنِ دل شد باین و آں   روزِ دگر بکندنِ دل از جہان گذشت

مرزا طالب کلیم کا مرثیہ کشمیر کے معروف ترین فارسی شاعر غنی کاشمیری نے لکھا ہے:

حیف کز دیوار ایں گلشن برید   طالب آں بلبلِ باغ نعیم!
رفت و آخر خامہ را از دست داد   بے عصا طے کرد ایں رہ را کلیم

بہم پیچیدہ میگردد چو مکتوب   دراین رہ عمرِ خضر و صبرِ ایوب

مگر اِس کے باوجود ظفر خان احسن کشمیر کی رعنائیوں اور اِس کے تازہ کار جمال کا پرستار دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دُعا کرتا ہے کہ ؎

الٰہی تا بود کشمیر آباد   زِ گلزارِ خراسانم مدہ یاد

بہر کس ہرچہ خواہد بے سخن دہ   مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

ظفر خان احسنؔ نے کشمیر کی تعریف میں ایک مکمل مثنوی مسمٰی یہ ہفت منظر لکھدی ہے۔ جس میں کشمیر کی رعنائیوں، شادابیوں بہار و خزاں کی رنگینیوں اور گرما کی برودتوں کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ ظفر خان نے یہ مثنوی شاہ جہاں کے سیر کشمیر کے موقعے پر اہرہ بل کے آبشار کے پاس پیش کی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ یہ مثنوی اب عنقا ہوگئی ہے۔ فقط اشعار منفرد و متفرق کہیں کہیں نظر آرہے ہیں۔

مرزا علی محمد صائبؔ نے پادشاہ نامے میں ظفر خان کے صوبیدار کشمیر ہونے پر یہ شعر لکھدیا ہے ؎

ظفر خان زِ فتح و ظفر شادمان
بہ کشمیر از مملکت شُد روان

ظفر خان نہ فقط یہ کہ خود سخن سنج تھا۔ بلکہ سخنوروں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اسی لئے صائبؔ، کلیم اور میر الٰہی جیسے شعراء ایران اُس کے حلقے سے متعلق تھے، وہ غنی کشمیری کا بھی بڑا مداح تھا۔ لیکن غنیؔ ہر حال میں غنی تھا اور درباریوں سے مستغنی تھا۔ ظفر خان کشمیر کی ندیوں کا تذکرہ دیکھئے کس شوق اور محبت سے کرتا ہے ؎

اگر ایں نہرہا فرہاد دیدے
بجوئے شیر محنت کے کشیدے

کھیتوں کی چوری کا شاید اُس کے عہد میں بھی رواج تھا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ ؎

زمین از بسکہ نایاب است اینجا   بہم دُزدند مردم شب زمین ہا

سلسلۂ نقشبندیہ کے سرخیل خواجہ خاوند محمود ظفر خان ہی کے وقت میں کشمیر تشریف لائے تھے۔

شکِ حسرت چوں نمی ریزد قلم   شد سخن از مردنِ طالب یتیم
ہر دم از شورش دلِ اہلِ سخن   چوں زبانِ خامہ میگردد دو نیم
گرامید از زیرِ زمین   خاک بر سر کرد قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاقِ یکدگر   گشتہ اند ایں ہر سہ دریکجا مقیم
گفت تاریخِ وفاتِ او غنی   طورِ معنی بود روشن از کلیم

مادۂ تاریخ کی رو سے طالب کلیم کی تاریخ وفات ۱۰۶۱ھ نکلتی ہے۔ اس کے فقط ایک سال بعد یعنی ۱۰۶۲ھ میں خود غنی بھی شاعروں کی اس رفتہ کہکشاں کا ایک ستارہ بن گیا۔

میر الٰہی سادات ایران میں سے تھے اور دربار جہانگیری میں خاصے بارسوخ تھے۔ شاہ جہاں کے دور میں جب ظفر خان احسن کو کشمیر کی صوبیداری بخش دی گئی تو بادشاہ نے ضمانت طلب کی کہ ظفر خان کشمیر کے لوگوں کو بہبود و خوش رکھے گا۔ بادشاہ کے ضمانت طلب کرنے کے موقعے پر میر الٰہی بھی دربار میں موجود تھے۔ اور ضمانت طلب کرنے پر برجستہ کہا۔

خدا ضامن رسول و چار یارش

بادشاہ نہایت خوش ہوئے اور ظفر خان نے التجا کی کہ میر الٰہی کو اُن کا رفیق مقرر کیا جائے۔ چنانچہ ظفر خان کی یہ التجا منظور کی گئی۔ اور میر الٰہی ظفر خان گورنر کے ساتھ واردِ کشمیر ہوا اور یہاں کے باغوں اور پُر فضا مقامات کی سیر کی۔ کہتے ہیں کہ اخوند مُلا شاہ مرشد دارا شکوہ نے یہ شعر آبِ طلاء سے لکھوا کر اپنے ہاں آویزاں کیا تھا۔

پادشاہے واگذار و دست آگاہی گزین   چوں بہ آگاہی رسیدی ہر چہ میخواہی گزین

میر الٰہی نے شعر دیکھا تو برجستہ پکار اُٹھا۔

من نمی گویم گدائے یا شہنشاہے گزین   خویش را گزین و دیگر ہر چہ میخواہی گزین

مُلا شاہ قادری سلسلے کے بڑے باغیرت قلندر تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کے فقط چند روز بعد ہی میر الٰہی اس دنیا سے گذر گئے اور مقبرۂ شیخ بہاء الدین گنج بخش میں آسودہ ہوئے۔ بقول حسن "سنگے بالائے

تبرش ایستادہ است و بر آن این تاریخ نوشتہ ؎

میرالٰہی ملکِ ملکِ نظم   بود در اقلیم سخن بے قرین
سال وفاتش طلبیدم زِ عقل   گفت بگو بود سخن آفرین

تاریخ کا تخرجہ کرنے کے بعد ۱۰۶۳ھ تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ظفر خان احسن کا اصل نام خواجہ مرزا احسن اللہ تھا۔ اُس کے والد کا نام خواجہ ابوالحسن تُربتی تھا۔ وہ اصل میں خراسان ایران کا رہنے والا تھا۔ جہانگیر کے اُنیسویں سنہ جلوس یعنی ۱۰۳۳ھ میں اُسے کابل کا صوبیدار بنا کر بھیجا گیا اور بادشاہ کی طرف سے ظفر خان کا لقب عنایت ہوا۔ ظفر خان شاہ جہاں کے پانچویں سنہ جلوس یعنی ۱۶۳۱ء میں اپنے والد کے نائب کے طور پر کشمیر بھیجا گیا جو اُس وقت یہاں گورنر تھے۔ ظفر خان سال بھر اپنے باپ کی نیابت کرتا رہا۔ لیکن اس کے فوراً بعد خود یہاں کا گورنر ہوا اور سات سال پہلی بار کشمیر کا گورنر رہا۔ اس کے بعد ۱۶۴۲ء میں دوبارہ کشمیر کا گورنر ہو کر آیا اور چار سال تک کشمیر میں مقیم رہا۔ صائبؔ اسی کے دور میں کشمیر آیا تھا اور دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ چنانچہ مرزا محمد علی صائبؔ نے ایک بار ظفر خان کے نام ایران سے یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

دور دستان را باحسان یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر می افگند

کہتے ہیں ظفر خان نے شعر دیکھتے ہی مرزا صائبؔ کو پانچ ہزار روپے روانہ کئے۔ ظفر خان کو خود بھی صائبؔ کی دوستی پر بڑا ناز تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار وہ فخراً اس طرح کرتا ہے ؎

طرزِ یاراں پیشِ احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئی ہائے او از فیضِ طبعِ صائبؔ است

پہلے کہیں محمد جان قدسی کے تذکرے میں کشمیر تک پہنچنے کی دشواریوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ وہ تو بہرحال ایک شاعر ہی تھا، لیکن ظفر خان احسن باوجود گورنر ہونے کے راہ کی صعوبتوں سے نالاں نظر آتا ہے ؎

مرا اندیشۂ راہیست جانکاہ   کہ آنجا خضر ہا ہم گم کنند راہ

چنانچہ مشربی نے اُن کی تشریف آوری پر یہ قطعہ لکھ دیا ہے ؎

هست جائے شادمانی زانکہ در کشمیریاں
قطب حق پیرِ خلایق مرشد دوراں رسید
خواجۂ والا گہر خاوند محمود آنکہ فیض
از وجودش ظاہر و باطن بہ مشتاقاں رسید

خواجۂ بزرگ کی کشمیر سے واپسی شیعہ سنی فساد کی وجہ سے ہوئی۔ اور اس سلسلے میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ظفر خان احسن خود شیعہ مسلک کے تھے۔ اور شاید انتظامی مصلحتوں کے تحت خواجہ بزرگ کو یہاں سے واپس لاہور بُلانے میں اُس کا بھی ہاتھ تھا۔

عنایت خان ظفر خان احسن کا بیٹا تھا۔ وہ آشنا تخلص کرتا تھا۔ دربارِ مغلیہ میں اُس کا خاصا رسوخ تھا۔ آخر عمر میں ترک منصب کر کے کشمیر آیا تھا۔ اور یہیں عزلت گزین ہوا۔ آخر یہیں ۱۰۸۱ھ میں رحلت کر گیا۔

ان کے علاوہ فرخ سیر کے عہد تک ایرانی شاعروں کا کشمیر میں تانتا بندھا رہا۔ لیکن ان کا تذکرہ کچھ خوفِ طوالت سے اور کچھ اس لئے کہ انہوں نے کشمیر کے بارے میں کچھ کہا نہیں ہے، مختصر کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغل دور کے شعراء اور خود سلاطین مغلیہ نے کشمیر کو عیش کوشی کے لئے ہی منتخب نہیں کیا تھا، بلکہ انہیں کشمیر سے بڑی محبت تھی اور وہ یہاں کے ہر ذرہ زمین کو عزیز رکھتے تھے۔ اور نیازمندانہ اور عاشقانہ طور پر اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ یہ مقالہ مغل دور میں ایرانی شاعروں کی کشمیر سے شیفتگی کا محض ایک خاکہ ہے۔ ورنہ اس موضوع پر کتاب نما مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس تذکرے میں کشمیر کے فارسی شعرا کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ورنہ صرفی، غنی، محسن فانی، بابا داؤد خاکیؒ، مرزا کمل الدین بدخشی اور کئی ایسے شعرا ہیں جو مغل عہد ہی کے ستارے ہیں۔ اور بقول ؎

اصل او از خاکِ دامنگیرِ ماست
مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست

جی۔ ایم۔ ربّانی

کشمیر مُغل تواریخ میں

مغل دور کے جن مورخوں نے اپنی تواریخ میں کشمیر کا ذکر کیا ہے ان میں مرزا حیدر دوغلات، ابوالفضل، ملک حیدر، برنیئر (فرانسیسی سفیر)، ظفر خان احسن، عبدالقادر بدایونی اور مغل شہنشاہ جہانگیر قابلِ ذکر ہیں۔

چک خاندان کے آخری سلاطین یوسف شاہ، یعقوب چک کو شکست دینے کے بعد شہنشاہ جلال الدین اکبر (۱۵۸۶ء) نے وادیٔ کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملا لیا۔ اس ضمن میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ وادیٔ کشمیر مغل سلطنت کا ایک حصّہ بن گئی جس کے ساتھ علاقہ پکھلی (ہزارہ)، بھمبر، سوات، باجوڑ، قندھار اور ظبلستان بھی شامل کئے گئے اور اس کا صدر مقام کابل کو بنایا گیا۔ مُغلیہ سلطنت نے اسے صوبہ کشمیر کا نام دیا اور اس طرح سے کشمیر کی علیحدہ اور خودمختار حیثیت ختم ہوگئی اور یہ اس وقت کے ہندوستان کے قومی دھارے میں شامل ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں کشمیر میں ایک نیا دور اور نظامِ حکومت شروع ہوگیا اور کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کے دو سال بعد یعنی ۱۵۸۸ء کے اوائل میں ابوالفضل کے ہمراہ جلال الدّین محمد اکبر شہنشاہِ ہند کشمیر کی سیر و سیاحت کے لئے آیا۔ ہجری کلینڈر کے حساب سے یہ شعبان کی پہلی تاریخ ۹۹۴ھ تھی اور دن اتوار کا جب اکبر اعظم شہر سرینگر میں داخل ہوا۔ اُس کا والہانہ انداز میں سواگت کیا گیا۔ گھر گھر شادیانے منائے گئے اور چراغاں کیا گیا۔

شہنشاہ اکبر نے براستہ بھمبر پیر پنچال سفر کیا۔ یہ پُرسکون سفر تھا۔ وہ کشمیر اور شہر کی خوبصورتی دیکھ

بہت محظوظ ہوا اور بہ آوازِ بلند کہہ اُٹھا کہ میں باغ خاصا اور ایک ولایت باجمال میں داخل ہوا ہوں۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ اُس کے پاس الفاظ نہیں کہ وہ اس حسن و جمال کو بیان کر سکے۔ اُس کے مطابق اس خطۂ ارض کی لمبائی ویر (ویری ناگ) سے کشن گنگا تک ۱۲۰ کوس اور چوڑائی (کرناہ اور دردستان کو چھوڑ کر) دس سے پچیس کوس ہے۔ اس کے مشرق میں پرستان اور وادیٔ چناب، جنوب مشرق میں بانہال اور جموں کی پہاڑیاں اور شمال مشرق میں تبت ہے۔ مغرب میں پکھلی، دریائے کشن گنگا (نیلم) جنوب مغرب میں گھکر قبیلوں کا وطن اور شمال مغرب میں چھوٹا تبت (بلتستان) ہے۔ اس ملک (کشمیر) کے ساتھ کم از کم چھبیس[۲۶] شاہراہیں ملتی ہیں جن پر گھوڑے اور ٹٹو سواریاں اور بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں، اگرچہ لوگ زیادہ تر پیدل چلنے کے ہی عادی ہیں۔ پکھلی (جہلم ویلی روڈ) اور بھمبر کے راستوں کو عام شاہراہوں کی حیثیت حاصل ہے "ہستی ونز" (سابق مغل روڈ علاقہ شوپیان) فوج کے لئے مقرر ہے اور اس راستے سے صرف سرکاری افواج ہی آتی جاتی ہیں۔

ابوالفضل کا کہنا ہے کہ کشمیر ایک پوتر مقام ہے۔ یہاں ریشی، منی، عابد اور پرہیزگار قدرت کی خلوت گاہوں میں گوشہ نشینی میں یادِ الٰہی اور اُس کی عبادت میں زندگی بتاتے ہیں۔ یہاں ان گنت صنم کدے بھی ہیں جن میں مورتیاں موجود ہیں۔ جہاں ان کی پوجا ہوتی ہے۔ شہر کے ارد گرد کم از کم ڈیڑھ سو قدیم منادر ہیں لیکن کافی عرصہ گذرنے کے باوجود بھی یہ ماضی کی شان و شوکت کے زندہ ثبوت ہیں۔ کشمیر میں پجاریوں کی اچھی تعداد کے باعث اسے پجاریوں کے ایک مرکز کی سی حیثیت حاصل ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ یہاں بھگوان مہادیو کے پینتالیس[۴۵] اور بھگوان وشنو کے ۶۴ مندر ہیں۔ اس کے علاوہ بھگوان برہما کے تین اور درگا ماتا کے ۲۲ مندر بھی ہیں جن میں پجاریوں کی قطاریں دکھائی دیتی ہیں۔

اہل کشمیر کی زبان کشمیری ہے۔ جو جنوب میں کشتواڑ اور پیر پنچال تک بولی جاتی ہے۔ پوگلی، سراجی اور رام بنی پر اس کا اثر ہے۔ کشمیری زبان پر فارسی کا اثر ہے اگرچہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ اسے یہاں "کاشُر" کہا جاتا ہے۔ ڈوگری بھاشا پر بھی اس کا اثر ہے اور یہ چناب تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تلفظ مختلف ہے۔

کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہ وادی ایک دلفریب مقام ہے۔

یہاں کا ہر نظارہ دل و نظر کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے آبشاروں اور جھومتی ندیوں سے موسیقی کی لہریں سی اُٹھتی ہیں۔ یہاں کی بارشیں اور برف باری ایران و ترکستان کی مانند ہے۔ پھولوں کی مہک دل و دماغ کو معطّر کرتی ہے۔ یہاں کی تمام وادیوں میں گُلِ بنفشہ، نرگس کے پھول اور سُرخ گلاب بکثرت اُگتے ہیں۔ یہاں کے دو موسم۔ موسمِ بہار اور موسمِ خزاں کچھ زیادہ ہی حسین و دلکش ہوتے ہیں۔

جہاں تک رہائشی مکانات کا تعلق ہے، یہ چار منزلہ ہوتے ہیں اور لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ مکانات کے اردگرد دیوار بندی یا جنگلہ بندی کا رواج نہیں ہے۔ مکانات کی چھتیں مٹّی کی ہوتی ہیں جن پر گُلِ لالہ؎ اُگتے ہیں اور بڑے ہی دلکش لگتے ہیں۔

شہر کشمیر (سرینگر) اس کی راجدھانی ہے۔ یہ لمبائی میں چار فرسنگ ہے۔ "وِیتھ" (جہلم) نالہ مار پچھم کوہل شہر کے عین بیچ میں سے بہتی ہے (بعد کے دو کوہل کا کوئی نشان باقی نہیں)۔ شہر کاریگروں کا مقام ہے۔ اُون بُننے اور اُونی مصنوعات بنانے والے کاریگر یہاں زمانۂ قدیم سے موجود ہیں۔ شال بافی عروج پر ہے۔ یہاں کے باشندے پٹّو کا استعمال کرتے ہیں۔ ذرائعِ آمدن بہت قلیل ہے۔ آبادی میں پھر بھی اضافہ ہوا ہے۔ ملک میں گداگری، چوری اور نقب زنی کا نام و نشان نہیں۔ شہر کے نزدیک دو بڑی پُر کیف و دلکش جھیلیں ہیں جن کے اخراج یا بہاؤ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہاں ہاتھی اور اونٹ نہیں ہیں۔

لوگوں کے گھروں کے بالکل آس پاس گلی کوچوں میں دوکانیں ہیں۔ رسل و رسائل کے لئے دریا ایک اہم ذریعہ ہے۔ کشتی بانوں کا کاروبار عروج پر ہے۔ پڑھائی لکھائی میں برہمن مصروف ہیں۔ وہ بھوج پتروں پر لکھتے ہیں جو ایک درخت کا چھلکا ہے۔ سماج میں برہمنوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے اور اُن کا حُسنِ سلوک بہت اچھا ہے۔

یہاں ریشیوں کی تعداد کافی ہے جو فی الحقیقت عابد ہیں۔ وہ میوہ دار درخت لگاتے ہیں۔ وہ گوشت کھانے سے اجتناب کرتے ہیں اور شادی بیاہ، گھر گرہستی کے جھنجھٹ سے دُور رہتے ہیں۔ اس شہر کے لوگ علم نجوم کا مطالعہ کرتے ہیں اور درس و تدریس میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ شہنشاہ نے

؎ TULIPS

اب یہاں نظامِ حکومت چلانے کے لئے کچھ ضوابط و قوانین مرتب کئے ہیں جن کا مقصد عوام کی بہبود اور ایک خوشحال سماج کی تعمیر ہے۔ شہنشاہ کے ہی حکم سے دریاؤں، کوہلوں اور ندیوں کی صفائی کرائی گئی۔ کچھ نئی کوہلیں اور نہریں وجود میں آئیں۔ سفیدے اور دیگر اقسام کے درخت لگوائے گئے۔

ابوالفضل کے مطابق یہاں توت اور دیگر ثمر دار درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اُس کے مطابق یہاں کے خربوزے، تربوز، آڑو، سیب قابلِ تعریف ہیں۔ انگور کی بیلیں رہائشی مکانوں کے صحنوں میں پائی جاتی ہیں اور اس قسم کا صحن یا باغیچہ کاشت کرنا ایک کشمیری اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ توت کے پتوں پر ابریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔ لوگ چاول کھانے کے عادی ہیں۔ شراب، مچھلی اور ترکاریاں عام استعمال کی چیزیں ہیں اور یہ سکھا کر بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

وادیٔ کشمیر دو اضلاع میں منقسم ہے۔ مراز (مشرق میں) اور کمراز (مغرب میں)۔ پرگنوں کی تعداد ۳۸ ہے۔ دردا (دردستان اور کرناہ کے علاقے) اسمیں شامل نہیں ہیں۔ وادی میں شالی کی پیداوار ۶۳ لاکھ خروار ہے اور اس میں لوگ خود کفیل ہیں۔

جہانگیر کو قدرتی مناظر خاصکر کشمیر کے باغات اور سبزہ زاروں سے عشق تھا۔ وہ آٹھ مرتبہ اپنے والد اور پھر بیگم کے ہمراہ کشمیر آیا۔ ڈل جھیل میں شام کو چراغاں کرتا اور اس نظارے سے لطف اندوز ہوتا۔

"تزکِ جہانگیری" شہنشاہ جہانگیر کی تصنیف ہے۔ یہاں کے سماجی، ثقافتی اور معاشی حالات بیان کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے۔

"میں نے اپنے والد بزرگوار محمد جلال الدین اکبر کے ہمراہ رہ کر بہت وقت صرف کیا۔ جب تخت نشین ہوا میں ہمیشہ ہی میدانی علاقوں کی گرمی کی شدت اور گرد و غبار سے چھٹکارا چاہتا تھا، اس لئے ہر سال اپنی ملکہ کے ساتھ ۲۱ سال تک کشمیر میں قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

تخت نشینی کے دوسرے سال میں کشمیر پہنچا اور جہلم کے کنارے اپنا خیمہ لگایا۔ رات کو سخت آندھی چلی، کالے بادل نمودار ہوئے اور پورے آسمان پر چھا گئے۔ اُس کے بعد ایسی بارش ہوئی کہ معمر افراد کے کہنے کے مطابق انہوں نے ایسی تیز بارش برستے نہیں دیکھی تھی۔ بارش تھمی تو اُس کے بعد اولے گرے جو مرغی کے

انڈے کے برابر تھے۔

جہلم کو دریائے بہت بھی کہتے ہیں۔ اس کا منبع چشمہ ویرناگ ہے۔ یہ چشمہ آٹھ کونا ہے اور صاف و شفاف پانی سے بھرا رہتا ہے۔ اگر کوئی چیز اس میں ڈال دی جائے تو تہہ تک پہنچتے پہنچتے صاف دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اس کی گہرائی کے متعلق سوچا۔ آخر ایک رسّی سے چھوٹا سا پتھر باندھا اور اُسے چشمے کے بیچ میں ڈالا۔ معلوم ہوا کہ اس کی گہرائی دو آدمیوں (تقریباً بارہ فٹ) کے برابر ہے۔ چشمے کی لمبائی اور چوڑائی بیس گز ہے۔ یہاں کچھ سادھو تپسیا کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ میں نے اس چشمہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہاں ایک بارہ دری (جس میں بڑے بڑے ہال ہیں) اور غسل خانے بنوائے"۔

جہانگیر کے زمانے کا کتبہ ابھی تک موجود ہے جس پر لکھا ہے:

از جہانگیر شاہ اکبر این بنا سر کشیدہ بر افلاک
بای عقل یافت تاریخش
قصر آباد و چشمہ ورناگ

دوسرے کتبے کی عبارت جو آج کل بھی موجود ہے یوں ہے:

شکر خدا کہ ساخت چُنیں
اُبشار یافتہ کشمیر آبرو

شہنشاہ جہانگیر کی دلی خواہش تھی کہ مرنے کے اس کے جسدِ خاکی کو ویرناگ میں سپردِ خاک کیا جائے۔

از شاہ جہانگیر دم نزع چو جُستند   باحسرتِ دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

ویرناگ کے ذکر سے فارغ ہو کر شہنشاہ جہانگیر لکھتا ہے:

پھر میں پانپور پہنچا۔ یہ زعفران کی منڈی ہے۔ اس جگہ کے بغیر دنیا کے کسی حصّے میں زعفران کی کاشت نہیں ہوتی۔ مشاہدہ کیا۔ یہ پورے جوبن پر تھے۔ پھول نکل آئے تھے اور ہر سو نظر آ رہے تھے۔ جب اس کی اونچائی دو انچ ہوتی ہے تو اس میں پھول نکل آتے ہیں۔ پھولوں کا رنگ ہلکا لاجوردی ہوتا ہے۔ پھول کی

نہ ویتھ

چارپتیاں ہوتی ہیں اور تنا آم کے رنگ کا۔ اسکی کٹائی کے موسم میں پورے علاقے میں اسکی تلخ بو انسان کو سر درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔

دریائے جہلم کے بارے میں جہانگیر رقمطراز ہے :

یہ دریا شہر کے وسط میں سے گذرتا ہے۔ لوگ اس کا پانی نہیں پیتے کیونکہ اس سے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ معدے میں بھاری وزن سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ شہر کے لوگ ڈل کا پانی پیتے ہیں جو کہ قریب ہی ہے۔ یہاں ہر جگہ پانی ہی پانی ہے اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ اگر کپڑا یا دری اس پر بچھا دی جائے تو بھدی دکھائی دیتی ہے۔ چنار اپنی عظمت اور شان سے استنادہ ہیں۔ یہاں موسم بہار اور خزاں واقعی قابل تعریف ہیں۔ میرے پاس تعریف کے لئے الفاظ نہیں۔

دریائے جہلم کو عبور کرنے کیلئے لکڑی اور پتھر کے چار پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ (عالی کدل، زینہ کدل، فتح کدل، حبہ کدل) آمد و رفت کے لئے دریائے جہلم ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہاں کم از کم ۵۷۰۰ کشتیاں موجود ہیں جنہیں چلانے کے لئے سات ہزار چار سو کشتی بان حاضر ہیں۔

بازاروں میں ناپ تول کا طریقہ مروّج ہے۔ شاہراہوں میں سے پکھلی کا راستہ جہلم ویلی روڈ بہترین ہے۔ یہ راستہ قدرتی نظاروں سے مالا مال ہے۔

شہر میں چہار منزلہ لکڑی کے مکان بنے ہیں۔ چھتوں پر مٹی ڈالی گئی ہے جن پر قسم قسم کے پھول اُگتے ہیں۔ شراب انگور سے بنائی جاتی ہے۔ لوگ نمک کے ساتھ چاول پکاتے ہیں۔ ترکاریاں اُبال کر پکائی جاتی ہیں۔ تیل، مکھن وغیرہ اُن لوگوں کے استعمال کی چیزیں ہیں جن کی معاشی حالت اچھی ہے یہاں گیہوں کے فصل کی کاشت کم ہوتی ہے کیونکہ کشمیری لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔

یہاں لوگ اُونی کپڑے استعمال کرتے ہیں کیونکہ معمولی سردی سے نزلہ زکام کا اندیشہ رہتا ہے۔ اکثر لوگ سر منڈواتے ہیں اور اس کے اوپر پگڑی (دستار) پہنتے ہیں۔ لوگ لمبا کُرتا پہنتے ہیں۔ یہاں کے شال مشہور ہیں۔ مزدور لوگ بڑے محنت کش ہیں اور مزدوری کے عوض نمک طلب کرتے ہیں جو ہندوستان سے برآمد ہوتا ہے۔

کشمیر بادشاہوں کے لئے ایک عیش گاہ اور صحت افزا مقام ہے۔ یہ خطۂ ارض گوشہ نشینی اور

عبادت، الٰہی کیلئے موزون جگہ ہے۔ جہانگیر اپنی تخت نشینی کے بارہویں سال میں موضع چاڈورہ بھی گیا۔ اس کے مناظر سے متاثر ہو کر اُس نے لکھا ہے:

"یہ ایک دلکش جگہ ہے۔ یہاں پانی کی ندیاں بہتی ہیں۔ بہت اونچے پہاڑ ہیں۔ اس کے[ثہ] اصرار اس کا نام نُور پور رکھا کیونکہ میرا نام نورالدین ہے اور میری بیگم نور جہاں ہے۔

یہاں میں نے ہل ہلل نام کا ایک اُونچا درخت دیکھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگر اس کی ایک ٹہنی کو ہلایا جائے تو اس کی ہر ہر ٹہنی ہلنے لگتی ہے گویا کہ پورا درخت لرز اُٹھتا ہے۔ اس خصوصیت کے حامل یہاں اور بھی درخت ہیں۔

موضع راول پورہ، جو شہر سے ڈھائی کوس دُور ہے، میں ایک پُرانے چنار کا تنا جلنے کی وجہ سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ اس کھوکھلے کی چوڑائی اتنی ہے کہ میں ۲۵ سال قبل پانچ گھوڑ سواروں کے ہمراہ اس کے اندر چلا گیا۔ اس کا تذکرہ اکبر نامہ میں بھی درج ہے۔ میرے والا بزرگوار جلال الدین محمد اکبر بھی اس چنار کے اندر ۲۴ افراد کے ہمراہ گھُسے تھے۔ یہ لوگ ساتھ ساتھ کھڑے رہے۔"

شہنشاہ اورنگ زیب ۱۶۶۵ء میں کشمیر آیا۔ اُس کے ساتھ ایک فرانسیسی سیّاح فرانسس برنیئر (FRANCIOS BERNEIR) بھی یہاں کی سیاحت کے لئے آیا۔ اپنے سفر نامے میں اُس نے کشمیر اور کشمیر کے لوگوں کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔ وہ رقمطراز ہے۔

"کشمیر ایک جنّت فردوس ہے۔ یہاں کے باشندوں کی شکل و صورت اور عادات و اطوار مجھے یہودیوں جیسے لگے۔ میں سمجھتا ہوں ان میں کچھ مماثلت ہے اور اسی لئے اپنے نام کے ساتھ لفظ "جُو" لکھتے ہیں۔ مجھ سے پہلے ایک عیسائی پادری (FATHER JESUIT) یہاں آیا تھا جس نے یہاں کے مفصل حالات درج کئے ہیں۔

کشمیری ذہین اور ہوشیار ہیں خاص کر شعر و سخن میں۔ یہ بہت ہی محنت کش ہیں۔ یہاں کے عام لوگوں کے حسن خاصکر، صنفِ نازک نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔"

[ثہ] حیدر ملک چاڈورہ

ظفر خان احسن عرف احسن اللہ شاہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں صوبیدار تھا۔ وہ فارسی کا ایک اچھا شاعر تھا۔ کشمیر کی مدح میں اُس نے ایک مثنوی "ہفت منزل" قلمبند کی ہے، جو اُس نے شہنشاہ کو اہرہ بل کے مقام پر پیش کی جب وہ کشمیر آیا۔

ظفر خان احسن نے شہنشاہ کے کہنے پر شالیمار باغ کی حدود کو وُسعت دی اور ایک بڑا قطعۂ زمین فیض بخش کے نام سے اس میں شامل کرلیا۔ اپنی مثنوی میں وہ رقمطراز ہے ؎

چو باغ فیض بخش از حکم شاہی
بروباغِ ارم کشتِ مباہی

فرح بخش از کمالِ افتخارش
چو گُل بر فرق خود دادہ قرارش

ازین رو کاشمر فخرِ جہاں است
نہ دروے گلشن شاہ جہاں است

برآوردہ پُر از شوقِ نگارش
کہ تا بوسد کنارِ شالمارش

مغل دور کی ایک اور تاریخ جو کشمیر میں لکھی گئی، تاریخ ملک حیدر (چاڈورہ) ہے۔ یہ تاریخ شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں سپردِ قلم کی گئی ہے۔ جہانگیر اور نور جہاں نے اسے رئیس الملک اور چغتائی کے القاب سے نوازا تھا۔ جب یہ تاریخ مکمل ہوئی تو جہانگیر کی تخت نشینی کا بارھواں سال تھا۔

ملک حیدر لکھتا ہے کہ سلطان حسن شاہ (۱۴۷۲ء) کی محفل میں بارہ سو موسیقی کے عالم ہوا کرتے تھے جن میں خواتین کی تعداد بھی کافی تھی۔ اس کے علاوہ ملک حیدر نے وادی کے مضافات کے صحت افزا مقامات کی تفصیل، محل وقوع اور دیگر جغرافیائی معلومات مفصل طور پر درج کی ہیں۔ اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکبرِ اعظم کے درباری ماہر موسیقی تان سین کی یوسف شاہ چک موسیقی میں کبھی کبھی دُرستی کیا کرتا۔

مرزا حیدر دوغلات کا تعلق سولھویں صدی سے ہے۔ اس کے ہمایوں کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ وہ تاریخ رشیدی میں رقمطراز ہے:

"میں نے یہاں ایک عجوبہ دیکھا کہ یہاں توت اور شاہتوت کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں جن پر ریشم کے کیڑوں کو پالا جاتا ہے اور بعد ازاں اُن سے ریشم حاصل کیا جاتا ہے۔ شہر کے وسط میں ایک بڑا دریا بہتا ہے جس پر چھوٹے چھوٹے پُل تعمیر کئے گئے ہیں۔ رہائشی مکان لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور بہت پرانے لگتے ہیں، کم از کم پانچ سو سال پہلے کے۔"

مغل یہاں آئے اور کشمیر پر حکومت کی۔ میرے خیال میں اس بات پر غور کئے بغیر مضمون کو ختم کرنا کہ مغلوں کی دین کیا ہے، مناسب نہیں رہے گا۔ اکبر اعظم سے لے کر اورنگ زیب کے جانشینوں کے زمانے تک مغل حکمرانوں کی یہی خواہش رہی کہ کشمیر کو اپنے لئے بطور عیش گاہ قائم رکھیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں رہ کر عیش و عشرت کی کچھ گھڑیاں گذاریں۔ انہوں نے عوام کی زبوں حالی دُور کرنے اور اُن کا معیار زندگی بہتر بنانے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی ماسوائے چند ایک رسوائے زمانہ ٹیکس معاف کرنے کے جس سے ایک چھوٹے سے طبقے کو راحت ملی۔ بیگار کا نظام جاری رہا اگرچہ یہاں کا نظام حکومت ہندوستان کے طرز پر چلایا جانے لگا اور بڑی بڑی اصلاحات بھی کی گئیں۔ زرعی اصلاحات اور بندوبست اراضی وزیر ٹوڈرمل کے زیر نگرانی رائج کیا گیا۔ چونکہ وادی مراز اور کمراز نامی دو اضلاع میں تقسیم تھی ان میں شامل علاقے پرگنوں میں تقسیم کئے گئے مثلاً پرگنہ پھاگ، پرگنہ بانگل، پرگنہ کھرون وغیرہ وغیرہ۔

ندی نالوں کی مرمت کی گئی، نئی نہریں کھدوائی گئیں جن سے آبپاشی کی سہولیات میں اضافہ ہُوا اور پیداوار میں بھی اضافہ ہُوا۔

مغل شہراہ قاسم خان (چیف انجنیئر) کی نگرانی میں براستہ گجرات، بھمبر، شوپیان مکمل ہُوئی اور وادی کو ملک کے دوسرے علاقوں کے ساتھ ملایا گیا۔ یہ شاہ راہ مکمل ہونے پر فیضی نے جو اکبر کے نورتنوں میں سے تھا، کہا

بحکم خسروِ والا ز تیشۂ کوہ کناں
ہزار جوئے رواں کرد صاف تر از شیر

چناں بکوہ کمرِ خارہ را تراشیدند　　کہ بہر کوکبِ شاہی سزد ممرّ و مسیر

اس دوران کثیر تعداد میں باغات اور محلاّت زرِ کثیر خرچ کر کے تعمیر کئے گئے جن میں سے کچھ ابھی موجود ہیں اور کچھ کھنڈرات کی شکل میں آج بھی سیاحوں کے لئے باعثِ کشش ہیں۔

ہمیں اگر مغلوں سے کچھ ورثے میں ملا تو وہ تعمیرات اور فنِ تعمیر ہے۔ وہ اس فن میں ماہر تھے اور اُنہوں نے کشمیر کو اس فن سے مالامال کیا خاص کر ذکر نشاط باغ، چشمہ شاہی، شالیمار، نسیم باغ، چار چنار، اچھابل، مانسبل اور بجبہاڑہ وغیرہ کے باغات کا کئے بنا نہیں رہ سکتا۔

ہندوستان کی طرح یہاں بھی فارسی کو اُنہوں نے فروغ دیا۔ دفتری اور روزمرہ کے کام کاج اسی زبان میں ہونے لگے اور کشمیر میں بھی ہندوستان کے طرزِ حکومت پر کام ہونے لگا۔

* * *

شیرازہ

میں چھپنے والی نگارشات کا حقِ اشاعت اکیڈمی
کے نام محفوظ ہوتا ہے۔ اگر کوئی رسالہ یا اخبار انہیں
نقل کرنا چاہے تو اس کے لئے خاص اجازت
یا حوالہ ضروری ہے۔

خوش دیو مینی

مُغل روڑ — تاریخی پسِ منظر

مغل روڑ کو پرانے زمانہ میں نمک روڑ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ راستہ مغل شہنشاہوں کی کشمیر میں آمد سے پہلے بھی سفر کے لئے مستعمل تھا اور کشمیر جانے والی دوسری شاہراہوں کی طرح ایک عام پہاڑی راستے کی حیثیت سے ہی مشہور تھا۔ لیکن سنہ ۱۵۸۶ء میں شہنشاہِ اکبر نے جب اس راستے سے کشمیر کو فتح کیا تو اُس کے بعد لاہور سے سری نگر تک نزدیک ترین راستہ ہونے کے باعث نمک روڑ کو کلیدی حیثیت اور زبردست اہمیّت حاصل ہو گئی۔ فطرت کے دل دادہ مغل شہنشاہوں کو کشمیر کا قدرتی حسن، دلکش نظارے اور ست رنگے موسم بار بار اپنی جانب کھینچ کر یہاں لانے لگے۔ مغلوں نے نمک روڑ کا نام تبدیل کر کے مغل روڑ رکھ دیا اور اس شاہراہ کو رابطے کے لئے مستقل طور پر اپنا لیا۔ اس طرح مغل روڑ کی پہاڑی پگڈنڈیوں پر شاہی قافلوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اب مغل روڑ کی نہ صرف از سرِ نو تعمیر کی گئی بلکہ لاہور سے سری نگر تک کے پورے راستے پر گاؤں، قصبے سرائیں، آرام گاہیں، بارہ دریاں، مسجدیں اور باولیاں بھی بنائی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مغل روڑ کا معمولی سا ویران سنسان پہاڑی راستہ ایک شاہراہ میں تبدیل ہو گیا جس پر ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، کہار، ہلکارے، اہل کار، امرا وزرا اور شاہی دربار والے قافلوں کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔

ویسے تو مغل روڑ لاہور سے شروع ہو کر سری نگر تک جاتا ہے اور اس کی کل لمبائی ۲۴۶ میل

تھی۔ لیکن لاہور سے گجرات شہر تک کا ۷۰ میل کا میدانی سفر اس روڈ میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ اس طرح اصل مغل روڈ گجرات شہر سے سری نگر تک ہی مانا جاتا ہے جس کی کل لمبائی ۱۷۶ میل تھی ۔ یہ سفر چودہ پڑاؤں پر مشتمل ہوا کرتا تھا جن میں گجرات، بھمبھر، سید آباد نوشہرہ، چنگس، راجوری، تھنہ منڈی، بہرام گلہ، علی آباد سرائے، ہیر پور، رامو، کنک پورہ اور سرنگر شامل تھے۔ ہر پڑاؤ کا درمیانی فاصلہ دس سے پندرہ میل کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ فاصلہ پہاڑی راستے کی حالت کو مد نظر رکھ کر متعین کیا گیا تھا۔ ہر پڑاؤ کی مسافت ایک دن میں طے ہوتی تھی۔ مختلف مقامات پر سرائیں، آرام گاہیں، بارہ دریاں، حمام اور مسجدیں بنائی گئی تھیں جن کے آثار آج بھی ملتے ہیں۔ ان پڑاؤں پر مغل شہنشاہ اور اہلِ دربار کشمیر جاتے ہوئے قیام کرتے تھے ۔ چونکہ پورا شاہی قافلہ ایک وقت میں ایک پڑاؤ پر نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لئے بھمبھر کے مقام پر پہنچ کر مغل شاہی کاروان چھوٹے چھوٹے قافلوں میں بٹ کر آگے بڑھتا۔ ہر روز ایک قافلہ ہی روانہ ہوتا تھا۔ اس طرح پہاڑی پڑاؤں پر مغل قافلے بڑے آرام کے ساتھ ستاتے ہوئے سری نگر پہنچتے تھے۔

مغل روڈ کے جغرافیائی حالات، راستے کی نوعیت اور اس شاہراہ پر تعمیر شدہ اہم عمارتوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بات کرنے سے پہلے آیئے اس اہم سڑک کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح یہ سڑک وجود میں آئی اور آج تک کن کن ادوار سے گذری ہے ۔

کشمیر جنت نظیر چونکہ اپنے حسن و جمال کے لئے ابتدا سے ہی مشہور و معروف رہا ہے اس لئے زمانہ قدیم سے ہی بیرونی حملہ آور اس علاقہ کو فتح کرنے کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔ لیکن وادی کو چاروں جانب سے برف سے ڈھکے ہوئے وسیع و عریض سر بلند پہاڑی سلسلوں نے اس انداز سے گھیرا ہے کہ حملہ آوروں کیلئے ان کو عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۰۱۴ء میں سارے ہندوستان کو فتح کر کے آنے والے سلطان محمود غزنوی نے جب کشمیر پر چڑھائی کرنے کے ارادے سے پونچھ کے قلعہ لوہر کوٹ پر حملہ کیا تو دو ماہ کے محاصرے کے باوجود بھی وہ درہ توس میدان والی شاہراہ پر واقع اس قلعے کو فتح نہ کر سکا اور بھاری جانی و مالی نقصان اٹھا کر اُسے واپس غزنی لوٹنا پڑا تھا۔ چونکہ کوہستانی سلسلے ناقابل عبور ہوتے تھے لہٰذا کشمیر میں داخل ہونے والی شاہراہیں اور درّے بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ اسی لئے کشمیری حکمران اپنی پوری قوت اہم سڑکوں و درّوں کی حفاظت اور نگہبانی پر صرف کرتے تھے۔

کلہن کی راج ترنگنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی تک پیر پنچال کو عبور کر کے کشمیر میں داخل ہونے کے لئے مغل روڑ (جسے اُس زمانے میں نمک روڑ کہا جاتا تھا) کو کوئی خاص فوجی اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ یہ ایک عام پہاڑی راستہ تھا۔ اُس دور میں درّہ توسہ میدان والا راستہ ہی کشمیری حکمرانوں کی تمام فوجی مہمات اور جنگوں کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا۔ یہ راستہ پونچھ کے قلعہ لوہر کوٹ کی طرف سے کشمیر میں داخل ہوتا ہے۔

کلہن لکھتا ہے کہ لوہر کوٹ کشمیر کا دروازہ مانا جاتا تھا اور درہ توسہ میدان والی اس شاہراہ کی اتنی اہمیت تھی کہ جس بھی حکمران کا تسلط اس شاہراہ اور قلعہ لوہر کوٹ پر ہو جاتا اصل میں وہی کشمیر کا حکمران مانا جاتا تھا۔ اس طرح بارہویں صدی عیسوی تک مغل روڑ کے بجائے درہ توسہ میدان والی سڑک ہی فوجی نقطۂ نگاہ سے اہم رہی ہے۔ اسی راستے سے حملے ہوا کرتے، اسی راستے شاہی قافلے اور اہلِ دربار سفر کرتے اور اسی شاہراہ پر ٹھہرنے کے لئے سرائیں، قلعے اور دیگر عمارتیں بنائی گئی تھیں جن کے آثار آج بھی اس شاہراہ پر ملتے ہیں۔

اگرچہ بارہویں صدی عیسوی تک نمک رنڑ کو فوجی اہمیت حاصل نہ تھی اور شاہی قافلے واہل دربار اس راستے پر سفر نہ کرتے تھے لیکن درّہ پیر پنچال والی اس شاہراہ کا ذکر کلہن کی راج ترنگنی میں ملتا ہے۔ چونکہ یہ راستہ پنجاب کے ساتھ رابطے کے لئے نزدیک ترین راستہ تھا۔ اس لئے تاجر اپنا مال واسباب اسی راستے کشمیر لایا کرتے تھے۔ اس کا ثبوت موضع ہیر پور (کلہن ہور پور لکھتا ہے) میں واقع کرم وت کی سرکاری چوکی ہے جہاں اس راستے سے کشمیر لائی جانے والی مصنوعات پر چنگی (محصول) وصول کی جاتی تھی۔

اسی طرح کشمیری حکمرانوں سے بغاوت کے بعد وزراء امرا اور شہزادے بھی کئی بار بھاگ کر اسی راستے پشیانہ گاؤں میں پناہ لینے کے لئے آیا کرتے تھے۔ کلہن لکھتا ہے کہ ۱۱۲۱ء میں کشمیر کے راجہ سُسل سے شکست کھا کر جھکتا چر اپنے وزیر پرتھوی ہر اور دوسرے حمایتوں کے ساتھ نمک روڑ کے راستے پشیانہ گیا تھا۔ اس طرح کہیں کہیں پرانے زمانہ میں بھی اس راستے پر آمد ورفت کا پتہ چلتا ہے۔

۱۴۲۵ء میں شاہی خان سلطان زین العابدین کے لقب سے جب کشمیر کے تخت پر براجمان ہوئے تو انہوں نے آگے چل کر ملک کی انتظامی سیاسی ودفاعی ڈھانچے میں زبردست تبدیلیاں کیں۔ اسی سلسلہ میں ۱۴۵۲ء میں سلطان نے لوہر کوٹ کی پہاڑی ہندو ریاست کا خاتمہ کیا اور کشمیر کی بیرونی سرحد پر

واقع ریاست راجوری، نوشہرہ اور لوہرکوٹ کے علاقوں کو مدغم کرکے ایک نئی بیرونی ریاست کی تشکیل عمل میں لائی جس کا نام (BAHYADESAVANIH) بھایادیش وینا رکھا۔ سلطان نے اس ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لیے، وہاں اپنے ولی عہد حاجی خان کو گورنر بنا کر بھیجا۔

اب چونکہ راجوری، نوشہرہ اور لوہرکوٹ پونچھ پر مشتمل ایک نئی ریاست قائم ہو چکی تھی اس لئے اس خطے کے ساتھ رابطے کے لئے کشمیر دربار کو ایک ایسی شاہراہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان تینوں علاقوں کے درمیان سے گزرتی ہو۔ درّہ توسہ میدان والی شاہراہ اس کام کے لئے استعمال میں نہیں لائی جا سکتی تھی کیونکہ وہ اس بیرونی ریاست کی مغربی سرحد سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس لئے نمک روڑ والے راستے کو رابطے کی سڑک کے طور پر منتخب کیا گیا جو راجوری، پونچھ اور نوشہرہ کے علاقوں کے بیچ سے گزرتی تھی۔ یہ شاہراہ نہ صرف سرینگر کے بیرونی ریاست کے ساتھ رابطے کے لئے موزون تھی بلکہ پنجاب کے ساتھ تجارت کے لئے بھی اہم تھی۔ اس طرح سلطان زین العابدین کے دورِ حکومت میں راجوری پونچھ اور نوشہرہ کو ملا کر نئی بیرونی ریاست قائم ہونے کے ساتھ نمک روڑ روشنی میں آنے لگا۔ اب اہلِ دربار، امراء، وزراء، درّہ توسہ میدان والی شاہراہ کے بجائے اسی راستے سے سفر کرتے تھے لیکن آج کل اس سڑک پر سلطان کے عہد کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمک روڑ کو سلطان نے استعمال تو کیا مگر نہ تو اس کی از سرِ نو تعمیر کروائی اور نہ ہی راستے میں آرام گاہیں اور سرائیں وغیرہ بنوائیں۔

نمک روڑ کو فوجی مقصد کے لئے پہلی بار ۱۴۵۲ء میں ولی عہد حاجی خان نے استعمال کیا۔ حاجی خان نے (جو کہ سلطان زین العابدین کا بڑا بیٹا اور بیرونی ریاست کا گورنر تھا) اپنے صلاح کاروں اور مشیروں کے ورغلانے پر اپنے والد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور فوجی لشکر لیکر بہرام گلہ درّہ پیر پنچال سے ہوتے ہوئے ہیرپور جا پہنچا جہاں سلطان زین العابدین مقابلے کے لئے کھڑا تھا۔ اس لڑائی میں سلطان زین العابدین نے اپنے بیٹے کو شکست دے دی اور حاجی خان نمک روڑ کے راستے فرار ہوا۔

اسی طرح تاریخ فرشتہ کے مطابق ۱۴۷۵ء میں حاجی خان کے بھتیجے اور آدم خان کے بیٹے فتح خان نے کشمیر کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ اُس نے نمک روڑ پر واقع اہم مقام بہرام گلہ کو اپنا صدر مقام بنا لیا

اور اس شاہراہ پر قبضہ کر کے درّہ پیر پنچال کے راستے کشمیر میں داخل ہو گیا۔ لیکن کشمیر کے سلطان محمد شاہ نے سازش کر کے فتح خان کی فوج میں ایسا تفرقہ ڈالا کہ فتح خان کو مجبوراً نمک روڑ کے راستے ہی بھاگ کر لوپنچھ جانا پڑا۔

مندرجہ بالا تاریخی حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغلوں کے حملے سے پہلے بھی نمک روڑ پر آمد و رفت کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ نہایت دشوار گذار پہاڑی راستہ تھا۔ نہ تو کہیں ٹھہرنے کا انتظام تھا، نہ سرائیں تھیں اور نہ بنگلے تھے۔ بس چاروں جانب سربلند پہاڑ، خطرناک جنگل اور خونخوار درندے ہوا کرتے تھے۔

ہمایوں کی موت کے بعد ۱۵۵۶ء میں شہنشاہ اکبر جب دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس کی نظریں کشمیر پر لگ گئیں۔ چنانچہ ۱۵۶۰ء میں شہنشاہ کی شہ پر قرا بہادر نے کشمیر پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ اُس نے اس مقصد کے لئے نمک روڑ کو اپنایا اور فوج لے کر نوشہرہ آ پہنچا۔ دوسری جانب اس حملے کی خبر پا کر کشمیر کا حاکم غازی چک مقابلے پر نکل آیا۔ وہ نمک روڑ کے دفاع کے لئے اپنی فوجیں لے کر درّہ پیر پنچال کو عبور کر کے بہرام گلہ پہنچ گیا اور پھر رتن بمیر سے ہوتا ہوا تھنہ منڈی آ گیا۔ اس مقام پر غازی چک اور قرا بہادر کی فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا اور زبردست جنگ کے بعد قرا بہادر کی فوجیں شکست کھا گئیں۔ کشمیری افواج فتح کے ڈنکے بجاتی ہوئی نمک روڑ کے راستے ہی واپس لوٹیں۔ اس لڑائی میں کشمیری حکمران کی فتح کی سب سے بڑی وجہ نمک روڑ پر اُس کا مکمل کنٹرول تھا جس کی بدولت شاہی فوجیں وادی میں داخل ہی نہ ہو سکیں۔

حالانکہ قرا بہادر ناکام ہو چکا تھا، لیکن مغل شہنشاہ اکبر اب ہر حالت میں کشمیر فتح کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران دو کوششیں اور کی گئیں۔ چنانچہ ۱۵۸۶ء میں ایک اور مُہم بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ مشیروں نے شہنشاہ کو صلاح دی کہ کشمیر پر حملہ کرنے سے پہلے نمک روڑ پر واقع چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنا ہم نوا بنا کر ساتھ ملا لینا چاہئیے تاکہ یہ مُہم راستے میں غارت ہونے سے بچ جائے۔ چنانچہ شہنشاہ نے بھمبر، راجوری، نوشہرہ اور بہرام گلہ کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو پیغام بھیجا کہ وہ اطاعت قبول کر کے ان کے ساتھ مل جائیں۔ بادشاہ نے حملے سے پہلے بھمبھر کے راجہ غنی خان کے نام فرمان جاری کیا کہ چونکہ ہماری فوجیں کشمیر پر حملہ کی غرض سے آپ کے علاقہ میں آ رہی ہیں اس لئے

بھمبھر میں ایک عالی شان سرائے تعمیر کی جائے، جس کا آدھا خرچ شاہی خزانے سے دیا جائے گا۔ رعایا میں سے جو بھی شخص اس سرائے کے ساتھ دوکان یا مکان بنائے گا اُسے بھی شاہی خزانے سے نصف خرچہ دیا جائے گا۔ اسطرح دیکھتے ہی دیکھتے بھمبھر میں سرائے اور آس پاس سینکڑوں مکانات تعمیر ہو گئے۔ یہ سرائے پکی اینٹوں سے ۲۰۰ مربع فٹ کے رقبے پر بنائی گئی تھی جہاں مغل درباری رہائش پذیر ہوا کرتے تھے۔ مغل روڈ پر یہ پہلی سرائے تھی جو اکبر کے زمانہ میں تعمیر ہوئی۔ اسی طرح شہنشاہ نے راجوری کے راجہ مست ولی خان اور بہرام گلے کے سردار بہرام نائیک کے نام بھی حکم نامے جاری کر کے انہیں نمک روڈ کی مرمت اور اس کی حفاظت کے لئے لکھا۔

اس طرح تمام انتظام مکمل کر کے شہنشاہ اکبر نے یہ مہم مرزا قاسم کی سرکردگی میں ۲۸، جون ۱۵۸۶ء کو لاہور سے روانہ کی مغل لشکر نمک روڈ کے راستے آگے بڑھنے لگا۔ اور گجرات سے ہوتا ہوا بھمبھر پہنچا جہاں بھمبھر کے راجہ نے شاہی لشکر کا استقبال کیا۔ پھر مرزا قاسم نے راجوری کی طرف کوچ کیا۔ ادھر راجوری کے راجہ مست ولی خان اور بہرام گلے کے سردار بہرام نائیک سلطان کشمیر یعقوب شاہ کی سخت گیر پالیسی اور اُس کے کٹر شیعہ عقیدے کی وجہ سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ مغل فوج کی آمد پر راجہ راجورو اور بہرام گلے کے سردار نے حکومت کشمیر کے خلاف بغاوت کر دی اور مرزا قاسم کی فوجوں سے جا ملے۔ اس بغاوت کا مرزا قاسم کو اہم فائدہ یہ ہوا کہ بھمبھر سے لیکر درہ پیر پنچال تک نمک روڈ کا سارا راستہ مزاحمت کے بغیر ہی اُس کے ہاتھ میں آگیا۔ اب راجہ راجورو اور بہرام نائیک مغل فوج کو راستہ دکھاتے ہوئے چل رہے تھے جس کی بدولت مرزا قاسم اپنے لاؤ لشکر سمیت بڑی آسانی کے ساتھ درہ پیر پنچال عبور کر گیا۔ اُدھر کشمیر کے سلطان یعقوب خان کو جب مغل حملے کی خبر ملی تو وہ کشمیر چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغل فوج مرزا قاسم کی سرکردگی میں کشمیر پر قابض ہو گئی۔

اب چونکہ کشمیر فتح ہو چکا تھا، شہنشاہ اکبر کی خواہش پوری ہو چکی تھی اس لئے وہ وادیٔ کشمیر کا نظارہ کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ چنانچہ ۱۵۸۷ء میں شہنشاہ اکبر پہلی مرتبہ کشمیر کے دورے کے لئے نمک روڈ سے ہوتا ہوا وارد کشمیر ہوا۔ شہنشاہ کی بھمبھر میں آمد سے پہلے ہی وہاں سرائیں، آرام گاہیں، باغات، باولیاں اور مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ شہنشاہ نے بھمبھر پہنچ کر اس کا نام بھمبھر کی جگہ اکبر آباد رکھا اور نمک روڈ کا نام آگے چل کر مستقل طور پر مغل روڈ پڑ گیا۔

بھمبھر سے شہنشاہ مغل روڑ کے راستے کشمیر پہنچا۔ شہنشاہ اکبر کے اس پہلے سفرِ کشمیر کے بارے میں اقبال نامہ اکبری میں تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ ص ۴۲۹ پر لکھا ہے کہ:

”جب ملک کشمیر بادشاہ کے قبضہ میں آیا تو بادشاہ نے اُس کی گلگشت کا ارادہ کیا۔ اور تین ہزار سنگ تراش و خارا شگاف اور دو ہزار بیلدار کارگزار بسرکردگی قاسم خان کے روانہ کئے کہ راہ کی نشیب و فراز کو ہموار کریں۔ بادشاہ کریوؤں کو طے کرتا ہوا راجوری سے گزر کر قاسم خان کے خیموں میں اُترا جس کا کاروان راستے کو پاک صاف کرتے ہوئے آگے آگے چلتا تھا۔ یہاں سے کئی راستے تھے۔ ہر راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ کارآگاہ اُن کو دیکھنے گئے۔ انجمن راز گوئی جمع ہوئی تو طے پایا کہ درّہ پیر پنجال کی راہ اختیار کی جائے۔ یہاں سے چل کر بادشاہ رتن پنجال کی تلہٹی میں پہنچا۔ یہاں سے کشمیری زبان بولنے والے لوگوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ بادشاہ تنہا چلتا تھا لیکن آس پاس ہر منزل میں ہزاروں آدمی جوق در جوق نیازمندی کے لئے چلے آتے تھے۔ یہاں کریوہ بانی نائیکوں کے سرکردہ بہرام نائیک نے کورنش کی اور کشمیر کے سردار باریاب ہوئے۔ پھر بادشاہ بہرام گلہ آیا۔ یہاں بکاولوں سے کچھ لغزش ہوئی۔ اُن کی نگہبانی ابوالفضل کے سُپرد ہوئی۔ پھر بہرام گلہ میں اس دیار کے بہت سے سردار حاضر ہوئے۔ بہرام گلہ سے بادشاہ پوشانہ آیا۔ یہاں عجیب و غریب درخت چنار و پھل پھول دیکھے، بہت سی ندیوں پر پل باندھے تھے۔ اُنہیں عبور کیا تو آگے برف ہی برف تھی۔ بادشاہ کے ہمراہی ڈر گئے۔ مگر بادشاہ نے اُنکی دلدہی کی۔ یہاں کی رسم ہے کہ برف پر لوگ علف شالی کی رسیوں کی پاپوش پہن کر چلتے ہیں۔ بہت سے آدمی اس طرح گئے۔ بادشاہ بھی برف پر چلا۔ یہاں کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ جاڑے کی سختی کا، برف کی شدت کا، ہندی نژادوں کی سراسیمگی کا، کریوہ کی بلندی کا، راہ کی تنگیوں کا یا منزل کے نشیب و فراز کا۔ گویا ہر چیز عجیب و غریب ہے۔

یہاں خاص و عام میں یہ روایت زبان زد ہے کہ پہلے حکیموں نے ان راہوں میں ایسا طلسم بنایا ہے کہ جب کبھی بھاری لشکر کا گزر ہو یا نقارے بجائے جائیں تو تھوڑی دیر میں کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور برف باراں کی ریزش ہوتی ہے۔ ہر بار کہ اس راہ سے جب لشکر گزرتا یہی ہوتا۔ اب بادشاہ کو راہ کی دشواریاں معلوم ہوئیں۔ حکم ہوا کہ جو امیر بادشاہ کے ساتھ ہیں وہ خدمت گزار کارندوں کو منزل بمنزل بٹھا دیں کہ

بھمبھر سے ہیر پور تک ہر منزل پر خیمہ وہیمہ و علف و اسباب خوردنی تیار رکھیں کہ اہل حرم کو تکلیف نہ ہو۔

بادشاہ ہیر پور پہنچا۔ یہاں مرزا یوسف نے خیمہ و خیرگاہ آراستہ کر رکھا تھا۔ اس طرح جب کوہستان سے دشت میں گذر ہوا تو عجب نمائش نظر آئی، ایک دوسرا عالم دکھائی دیا۔ ایک نئی بہشت نے اس دشت میں اپنے چہرے سے نقاب اُٹھا لیا"۔

اُوپر دئے گئے اقتباس سے اُس زمانے کے مغل روڈ کے بارے میں بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سفر میں شہنشاہ اکبر راجوری کے راجہ مست ولی خان کو مغل روڈ کی حفاظت، اس کی مرمت اور رسد سامان کے انتظام سے نہایت متاثر ہوا اور راجہ راجوری کو مرزا کے خطاب سے نوازا تھا۔ اب بادشاہ نے بھمبھر، راجوری اور بہرام گلے کے راجاؤں کو مغل روڈ کی مرمت اور اس کی حفاظت کا کام سونپ دیا اور حکم دیا کہ آیندہ کے لئے وہ شاہی دربار کے رسد سامان و مال برداری کا انتظام بھی کیا کریں۔ اس طرح بھمبھر راجوری کے راجے اور بہرام گلے کے سردار دہلی کے مغلیہ شاہان کے اطاعت گزار بن گئے۔

اکبر تین مرتبہ کشمیر آیا جبکہ وہ بار اُس نے مغل روڈ کے راستے سفر کیا۔ اکبر کی وفات پر ۱۶۰۵ء میں جہانگیر ہندوستان کے تخت پر براجمان ہوا۔ اس بادشاہ کو کشمیر کے قدرتی حسن سے بہت لگاؤ تھا۔ کشمیر کے ساتھ اُس کی محبت اور وابستگی کی داتان اُسی دن سے شروع ہو جاتی ہے جب وہ ۱۵۸۹ء میں اپنے والد شہنشاہ اکبر کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ ہندوستان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ تیرہ مرتبہ پورے دربار کے ساتھ براستہ مغل روڈ کشمیر آیا تھا۔ چونکہ اب شہنشاہ جہانگیر بار بار سرینگر آیا کرتا تھا اس لئے ایک طرف اُس نے اپنے مشہور معروف انجینئر علی مردان خان کو مغل روڈ کی از سرِ نو تعمیر اور ہر پڑاؤ پر رہائش گاہیں، سرائیں و دیگر عمارتیں بنانے کے لئے متعین کیا اور دوسری جانب راجوری کے راجہ تاج الدین عرف حتر سینہ کو مغل روڈ کی حفاظت کا کام سونپا۔ شہنشاہ نے راجہ راجوری کے نام فرمان جاری کیا کہ وہ آیندہ کیلئے نوشہرہ سے کشمیر تک چوکیاں قائم کرے اور راستہ کی حفاظت بذمہ خود سمجھے۔

اس طرح راجوری کے راجہ تاج الدین نے مغل روڈ کی مرمت اور حفاظت کا نہایت اعلےٰ انتظام کیا۔ راجہ نے اس کام کے لئے مرزا عنایت اللہ خان کو قلعہ نوشہرہ میں متعین کیا اور ایک دستہ

فوج کا اُس کے ماتحت رکھا۔ مرزا عنایت اللہ نے اس شاہی راستے پر بھمبر سے کشمیر تک جگہ جگہ حفاظتی چوکیاں قائم کیں اور سپاہی متعین کر کے اس راستے کو بے خطر بنا دیا۔ اس طرح ایک جانب علی مردان نے مغل روڑ کو کشادہ کیا، ہر پڑاؤ پر سرائیں بارہ دریاں تعمیر کیں اور ہر کارواں کے لئے ہر دو میل پر مڑھ بنائے۔ تو دوسری طرف راجہ راجوری نے اس سڑک کی حفاظت کا کام انجام دیا۔ اس طرح مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور میں مغل روڑ کو شاہی راستہ یا شاہراہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

تاریخ گوجر میں رانا علی حسن چوہان نے شہنشاہ جہانگیر کی مغل روڑ پر کشمیریوں کے ساتھ لڑائی اور شہنشاہ کی واپسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ کشمیری بڑے پکّے مسلمان تھے اور مذہب کے ساتھ انہیں بہت عقیدت تھی لیکن دوسری جانب مغل درباری شہزادے اور اہل کار شراب و کباب و خوبصورتی پر فریفتہ تھے۔ مغلوں نے کشمیر کو حاصل کرنے کے ساتھ ہی یہاں کی عزّت و ناموس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تمام باتیں اہل کشمیر کے مذہبی مزاج کے بالکل اُلٹ تھیں۔ اُدھر اپنی حکومت کھو جانے کا بھی کشمیریوں کو شدید رنج تھا۔

۱۶۱۸ء میں احمد سلطان نامی ایک شخص کشمیر پر مقامی حکومت قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس سال جھاڑے کے دنوں میں وہ کشمیر کے دیہات میں گھومتا رہا اور عوام کو کشمیر کی آزادی اور عزّت و ناموس کا واسطہ دے دے کر انہیں اپنے ساتھ جوڑتا رہا۔ احمد سلطان لوگوں کو مغل بادشاہوں کی عیاشیوں اور اُن کے ظُلم کی داستانیں سُنا کر جوش دلاتا رہا۔ چنانچہ ۱۶۱۸ء کی سردیوں میں کشمیر میں لوہا گرم ہوتا رہا، بندوقیں بنتی رہیں اور بارود تیار ہوتا رہا۔ ۱۶۱۹ء کے موسم بہار میں جب شہنشاہ جہانگیر مغل روڑ کے راستے سے آ کر درہ پیر پنچال کے پاس پہنچا تو سامنے احمد سلطان چالیس ہزار کشمیریوں کی فوج لیکر مقابلے کے لئے کھڑا تھا۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے شہنشاہ جہانگیر نے لڑنے یا آگے بڑھنے کی بجائے واپس لاہور جانا مناسب سمجھا اور وہیں سے واپس لوٹا۔

۱۶۲۵ء میں شہنشاہ جہانگیر پھر ایک مرتبہ مغل فوج کے ساتھ براستہ مغل روڑ حملے کیلئے آ گیا۔ لیکن اس بار بھی درہ پیر پنچال کی دوسری جانب احمد سلطان بیس ہزار کشمیری فوج لیکر مقابلے کے لئے تیار تھا۔

چنانچہ دونوں فوجوں کے درمیان خون ریز لڑائی ہوئی۔ ایک ایک کشمیری تہہ تیغ ہوگیا لیکن مغل فوج کے سامنے احمد سلطان کی کچھ پیش نہ چلی اور اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور جہانگیر ایک بار پھر کشمیر میں وارد ہوگیا۔ شہنشاہ جہانگیر آخری مرتبہ ۱۶۲۷ء میں کشمیر آیا تھا اور سات نومبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے مغل روڑ کے پہاڑی راستوں میں اُس نے دم توڑا۔ اُس کے جسم کا کچھ حصہ چنگس سرائے میں دفن ہے۔ یہ مقام آج بھی قابل دید ہے۔

۱۶۵۸ء میں شہنشاہ شاہ جہان اپنے بیٹے اورنگ زیب کے ساتھ کشمیر آیا۔ شاہی شکر کے ساتھ جب راجوری پہنچا تو مغل روڑ پر واقع ریاست راجوری کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے راجہ راجوری کی بیٹی (راج یابی) کے ساتھ شاہزادہ اورنگ زیب کی شادی کرادی تاکہ یہ علاقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مغلیہ شاہان دہلی کا تابعدار رہے اور کشمیر کو ہندوستان سے ملانے والی اس اہم شاہراہ کو بھی محفوظ کیا جاسکے۔

اورنگ زیب ایک ہی مرتبہ اپنے والد کے ساتھ کشمیر آیا تھا۔ اُس وقت ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر اُس کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب رتن پیر سے درہ پیر پنچال تک کے اوبڑ کھوبڑ اور دشوار گزار راستے سے اتنا گھبرایا تھا کہ دوبارہ کشمیر آنے کا کبھی نام نہ لیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد ملک زبردست انتشار کا شکار رہا۔ زمانے نے کروٹ بدلی، دہلی کی مغلیہ سلطنت سکڑنا شروع ہوئی، پنجاب ہاتھ سے نکل گیا اور کشمیر پر افغانوں نے قبضہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہراہ مغل روڑ پر شاہی قافلوں کی آمدرفت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

دہلی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اقبال نصیب ہوا۔ ملتان کی فتح کے بعد مہاراجہ نے مغل روڑ کے راستے ہی ۱۸۱۴ء میں کشمیر کا رخ کیا۔ چونکہ مہاراجہ مغل روڑ کی اہمیت سے ناآشنا تھا اور اس حملہ سے پہلے شاہراہ پر واقع بھمبر راجوری اور پونچھ کے راجاؤں کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ اس لئے جب خالصہ فوجیں رتن پیر کو عبور کرکے بہرام گلے کے آس پاس پہنچیں تو راجوری کے راجہ اگر خان نے بغاوت کر دی۔ پونچھ کے روح اللہ خان نے حملہ کر دیا اور بھمبر کے سلطان خان نے لاہور سے ملانے والے راستے مغل روڑ کو کاٹ دیا۔ اُدھر کشمیر کا حاکم عظیم خان درہ

پیر پنجال سے نیچے آیا تھا اور اُس نے خالصہ فوجوں پر پے در پے حملے شروع کر دئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مہاراجہ کی یہ مُہم کشمیر شاہراہ مغل روڈ پر ہی غارت ہو کر رہ گئی۔ مہاراجہ کی فوجوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا اور بڑی مشکل سے بدھل کے ٹھکر نامدار خان نے مہاراجہ کو لاہور واپس پہنچایا۔

مہاراجہ نے اُس شکست کا بدلہ ۱۸۱۹ء میں کشمیر فتح کر کے لیا لیکن یہ فتح بھی تب ممکن ہوئی جب کشمیر پر حملہ سے پہلے مہاراجہ نے بھمبھر کے راجہ سلطان خان، راجوری کے راجہ اگر خان اور پونچھ کے روح اللہ کو ٹھکانے لگا کر مغل روڈ کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حملہ کے بعد مغل روڈ کے راستے کوئی خاص جنگی مہم نہیں ہوئی کیونکہ ۱۸۴۶ء میں یہ علاقہ لاہور دربار سے مہاراجہ گلاب سنگھ نے حاصل کر لیا جنہوں نے جموں کو سرینگر کے ساتھ رابطے کیلئے درہ بانہال والے راستے کو اپنا لیا۔ ادھر پونچھ پر ڈوگرہ حکمرانوں کے تسلط کے بعد درہ حاجی پیر اور مری والی سڑک تعمیر کی گئی جو سرینگر کو مغرب کی جانب سے براستہ اوڑی حاجی پیر، پونچھ کوٹلی میرپور وغیرہ سے ملاتی اور کوہ مری کی طرف جاتی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ مغل روڈ والی شاہی سڑک سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی۔ اور یہ شاہراہ دھیرے دھیرے پھر پہاڑی پگڈنڈی میں تبدیل ہوتی گئی۔

یہ تھا مغل روڈ کا تاریخی پس منظر۔ آیئے اب اس شاہراہ کے جغرافیائی حالات، راستے کی بناوٹ اور سراؤں، آرام گاہوں و دیگر اہم عمارتوں کے بارے میں چند باتیں ہو جائیں۔

مقالے کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ مغل روڈ چودہ پڑاؤں میں منقسم تھا۔ ان چودہ پڑاؤں کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ گجرات سے بھمبھر۔ درمیانی فاصلہ ۲۸½ میل

یہ تمام علاقہ میدانی ہے اور سفر ایک ہی دن میں طے کیا جاتا تھا۔ یہاں عورتوں کے لئے ڈانڈی اور مردوں کے لئے خچروں وغیرہ کا انتظام ہوتا تھا۔ بھمبھر میں سرائیں اور دوسری آرام گاہیں دستیاب تھیں۔ گجرات سے بھمبھر کا سفر بڑی آسانی سے طے ہو جایا کرتا تھا۔

۲۔ بھمبھر سے سید آباد۔ درمیانی فاصلہ۔ ۱۵ میل

کل فاصلہ = ۴۳½ میل

اس پڑاؤ کا درمیانی فاصلہ پندرہ میل ہے جبکہ چھ میل کی مسافت کے بعد آدھی ڈھک کا پہاڑی مقام آتا ہے ۔ یہاں ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ اس مقام پر بھمبھر کے راجہ دھرم چند اور اُس کی تھکیال رانی کا مزار ہے ۔ یہاں کی سرائے کا نام سامانی سرائے تھا ۔ سید آباد میں رہنے کے لئے بنگلے دستیاب تھے ۔

۳ :۔ سید آباد سے نوشہرہ ۔ درمیانی فاصلہ = ۱۲½ میل

کل فاصلہ = ۵۶ میل

سید آباد سے آگے چند میل یہ شاہراہ میدانی راستے سے گزرتی تھی ، لیکن آدھا راستہ طے کرنے کے بعد کمان گوشی کا پہاڑ آتا ہے جہاں چیڑ کے گھنے جنگل پڑتے ہیں ۔ کمان گوشی کی پہاڑی آدھی ڈھک کی مانند چھوٹی مگر اوبر کھوبڑ ہے ۔ نوشہرہ میں دریائے توی کے کنارے مغلوں کے عہد کا ایک قلعہ اور مغل سرائے کے آثار آج بھی ملتے ہیں ۔

۴ :۔ نوشہرہ سے چنگس : درمیانی فاصلہ ۔ ۱۳½ میل

کل فاصلہ ۔ ۴۹½ میل

نوشہرہ سے مغل روڈ دریائے توی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور تقریباً ایک میل چوڑی گھاٹی سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا ہے ۔ یہاں سے چنگس کی طرف دو راستے جاتے ہیں ، ایک چھوٹا راستہ جو دریا کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جبکہ دوسرا راستہ گھوڑوں و مال برداری کے لئے ہے جو تقریباً بارہ اونچے ٹیلوں سے ہو کر گزرتا ہے ۔ چنگس سے پہلے درمیان میں بھی ستانے کے لئے ایک مغل سرائے بنائی گئی تھی ۔ یہ سرائے آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہے ۔

چنگس ایک پہاڑی مقام ہے ۔ یہاں سے کوہ پیر پنجال کا نظارہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس جگہ ایک بہت بڑی مغل سرائے بنائی گئی تھی جہاں شہنشاہ جہانگیر کے جسم کی انتڑیاں دفن ہیں ۔ یہ سرائے آج بھی قابل دید ہے ۔ یہاں سے آگے سہاونا موسم شروع ہو جاتا ہے

۵ . چنگس سے راجوری : درمیانی فاصلہ ۔ ۱۴میل

کل فاصلہ ۔ ۸۲½ میل

چنگس سے راجوری تک راستہ بڑا آسان ہے۔ جو دریائے راجوری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس راستے کے درمیان میں مراد پور کے مقام پر ایک مغل سرائے کے آثار ملتے ہیں۔ راجوری مغل روڈ کے عین وسط میں واقع ہے۔ پیر پنچال کے دامن میں یہ شہر مسلمان راجاؤں کی راج دھانی رہا ہے۔ ان راجاؤں کے مغل دربار کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ یہاں مغلوں نے سرائیں، بارہ دریاں اور قلعے تعمیر کرائے تھے جن کو وقت کے اژدھے نے نگل لیا ہے۔ جناب جی۔ ٹی۔ دیگر ۱۸۳۷ء میں مغل روڈ کے راستے کشمیر آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مغلیہ عہد میں راجوری بڑا خوبصورت پہاڑی شہر تھا۔ یہاں عمدہ بازار، محلات، قلعے، حویلیاں اور بارہ دریاں تعمیر کی گئی تھیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔

۶: راجوری سے تھنہ منڈی : درمیانی فاصلہ ۔ ۱۴ میل

کل فاصلہ ۔ ۹۷½ میل

راجوری سے یہ شاہراہ ایک تنگ گھاٹی میں تبدیل ہوتی ہے اور تھنہ منڈی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ راستے میں فتح پور کے پاس لیراں بوئی کے قریب ایک مغل سرائے کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں۔ لیراں بوئی سے تھنے تک کا سفر آسان ہے۔ تھنے کے مقام پر ایک بہت بڑی سرائے کے کھنڈر ملتے ہیں جہاں مغل قافلے قیام کرتے تھے۔ یہ سرائے تھنہ بازار کے قریب اور ندی کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔

۷: تھنہ منڈی سے بہرام گلہ : درمیانی فاصلہ = ۱۰½ میل

کل فاصلہ = ۱۰۸ میل

تھنہ منڈی سے آگے پہلے چند میل کا راستہ تو آسان ہے لیکن اس کے آگے جب یہ راستہ رتن پیر پہاڑ کی جانب مڑتا ہے تو سخت چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ رتن پیر سطح سمندر سے ۸۲۰۰' کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں کا موسم نہایت ٹھنڈا ہے۔ اس مقام پر مغلوں کے زمانہ کے مٹھ اور چند دوسری عمارتوں کے آثار ملتے ہیں۔ اس پہاڑی سے نیچے کا نظارہ قابل دید ہے۔ یہاں سے ایک جانب پیر پنچال کا درہ اور دوسری جانب علاقہ راجوری اور پونچھ کے تمام علاقے دکھائی دیتے ہیں

رتن پیر سے مغل روڈ کا راستہ وادئ پونچھ کے علاقہ پنج سراں میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے اُترائی شروع ہوتی ہے اور مغل روڈ چکاں اور رمارڈ کے تنگ اور دلیو دار کے گھنے جنگلوں سے ہوتا ہوا بہرام گلے کی طرف جاتا ہے۔ یہ اُترائی بہرام گلے سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر پرنئی ندی پر آکر ختم ہوتی ہے۔ بہرام گلہ کا قصبہ دریائے پرنئی اور چیتہ پانی ندی کے اتصال پر واقع ہے۔ یہ قصبہ چاروں جانب سر بلند پہاڑوں اور گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ قصبے کے سامنے والی پہاڑی پارکوٹ کے مقام پر ایک قلعہ ہے۔ مغلوں کے دور میں اس قلعے میں پونچھ کے مشرقی علاقوں کا حاکم بہرام نائیک رہا کرتا تھا۔ بہرام نائیک کے بعد مہندی نائیک و حسن نائیک اس علاقے پر قابض رہے ہیں۔ ان سرداروں کا ذکر تزک جہانگیری میں بھی ملتا ہے۔ بہرام گلے سے ایک میل کے فاصلہ پر مشہور زمانہ آبشار نوری چھم پڑتا ہے۔ یہ آبشار شہنشاہ جہانگیر کو بہت پسند تھا۔ شہنشاہ نے اس آبشار کا نام اپنی بیگم نورجہاں کے نام پر نوری چھم رکھا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے تزکِ جہانگیری میں اس خوبصورت اور دلپزیر آبشار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

" چھ تاریخ بدھ وار کو ہم بہرام گلہ پہنچے۔ اس مقام کے پاس ایک خوبصورت آبشار ہے اور میٹھے پانی کا دلفریب چشمہ ہے۔ میرے حکم کے مطابق درباریوں نے میرے لئے یہاں ایک ٹیرس (TARRACE) بنا دیا تھا جہاں بیٹھ کر میں آبشار کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی جگہ ہے جس کو ضرور دیکھنا چاہئے۔ میں نے درباریوں کو حکم دیا کہ وہ اس آبشار پر ایک کتبہ نسب کریں جس میں میرے یہاں آنے کی تاریخ درج ہو۔ یہ کتبہ ٹیرس کے اوپری حصہ میں نسب کیا جائے۔ اُسی وقت شاہی سُنار بھالی باد نے کچھ شعر کتبے پر لکھے اور کتبے کو آبشار کے عین سامنے والی پہاڑی پر نسب کر دیا۔ ......"

سنہ ۱۸۵۹ء میں مشہور سیاح جناب RICHRD TEMPLE اس راستے سے کشمیر آئے تھے۔ وہ اپنی کتاب 'حیدر آباد، کشمیر، سکم اور نیپال' میں لکھتے ہیں کہ نوری چھم آبشار کی ایک چٹان پر کچھ شعر کندہ ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ وہی شعر ہوں جو جہانگیر نے لکھوائے تھے۔ آج کل آبشار کی بائیں چٹان پر ایک چوکھٹا ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی جگہ شہنشاہ جہانگیر نے کتبہ نسب کرایا ہو۔"

نوری چھم سے چیتہ پانی ندی کو عبور کر کے راستہ چندی مڑھ کی طرف جاتا ہے۔ اس مقام پر

ایک مغل سرائے کے کھنڈر آج بھی ملتے ہیں۔ اس سرائے میں شہنشاہ جہانگیر کئی دن قیام کرتے۔ اس سرائے کے چاروں جانب چار مڑھ بنے ہوئے ہیں۔ اندر درجنوں کمروں اور بارہ دری کے آثار بھی ملتے ہیں۔

۸۔ بہرام گلہ (چندی مڑھ) سے پشیانہ[1] : درمیانی فاصلہ = ۸ میل
کل فاصلہ = ۱۱۶ میل

چندی مڑھ[2] سے مغل روڈ پہاڑوں کے دامن میں دریاے چٹہ پانی کے کنارے چلتی ہے۔ اور راستہ تنگ گھاٹی سے گزرتا ہوا پشیانہ کی اور بڑھتا ہے۔ اس راستے میں دریائے پونچھ کو تقریباً تیس مقامات پر دائیں بائیں عبور کرنا پڑتا ہے۔ بارش کے دنوں میں پل بھی بہہ جاتے ہیں، اس لئے یہ سفر بڑا مشکل ہے۔ اس سفر کو طے کرنے کے بعد پشیانہ کا گاؤں آتا ہے۔ یہ گاؤں درہ پیر پنچال کے عین دوسری جانب ایک ڈھلوان پر علاقہ پونچھ کا آخری آباد گاؤں ہے۔ اس گاؤں کی حدیں کشمیر سے ملتی ہیں۔ سطح سمندر سے اسکی اونچائی ۸۵۰۰ فٹ ہے۔ یہ چھوٹی سی بستی سارے علاقے میں سب سے اونچائی پر واقع ہے۔ یہاں لوگ گرمیوں کے چھ مہینوں میں ہی قیام کرتے ہیں۔ آبادی کشمیری لوگوں پر مشتمل ہے۔ برف کے دنوں میں لوگ میدانی علاقوں میں آجاتے ہیں۔ پشیانہ میں مغلیہ عہد کی سرائے کے کھنڈر ملتے ہیں۔

۹۔ پشیانہ سے علی آباد سرائے : درمیانی فاصلہ = ۱۱ میل
کل فاصلہ = ۱۲۷ میل

---

[1] کلہن نے راج ترنگنی میں اس گاؤں کا نام پشیانار لکھا ہے جو بعد میں پشیا ہوگیا۔ کشمیری میں اسے پوش ون بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب پھولوں کا جنگل ہے۔

[2] مڑھ رتن پیر کی پہاڑی سے لیکر علی آباد کی سرائے تک تقریباً ہر میل کے فاصلہ پر ملتے ہیں۔ یہ تمام مڑھ گنبد نما شکل کے مکانوں جیسے ہیں جو چونے اور سرخی سے بنائے گئے ہیں۔ ان مڑھوں کی اوسطاً اونچائی بیس فٹ اور گولائی پندرہ فٹ ہے۔ ایسے مڑھ مغل روڈ کے دوسرے حصوں میں نہیں ملتے۔ یہ مڑھ اس لئے بنائے گئے تھے کہ یہ کوہستانی علاقے تھے اور چھت والے مکان برف کے نیچے دب کر ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لئے ان کو گنبد نما بنایا گیا تھا۔ ان گنبد نما مڑھوں میں مغل شہنشاہوں کے ہرکارے (یعنی ڈاکیے) قیام کیا کرتے تھے جن کا کام سرکاری ڈاک کو جلدی سے جلدی ایک مڑھ سے دوسرے مڑھ تک پہنچانا ہوتا تھا۔ اس طرح جب شاہی دربار سرینگر میں ہوتا تو سرکاری ڈاک بڑی آسانی سے کشمیر سے لاہور لے جائی جاتی تھی۔

پشیانہ سے آگے درّہ پیر پنچال تک چھ میل سیدھی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ یہ راستہ نہایت دشوار گزار پیچیدہ اور خطرناک ہے۔ ایک تو سیدھی چڑھائی ہے دوسرے سطح سمندر سے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی ہونے کے باعث یہاں آکسیجن کی کمی ہے جس سے سفر کرنے میں بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ درندوں اور مویشیوں کی ہڈیاں نظر آتی ہیں۔ چڑھائی عبور کر کے درّہ پیر پنچالؔ آتا ہے۔ یہاں تقریباً ایک کلومیٹر خوبصورت میدان ہے۔ یہاں پرانے زمانہ کی عمارتوں کے آثار ایک سرائے اور شیخ عبدالکریم کی خانقاہ بھی ہے۔ یہ بڑا متبرک استھان مانا جاتا ہے۔ درّہ پیر پنچال سے مغل روڈ علی آباد کی سرائے کی طرف جاتا ہے جو کہ یہاں سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ سفر آسان ہے اور ایک وسیع و عریض میدان سے گزرتا ہے۔ اس میدان میں درخت تو درکنار جھاڑیاں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ بہار کے دنوں میں یہاں دُور دُور تک ملائم جنگلی گھاس کی دوب ملتی ہے جس پر نیلے پیلے سُرخ بنفشی رنگ کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ اس میدان سے گزر کر علی آباد کی سرائے آتی ہے۔ یہ بہت بڑی سرائے ہے۔ اس میں بے شمار کمرے اور بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہاں مغلوں کی فوجیں قیام کیا کرتی تھیں۔ یہ سرائے آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔

ؔ پنچال کا لفظ کشمیر میں اُس سلسلۂ کوہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جو جنوب کی طرف سے ملک کی حد بندی کرتا ہے۔ کھیشمیندر نے اپنی تصنیف سمے ماترکا میں درّہ پیر پنچال پر ایک مٹھ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں عام طور پر رواج ہے کہ بڑے اور اونچے پہاڑوں کے نام فقیروں اور ولیوں کے نام پر رکھے جاتے تھے جیسے حاجی پیر، رتن پیر، تولی پیر، گنگا چوٹی وغیرہ اسی طرح اس درّہ کا نام بھی کسی پیر کے نام پر مشہور ہوا ہے۔ ڈاکٹر برنیر اورنگ زیب کے ساتھ جب یہاں سے گزرا تو اُس نے یہاں ایک فقیر کا ذکر کیا ہے جو درّے پر قیام کرتا تھا۔ اس فقیر کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ معجزے کرتا ہے اور اپنی مرضی سے آندھی لانے، مینہ اور برف برساتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ پیر کا لفظ اُسی پیر کی وجہ سے پڑا ہو۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس درّے کو پنچال دیو کہا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت سری ور کی راج ترنگنی سے ملتا ہے۔ سری ور اپنی راج ترنگنی کی ترنگ ۲ کے شلوک ۲۱۴۴ میں لکھتا ہے کہ حسن شاہ کے زمانہ میں ایک پناہ گزین ہیر پور کے راستے آتا ہے وہ اس راستے کی مہلک سردی کا ذکر کرتا ہے جو اُسے پنچال دیو کی چوٹی پر لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ جو نام استعمال ہوا ہے موجودہ درّہ پنچال یا پیر پنچال ہی کا پرانا نام تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نام میں پیر ہے اور پرانے نام میں دیو آتا ہے۔

۱۰۔ علی آباد سرائے سے ہیرپور: درمیانی فاصلہ : ۱۲ میل

کل سفر : ۱۳۹ میل

درہ پیر پنجال سے آگے مغل روڈ علاقہ کشمیر داخل ہو جاتا ہے اور جب ہم علی آباد کی سرائے پر پہنچتے ہیں تو یہاں سے آگے اُترائی شروع ہو جاتی ہے۔ جوں جوں سڑک ہیرپور کی جانب بڑھتی ہے راستہ کشادہ اور ہموار ہوتا جاتا ہے۔ علی آباد سرائے سے دو میل آگے لال گلام کا مقام آتا ہے۔ جہاں سے راستہ پھر نہایت تنگ اور دشوار گزار ہے۔ اس مقام کو لال گلام کا پیڑا بھی کہا جاتا ہے۔ مغلیہ عہد میں یہاں کازوے بنا کر دریا سے اوپر تنگ راستہ بنایا گیا تھا۔ یہ کازوے مغل شہنشاہ شاہجہان کے عہد میں بھی مردان خان نے بنوائی تھی۔ اس کازوے کے ایک میل کے فاصلہ پر ایک ٹاور نگہبانی کے لئے بنایا گیا تھا جبکہ گاؤں شاہ کوٹ کے مقام پر ایک قلعہ کے آثار بھی ملتے ہیں۔

لال گلام کازوے کے بارے میں پرانی تاریخوں اور سفرناموں میں بڑے دلچسپ حوالے ملتے ہیں۔ جناب بی سی ہگل اپنی کتاب پنجاب اینڈ کشمیر میں لکھتے ہیں کہ علی مردان نے کازوے بنانے کے لئے جب سینکڑوں مزدوروں کو کام پر لگایا تو مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ سامنے پہاڑی پر واقع مینار میں لال گلام نامی آدم خور رہتا ہے جو رہگیروں پر نظر رکھتا ہے۔ اس تنگ راستے میں اُن کو لوٹتا اور نیچے چٹان پر پٹخ کر مار ڈالتا ہے۔ پھر چٹان پر بیٹھ کر بڑے آرام سے اپنے شکار کو کھاتا ہے علی مردان نے لال گلام سے لڑنے کا فیصلہ کر دیا مگر ڈر کے مارے کوئی بھی اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ مجبوراً علی مردان خود لال گلام کے مینار کی طرف بڑھا۔ جب وہ آدم خور کے کچھار میں داخل ہوا تو لال گلام ٹاور میں موجود نہیں تھا مگر اُس کا بیٹا وہیں تھا۔ علی مردان نے موقع پر ہی اُس کو تہہ تیغ کر دیا اور ٹاور پر قبضہ کر لیا۔ اُس کے بعد لال گلام نے کسی سے چھیڑ خانی نہیں کی اور مزدور اس کازوے کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ لال گلام والی پہاڑی بڑی سنگلاخ اور سربلند تھی۔ نیچے دریا بہتا تھا۔ یہاں راستہ بہت تنگ تھا اور اس کو کشادہ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ علی مردان خان نے یہاں دریا سے اوپر تنگ پتھروں کی دیوار بنا کر راستہ بنانے کا فیصلہ کیا لیکن یہ دیوار کسی طرح بھی تعمیر نہیں ہوتی تھی اور

سخت کوششوں کے باوجود بھی گر جایا کرتی تھی ۔ ایک دن علی مردان کو خواب میں ایک فقیر نے کہا کہ اگر اس دیوار میں ایک لال اور ایک غلام کو چنوا دیا جائے تو دیوار تیار ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ علی مردان خان نے ایک خوبصورت لال اور ایک نوجوان غلام کو دیوار میں چنوا دیا جس کے بعد دیوار تیار ہو گئی ۔

لال گلام کو عبور کرنے کے بعد پھر اُترائی شروع ہو جاتی ہے ۔ یہ اُترائی سکھاں کی سرائے تک جاتی ہے ۔ یہ بھی مغل عہد کی ایک پرانی سرائے ہے جو کہ دریائے رمبیرہ کے بائیں کنارہ پر بنی ہوئی ہے ۔

ہیرپور سے تین میل پہلے ڈُبجی کا مقام آتا ہے جہاں مغل کاروان کیمپ لگایا کرتے تھے ۔ ڈُبجی سے ایک راستہ سری نگر کی طرف جاتا ہے جو کہ پکاپورہ سے گزرتا ہے ۔ جب کہ اصل مغل روڈ شوپیان کی طرف جاتا ہے اور دریا کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اور گھنے جنگلوں سے ہوتا ہُوا ہیرپور پہنچتا ہے ۔ یہاں بھی پرانی مغل سرائے کے آثار ملتے ہیں ۔

۱۱۔ ہیرپور سے شوپیان : درمیانی فاصلہ = ۸ میل

کل فاصلہ = ۱۴۷ میل

ہیرپور سے آگے کا راستہ سیدھا ہموار اور کشادہ اور دریائے رمبیرہ کے ساتھ ساتھ شوپیان تک جاتا ہے ۔ جوں جوں سڑک آگے بڑھتی ہے پیر پنچال کے برفانی پہاڑی سلسلے خوبصورت دکھائی دینے لگتے ہیں اور آگے کشمیر کی خوبصورت وادی نظر آتی ہے ۔ یہاں کا موسم ٹھنڈا اور سہاونا ہے ۔

۱۲۔ شوپیان سے رامو : درمیانی فاصلہ : ۱۱ میل

کل فاصلہ : ۱۵۸ میل

شوپیان سے یہ شاہراہ گاؤں رامو کی طرف جاتی ہے ۔ یہ مسافت ایک دن کی ہے ۔ رامو تک کا سفر آسان ہے ۔ یہاں مغل سرائے کے آثار ملتے ہیں ۔

۱۳۔ رامو سے کنک پورہ : درمیانی فاصلہ ۔ ۸ میل

کل فاصلہ = ۱۴۴ میل

یہاں سے مغل روڈ ایک پہاڑ کے ساتھ چلتا ہے ۔ اس راستے سے وادی کا نظارہ کیا جاسکتا

ہے۔ کنک پورہ میں مغل سرائے ہوا کرتی تھی، جس کے آثار آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۴:- کنک پورہ سے سری نگر:- درمیانی فاصلہ ۸ میل

کل فاصلہ ۱۷۴ میل

کنک پورہ سے آگے ایک پہاڑی ٹیلے کو عبور کر کے دُور گنگا کا کنارہ آجاتا ہے۔ اب راستہ سیدھا سری نگر کی طرف جاتا ہے۔ یہاں راستے میں آباد گاؤں لہلہاتے کھیت اور سیب کے باغات نظر آتے ہیں۔ اس طرح مغلیہ دور میں گجرات سے سری نگر تک کا مغل روڈ چودہ پڑاؤں میں منقسم تھا۔ یہ سارا سفر چودہ دن میں طے کیا جاتا تھا۔ یہ راستہ اگرچہ دشوار گزار اور مصائب سے پُر تھا لیکن عام لوگ اور درباری سری نگر پہنچ کر مغل روڈ پر پیش آنے والی دقتیں اور تکلیفیں بھول جایا کرتے تھے کیونکہ یہاں کشمیر جنّت نظیر کے دلکش نظارے اور سہاونے موسم اُنکا خیر مقدم کرتے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد مغل روڈ کے پہلے ۵۰ میل یعنی گجرات سے نوشہرہ کی سرحد تک پاکستان کے قبضے میں میں آ گئے تھے۔ آزادی کے بعد ایک عرصہ تک یہ اہم شاہراہ ناکردہ خیال نظر رہی لیکن ۱۹۷۹ء میں اس سڑک کی از سرِ نو تعمیر (جموں سری نگر راستے کے متبادل سڑک کے طور پر) کا کام ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ کشمیر و پونچھ دونوں اطراف سے اس سڑک کی تکمیل کا کام جاری ہے۔ کشمیر کی جانب سے مغل روڈ کے پہلے باٹیس کلومیٹر مکمل کر لئے گئے ہیں جبکہ ضلع پونچھ کی جانب سے بفلیاز سے چندی مڑھ تک نو کلومیٹر سڑک مکمل ہو چکی ہے اور اُسے آمد و رفت کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ جب کہ وادی میں شوپیان سے ہر پورہ تک تیرہ کلومیٹر سڑک تعمیر کی گئی ہے۔

بفلیاز سے شوپیان تک ۸۹ کلومیٹر مغل روڈ کی تعمیر سے علاقہ پونچھ اور راجوری کا سیدھا سری نگر سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔ ۱۹۷۸ء میں ۱۸ کروڑ ۱۲ لاکھ کی لاگت سے کام شروع کیا گیا تھا۔ اب تک اس کام پر ۳ کروڑ روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اس وقت چندی مڑھ سے وادی کی طرف ۲۵ کلومیٹر اور ہر پورہ سے درہ پیر پنچال کی جانب ۱۶ کلومیٹر کے فاصلے پر کام جاری ہے۔ اس سڑک کی تکمیل سے نہ صرف پونچھ اور راجوری کا رابطہ سری نگر سے قائم ہو جائے گا بلکہ یہ سڑک جموں کو سری نگر سے ملانے کے لئے متبادل راستے کے طور پر بھی استعمال ہوا کرے گی۔ اس سڑک کے چالو ہونے پر پونچھ اور راجوری کے عوام کی اقتصادی حالت پر بڑے

مثبت اثرات پڑ سکتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس سے یہاں کے غریب لوگوں کو روزگار کے وسائل فراہم ہوں گے۔ آج کل یہ راستہ چندی مڑھ سے ہرلوپرہ تک ایک پہاڑی راستے کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے جہاں سے لوگ اپنے مال مویشیوں سمیت گزر کر ڈھوکوں مرگوں میں جاتے ہیں۔ لیکن اب وہ دن دور نہیں جب ایک بار پھر مغلیہ روڈ کی اس شاہراہ پر گہما گہمی شروع ہو جائے گی اور اس سڑک کا کھویا ہوا وقار بحال ہو جائے گا۔

کتابیات

۱، SULTAN ZAIN-UL.ABIDIN. BY N.K. ZUTSHI
۲، تاریخ اقوام پونچھ منشی محمد دین فوق
۳، تاریخ بڈھ شاہی منشی محمد دین فوق
۴، KASHMIR AND PUNJAB BY B.C. HUGEL
۵، HISTORY OF KASHMIR AND KASHMIRIES BY W. WAKEFILED
۶، THE NORTHERN BARRIER OF INDIA, BY FREDRIC DREW
۷، اقبال نامہ اکبری
۸، تزک جہانگیری
۹، A GAZZEETEER OF KASHMIR BY. BATES
۱۰، تاریخ راجوری، مرزا ظفر اللہ خان
۱۱، تاریخ ڈوگرہ دیس نرسنگھ دیو نرگس
۱۲، پونچھ خوش دیو
۱۳ تاریخ چبھال، ٹھاکر میجرا سنگھ
۱۴، راج ترنگی کلہن
۱۵، تاریخ فرشتہ

رشید تاثیر

کشمیری اور مغل — محاذ آرائی کے اسباب

کشمیر میں یہ فقرہ زبان زدہ عام ہے کہ کشمیر کی آزاد اور خود مختار ریاست پر فوج کشی کر کے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اسے دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔ اس نظریہ کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے لازم ہے کہ اسے تاریخ کے پس منظر میں نہ صرف جانچا جائے بلکہ کشمیریوں کی آپسی شکر رنجی، نفاق اور ناعاقبت اندیشی کے وجوہات واسباب پر بھی ایک نظر غائر ڈالی جائے جن کی پاداش میں مغلوں کو ملکِ کشمیر پر تسلط قائم کرنے کی راہیں استوار ہوئیں اور کشمیری عوام نے اس تسلط کے خلاف اور اس کے حق میں کونسا کردار ادا کیا۔

اس سلسلے میں کچھ اہم تاریخی واقعات کو زیر نظر رکھنا لازمی ہے۔ مرزا حیدر کورگانی جو مرزا حیدر دوغلات اور مرزا حیدر کاشغری کے نام سے بھی تاریخ میں مرقوم ہے مغل بادشاہ بابر کا خالہ زاد بھائی اور سلطان سعید خان والئے کاشغر کا بھتیجا تھا۔ سلطان سعید خان نے ۹۳۴ ہجری مطابق ۱۵۵۷ء میں لداخ، بلتستان پر مرزا حیدر گورگانی کی کمانی میں حملہ کیا اور قیام لداخ کے دوران قرار پایا چونکہ سردیوں میں حدود لداخ میں ایک ہزار فوجوں سے زیادہ کے رہنے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے مرزا حیدر کی

سرکردگی میں باقی افواج کشمیر میں زمستان گذار کر واپس لداخ آجائیں۔ مرزا حیدر گورگانی ماہ جمادی الثانی ۹۳۹ ہجری مطابق ۱۵۳۲ء میں درہ زوجیلا نے عبور کر کے لار سے ہوتے ہوئے حدود کشمیر میں داخل ہوا۔ سرینگر شہر میں چوبیس دن قیام کیا۔ کسی جانب کوئی مدافعت نہیں ہوئی جونہی وہ شہر سے باہر نکلا اسے کشمیری افواج کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معرکہ میں ملک علی چاڈوری اور کئی دوسرے سرکردہ کشمیری مارے گئے۔ یہ سلطان محمد شاہ کا دور تھا۔ ملک ابدال ماگرے، حسن چک، لوہر ماگرے اور ریگی چک سے صلح کی گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ سلطان سعید خان والئے کاشغر کا سکہ اور خطبہ جاری کیا جائے۔ سلطان محمد شاہ کی ایک شہزادی ولی عہد اسکندر سلطان کے واسطے لی اور مغلوں کے دستور کے مطابق دوستی قائم کی گئی میر دائم علی نے ابدال ماگرے سے اور مرزا علی طغائی نے لوہر ماگرے سے اور بابا صادق مرزا نے کاجی چک سے محمود مرزا نے ریگی چک سے ملاقات کی اور تحائف کا تبادلہ کر کے چھ ماہ بعد مرزا حیدر گورگانی معہ اپنے لاؤ لشکر کے براستہ لار واپس چلا گیا۔ اور یہ بلا آسانی سے ٹل گئی۔ سلطان سعید خان کاشغر واپس جاتے ہوئے آکسیجن کی کمی کے باعث دم گھٹنے کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۶ ذی الحجہ ۹۳۹ھ بمطابق ۱۵۳۲ء میں لداخ کے فلک بوس پہاڑوں پر ہی اللہ کو پیارا ہوا۔ بادشاہ کے انتقال پر مرزا حیدر گورگانی اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ بدخشاں، پامیر، کابل ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا۔ ان دنوں کامران مرزا ابن بابر لاہور کا حاکم تھا۔ ہمایوں نے اسے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ اور لاہور کا انتظامیہ اسی کو سونپ کر دلی چلا گیا۔ تا وقتیکہ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دیکر بھاگنے پر مجبور کیا۔ ہمایوں لاہور پہونچا۔ کتابِ اخوط لاہور کے گلی کوچوں میں زیر بحث تھی۔ ان دنوں لاہور میں کشمیری امراء میں ابدال ماگرے اور ریگی چک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مرزا حیدر گورگانی سے پرانے تعلقات کی بناء پر انہوں نے خواجہ بانڈے کشمیری کی وساطت سے ہمایوں کو کشمیر میں نوربخشیہ مسلک کی ترویج روکنے اور کتاب اخوط کے بہلنے حملہ کرنے کی درخواست کی۔ ۹۴۷ھ میں حملہ ہوتے ہی کاجی چک بغیر مقابلہ کے نوشہرہ بھاگا اور ۹۵۱ ہجری بمطابق ۱۵۴۴ء میں راجوری میں مرگیا۔

مرزا حیدر گورگانی نے سلطان ابراہیم شاہ کو معزول کر کے سلطان فتح شاہ کے بیٹے نازک شاہ

کو برائے نام بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھایا۔ ابدال ماگرے وزیر اعظم مقرر ہوا اور ریگی چک کو انتظام سلطنت میں دسترس بخشی۔

حق تو یہ ہے کہ مرزا حیدر گورگانی کے بعد نوربخشیہ مسلک سے وابستہ تمام لوگوں نے اپنے تئیں شیعہ مسلمان کہلانا شروع کیا اور کم و بیش فی زمانہ اسی پر عمل ہو رہا ہے۔

تاریخ رشیدی میں مرزا حیدر اس کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

"اس وقت کوئی بھی نوربخشیہ مسلک کا اظہار نہیں کرتا بلکہ تمام مسلمان اپنے تئیں سُنّی مسلک مسلمان کہلاتے ہیں۔"

دس سال تک کشمیر پر حکمرانی کے بعد مرزا حیدر گورگانی غیر شعوری طور پر ایک قصاب کے تیر کا ہدف بنا اور مزار سلاطین سرینگر میں آسودہ ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں حشمت اللہ لکھنوی رقمطراز ہیں۔

"مرزا حیدر نے دس سال تک کشمیر پر فتح مندی اور کامرانی کے ساتھ حکومت کی۔ بالعد میں سہواً کسی شخص کے تیر سے شہید ہوا۔ اس کا مزار کشمیر میں اس وقت تک موجود ہے جسکی مرمت کرنل مور کرافٹ نے ۱۸۲۳ء میں کرائی اور لوح مزار بھی نصب کی ہے جس میں مرزا کے کارنامے بالاجمال مذکور ہیں۔"

مرزا حیدر گورگانی کی وفات کے بعد نوربخشیوں نے پھر سر اُٹھایا۔ سلطان نازک شاہ کی برائے نام بادشاہت میں ملک عیدی رینہ وزیر اعظم تھا۔ اسی زمانے میں شیر شاہ سوری کے بڑے بیٹے سلیم شاہ والی افغانستان نے اپنے دو بھائیوں ہیبت خان نیازی اور شہباز خان کے ہمراہ ایک کثیر لشکر کے ساتھ جموں کی جانب سے کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ لیکن انہیں کشمیریوں نے عبرتناک شکست دیکر مار بھگایا۔ اس جنگ میں اپنے اقتدار کو بحال کرانے کے لئے دولت چک اور غازی چک نے بھرپور حصّہ لیا۔ ساتھ ہی وزیر اعظم ملک عیدی رینہ کے خلاف سازشوں کا منصوبہ بھی ترکیب دیتے رہے۔ ردِ عمل کے طور پر وزیر اعظم نے (سنّی) امراء سادات بیہقی اور چک[1] خاندان کے افراد جمع کر کے مقابلہ کیا۔ ۹۵۸ ہجری

---

[1] چک خاندان سے مراد کپواری چک جو سنّی مسلمان تھے اور ہمت چک کی اولاد سے ہیں یہ گلگت سے نقلِ وطن کر کے آئے تھے۔ چکوں کا دوسرا خاندان جو لنگر چک کی اولاد ہیں۔ ترہگام کے چک کہلاتے ہیں

مطابق ۱۵۵۱ء میں عیدگاہ سرینگر میں جنگ ہوئی۔ عیدی رینہ شکست کھا کر بھاگ گیا اور کچھ عرصہ بعد انتقال کر گیا۔

دولت چک نے سلطان نازک شاہ کو معزول کر کے سلطان ابراہیم شاہ کے بیٹے اسماعیل شاہ کو تخت پر بٹھایا اور خود وزیر اعظم بن کر احکامات جاری کرنے لگا۔ دولت چک نے اپنی اوّلین فرصت میں میر دانیال کی لاش اندرکوٹ سے سرینگر لائی اور بڑے ہی تزک واحتشام سے جڈی بل میں میر شمس الدین عراقی کے مقبرے کے قریب سپردِ خاک کرائی۔ جڈی بل کی خانقاہ کو از سر نو تعمیر کرایا۔ جامع مسجد سرینگر میں (جو سنیوں کے قبضہ میں تھی) دوبارہ خطبہ دوازدہ امام جاری کرایا۔ اپنی چاچی کاجی چک کی بیوہ کو داشتہ بنایا۔ ان حرکتوں سے اُسے نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔!

۹۶۲ھ بمطابق ۱۵۵۵ء میں نازک شاہ نے غازی چک، حسین چک اور کئی دوسرے امراء کے ساتھ ملکر اُسے گرفتار کیا اور اُس کی آنکھیں نکالکر منصب وزارت سے معزول کیا۔ غازی چک وزیر اعظم بنا اور سلطان اسماعیل شاہ کو برطرف کر کے سلطان حبیب شاہ بادشاہ بنایا گیا۔ سلطان حبیب شاہ نے صرف ایک سال حکومت کی۔ سرینگر میں دریائے جہلم پر حبہ کدل کا پل اسی کا تعمیر کردہ ہے۔

دراصل اب سلاطین شہمیر بے کار مورتیوں کی مانند تھے۔ ان کا وجود عدم وجود ایک جیسا تھا۔ چنانچہ ایک دن سلطان حبیب شاہ کو بھرے دربار میں ہوا خطا ہوئی۔ علی خان نام کے ایک درباری نے موقع غنیمت جان کر اُسے غلافِ آداب شاہی قرار دے کر سلطان حبیب شاہ کے سر سے تاج اُٹھا کر غازی چک کے سر پر رکھا اور اعلان کیا کہ آج سے غازی چک سلطان غازی شاہ چک کے نام سے ہمارے بادشاہ قرار پائے ہیں۔ اِس طرح دو سو تیس سالہ شہمیری حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مورخین نے اِس واقع پر طنز کرتے کہا "سُبحان اللہ! بادشاہی دو صد و سی دو سالہ بیک باد مخالف بباد رفت"۔ حالانکہ مقام فکر ہے۔ کاش! کشمیری امرا محض ذاتی مفادات کی خاطر حکومت کو کمزور اور اپاہج بنانے کی سازشیں نہ کرتے اور سلاطین کشمیر اپنے اسلاف کی طرح اِس مقدس منصب کو عوامی امانت سمجھ کر اسکی حفاظت و پاسبانی کرتے تو کشمیر کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

شہمیری حکومت کے خاتمہ پر ملک کشمیر میں چک خاندان کی بادشاہت قائم ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اقتدار کی رسہ کشی میں اُنہوں نے نت نئے سازشی کرتب دکھانے شروع کئے۔ سلطان غازی شاہ نے اپنے بھائی حسین چک کی مدد سے ان کا قلع قمع کرنے کی ٹھان لی۔ میدانِ زال ڈگر میں غضب کا مقابلہ ہوا جس میں نصرت چک کا بھائی مارا گیا۔ نصرت چک اور یوسف چک پسر ریگی چک، ابراہیم چک اور بہرام چک گرفتار ہوئے۔ آخر کے دو بعد ازاں قتل کئے گئے۔

۹۱۵ ہجری مطابق ۱۵۵۸ء میں ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان پر قبضہ کیا۔ سلطان غازی چک کی بے رحمیوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے تنگ آکر ملک شمس رینہ کی قیادت میں کشمیری مسلمانوں کا ایک وفد ہمایوں سے امداد حاصل کرنے کیلئے دہلی گیا۔ ہمایوں نے وفد کی استدعا پر مغل سردار ابوالمعالی کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا۔ ہانجی ویرا کے مقام پر زبردست جنگ کے بعد مغل افواج پسپا ہوئیں۔ اِس جنگ میں ملک شمس رینہ مارا گیا۔

دو سال کی طویل خاموشی کے بعد سرینگر میں محمد رینہ۔ لوہر چک۔ احمد خان ماگرے نے سلطان غازی شاہ چک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ردِّ عمل کے طور پر حاجی پانڈے، لوہر چک، فتح چک نے ہندوستان کی راہ لی۔ اور جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ دن تھے جب ہمایوں دہلی میں اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر انتقال کر گیا اور مغلیہ سلطنت کی باگ ڈور اکبر بادشاہ نے سنبھالی۔

۹۶۷ھ مطابق ۱۵۵۹ء میں جلال الدین اکبر بادشاہ نے قرا[۱] بہادر کی کمان میں بارہ ہزار فوج سے کشمیر پر حملہ کرایا۔ راجوری کے مقام پہ دونوں افواج کا زبردست مقابلہ ہوا لیکن اس بار بھی مغل افواج کو ناکامی اور نامرادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

سلطان غازی شاہ چک کشمیر کا پہلا حکمران ہے جس نے اپنے حریفوں کو جسمانی طور بیکار بنانے کی سزائیں دیں۔ مثلاً آنکھیں نکلوانا، ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزائیں وغیرہ۔ اس سے اگرچہ عام لوگوں کو

---

[۱] مرزا حیدر گورگانی کا بھانجا تھا۔

خوف زدہ کرنا مطلوب تھا لیکن اس کے اثرات الٹے نکلے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں میں چک حکمرانوں کے خلاف نفرت بڑھنی گئی۔ غازی شاہ چک ۹۷۱ھ بمطابق ۱۵۶۳ء میں اپنے بھائی حسین خان چک کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا اور اس کے چار سال بعد انتقال کر گیا۔ سلطان غازی شاہ چک نے اپنے عہد حکومت میں حضرت سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کی بزرگی، علم و دانش اور خداشناسی کا کوئی لحاظ نہیں کیا اور انہیں سرینگر سے بیرو ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔

سلطان حسین شاہ چک اس سے بھی دور قدم آگے نکلا۔ غازی چک جو ستم ڈھانے بھول گیا تھا وہ اس نے پورے کئے۔ اس کے کارناموں میں یہ مرقوم ہے کہ محمد خان، ابدال ماگرے کے بیٹے اور احمد خان کی آنکھیں نکلوائیں۔ یہ لوگ بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ اس پر ملک میں بغاوت کے شعلے بلند ہوئے۔ باغیوں نے بادشاہ کے محل کو آگ لگائی۔ باغیوں کو زیر کرنے کے لئے ظلم و ستم کو آنچ دی گئی۔ باغیوں کا سرغنہ فتح چک گرفتار کیا گیا۔ اُس کی آنکھیں اس گستاخی کی نذر ہوئیں۔ مبارز خان کے جسم کے ٹکڑے کئے گئے۔ نصرت چک جو غازی چک کے دور اقتدار میں ہی پابند سلاسل تھا اِس الزام میں کہ وہ باغیوں کا ہمدرد ہے قید خانے میں ہی اُسکی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ سلطان حسین شاہ چک کے مظالم کے خلاف اُس کے بھائی شنکر چک نے جو نوشہرہ کا حکمران تھا آواز اُٹھائی اور کشمیر پر یورش کی۔ مگر قلیل افواج کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ بادشاہ حسین چک نے علی کوکہ کو منصب وزارت پر فائز کیا۔ یہ انتہائی زیرک معاملہ فہم اور جہاں دیدہ تھا۔ اس نے بادشاہ کو جذبہ وفاداری کے تحت حنفی قوانین کے بجائے فقہ جعفریہ رائج کرنے سے روکا۔ دراصل یہ دور قتل و غارت گری اور خونِ ناحق کا دور تھا۔

سلطان حسین شاہ چک کے زمانے کا مندرجہ ذیل المناک واقعہ اس قدر عبرتناک ثابت ہوا جس نے سلاطین چک حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ اور جس سے مجبور ہو کر لوگوں نے براہ راست مغل دربار کی امداد اور پناہیں تلاش کرنے میں ہی اپنی عاقبت جانی۔

سلطان حسین شاہ کے زمانے میں شہنشاہ اکبر کا مقرر کردہ سفیر مرزا مقیم اصفہانی اپنے باڈی گارڈ یوسف بندر کے ساتھ سرینگر آیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک دن نماز جمعہ کے موقعہ پر یوسف بندر

نے اپنے آقاؤں کے اشارے اور ہدایت پر جامع مسجد سرینگر میں خطیب جامع مسجد قاضی حبیب اللہ کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا جس سے اُسکے سر سے پگڑی گر گئی۔ یوسف بندر نے اتنے ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ جب خطیب جامع مسجد سے باہر آئے اور اپنے داماد مولانا کمال الدین کے ساتھ گھوڑے پر سوار زیارت قبور کیلئے کوہ ماراں کی جانب جا رہے تھے اُن پر تلوار سے کئی وار کئے کہ وہ زخمی ہو گئے۔ یوسف بندر بھاگ گیا۔ آناً فاناً یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور فسادات شروع ہوئے۔ بے شمار لوگ مارے گئے۔

اس سے سلطان حسین شاہ چک سخت گھبرایا وزیر اعظم علی کوکہ کے کہنے پر یوسف بندر کی گرفتاری کا حکم دیا۔ قاضی حبیب اللہ کو اپنے دور کی سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ سلطان حسین شاہ نے اس واقعہ کو سیاسی رنگت دیکر سیاسی فائدہ اُٹھانے کی بھرپور سعی کی اور وزیر اعظم علی کوکہ کے ذریعہ ملّا یوسف الماس اور ملّا فیروز الدین سے اس کے قتل کا فتویٰ حاصل کیا کہ از روئے سیاست ایسے شخص کو قتل کرنا جائز ہے۔ کچھ عرصہ بعد قاضی ذین کی سرکردگی میں ایک وفد مرزا مقیم اصفہانی سے ملا اور کہا کہ مفتیوں نے تعصب کی بناء پر غلط فتویٰ دے کر یوسف بندر کو ناحق قتل کروایا۔

مرزا مقیم نے سلطان حسین شاہ چک کو حکم دیا کہ فتویٰ دینے والے قاضیوں کو میرے حوالے کیا جائے۔ قاضی یوسف الماس اور قاضی فیروز الدین نے مرزا مقیم کی عدالت میں اپنے بیان میں کہا کہ وزیر اعظم علی کوکہ اور اُس کے بھائی ولی کوکہ نے بادشاہ کی جانب سے ہمیں ہدایت کرتے کہا کہ قتلِ یوسف بندر ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ لہٰذا آپ لوگ اس کے قتل کا فتویٰ صادر کریں۔ ہم نے یوسف بندر کے قتل کا مطلقاً فتویٰ صادر نہیں کیا۔ بلکہ بادشاہ کے حکم سے وہ سنگسار کیا گیا۔ ہم نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ ایسے شخص کو جو ذی عزت لوگوں کی تضحیک کرے اور انہیں قتل کرنے کا عزم رکھے از روئے سیاست قتل کرنا جائز۔

نہ قلعہ ہری پربت والی پہاڑی۔ ساتپوں کی پہاڑی۔ تسخیر کشمیر کے بعد اکبر بادشاہ نے اپنے گورنر یوسف خان کو اسی پہاڑی کے اردگرد فصیل تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ فصیل تعمیر کی نگرانی ایک کشمیری میر محمد حسین کینٹھ کے سپرد کی گئی۔ فصیل عہد جہانگیری میں مکمل ہوئی۔

ہے ۔ سلطان حسین شاہ اِس موقع پر اپنے کہے سے مکر گیا تاکہ وہ محفوظ و سلامت رہے ۔ مرزا مقیم اصفہانی نے دونوں مفتی صاحبان کی بھری عدالت میں نہ صرف توہین کی بلکہ فتح چک کے حوالے کرتے ہدایت دی کہ انہیں پہلے خوب اذیتیں دی جائیں اور پھر قتل کر کے ان کی دونوں ٹانگوں میں رسی باندھ کر پورے شہر میں گھسیٹا جائے ۔

تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ علی کوکہ اور ولی کوکہ سے نہ کوئی بیان لیا گیا اور نہ اس بات کی تحقیق ہوئی ۔ آیا جب بادشاہ قسمیں کر اپنی لاعلمی اور بے گناہی کا اظہار کر رہا ہے تو وزیر اعظم اور اُس کے بھائی سے دریافت کیا جائے کہ حقیقت حال کیا ہے اور جب بادشاہ حسین چک کی قسموں پر اعتماد و یقین کر کے مُفتیوں کو قتل کیا گیا تو لازم تھا کہ علی کوکہ کو وزارت اعظمیٰ کے منصب سے معزول کرنے کے علاوہ بادشاہ پر بہتان باندھنے کے جرم میں عبرتناک سزا دی جاتی تاکہ بادشاہ کی جھوٹی قسموں کا بھرم قائم رہتا ۔ لیکن وہ جانتے تھے اِس طرح قاضی زین کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہونچی ہوئی سازش کا راز فاش ہوگا ۔ یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ مرزا مقیم اصفہانی کو عدالت قائم کرنے کا حق کس نے تفویض کیا ۔ اور کس حیثیت میں اُس نے بادشاہ کو حکم دیا کہ مفتیوں کو میرے سامنے پیش کرو ۔

غرض اِس واقعہ کے بعد سلطان حسین چک نے مرزا مقیم اصفہانی کے ذریعہ رواج کے مطابق شہنشاہ اکبر کی خوشنودی اور دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی بہتر استواری کے غرض سے بیش قیمت تحائف اور یعقوب میر کو بحیثیت سفیر اُن کے ہمراہ دہلی بھیجا ۔

اس کے ساتھ ہی علی کوکہ کی ہدایت پر ایک خفیہ وفد بھی فتح پور سیکری گیا جس نے سلطان حسین شاہ چک کی بداعمالیوں ، بدانتظامیوں اور مفتیانِ کشمیر کے قتل میں مرزا مقیم کے جانبدارانہ کردار کو بے نقاب کیا ۔ شہنشاہ اکبر کے حکم سے اس مقدمہ کی تحقیق آگرہ کی شرعی عدالت میں ہوئی جس کی پاداش میں مرزا مقیم اور یعقوب میر دونوں فتح پور سیکری میں قتل کئے گئے اس سے اکبر بادشاہ کو فوری طور دو فائدے حاصل ہوئے ۔ کشمیری سنی جن کی ملک میں اکثریت ہے اُن کی ہمدردیاں حاصل کیں ۔ کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنے کا سنہری موقعہ حاصل ہوا جس نے آگے چل کر کشمیر مغلوں کی جھُولی میں پکے پھل کی طرح گرا دیا اور مغل

تقریباً دو صدی تک کشمیر پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

سلطان حسین شاہ چک کے آخری ایام ۹۷۸ ہجری بمطابق ۱۵۷۰ء میں اس کے بھائی علی شاہ نے اُس پر لشکر کشی کی۔ ہانجی ویرہ میں دونوں فوجوں کا زبردست مقابلہ ہوا۔ حُسین چک نے مغلوب ہو کر بابا خلیل اللہ کی وساطت سے جو شیعوں میں برگزیدہ فرد تھے۔ تاج شاہی علی شاہ کو بھیجا اور معزول ہوا۔

سلطان علی شاہ کا دور بھی بغاوتوں، قتل و غارت، رقابتوں، بداعتمادیوں اور رنجشوں سے پُر تھا۔ اس نے سید مبارک شاہ بیہقی کو وزیر اعظم بنایا ابھی دو سال بھی گذرنے نہ پائے تھے شاہزادہ یوسف شاہ چک نے تخت و تاج حاصل کرنے کیلئے بادشاہ کے خلاف شورشوں اور سازشوں کی رسم بسم اللہ ادا کی لیکن حکومت کے چند بہی خواہوں اور ہمدردوں کے بیچ بچاؤ سے باپ بیٹے کے درمیان کشت و خون کا خطرہ ٹل گیا۔ ۹۸۶ ہجری بمطابق ۱۵۷۰ء میں سلطان علی شاہ چک عیدگاہ سرینگر میں چوگان "پولو" کھیلتے شدید زخمی ہوا اور مرنے سے پیشتر اس نے یوسف شاہ چک کی بادشاہت کا اعلان کیا۔

سلطان علی شاہ کی موت کی خبر سنتے ہی اُس کا بھائی ابدال خان چک نوہٹہ سرینگر میں اپنی افواج لے کر آیا۔ اور حقِ بادشاہی کا دعویٰ کیا۔ یوسف شاہ چک نے سید مبارک خان بیہقی سے مشورہ کر کے بابا خلیل اللہ اور وزیر اعظم محمد بٹ کے ذریعہ ابدال خان چک کو منانے کی کوششوں کے ساتھ یہ پیغام بھیجا کہ اب یوسف شاہ کی بادشاہت قائم ہو چکی ہے۔ لازم ہے کہ اپنے بھائی علی شاہ کے کفن دفن میں حصہ لو۔ ابدال خان چک نے ایک نہ سنی۔ دن بھر جنگ ہوتی رہی جس میں ابدال خان چک کام آیا۔ شام کو سلطان یوسف شاہ چک نے میدانِ جنگ کا معائنہ کیا۔ اور ابدال خان چک کی لاش خاک و خون میں ڈوبی ہوئی دیکھ کر کہا کہ یہ لاش یونہی پڑی رہے۔ کوئی اسکی تجہیز و تکفین نہ کرے۔ یوسف شاہ اگلے دن مرحوم بادشاہ کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہا۔ قاضی الوقت قاضی محمد موسیٰ نے حکم شاہی کے باوجود ابدال خان چک کی تجہیز و تکفین کر کے اُسے خاندانی مقبرے میں دفن کیا۔

یوسف شاہ چک کو حکومت سنبھالے دو ماہ بھی گذرنے نہ پائے تھے اسکی رنگین مزاجی رنگ لائی۔ جملہ امراء سلطنت نے ابدال چک کی قیادت میں جمع ہو کر پرچم بغاوت بلند کیا جس کے نتیجے

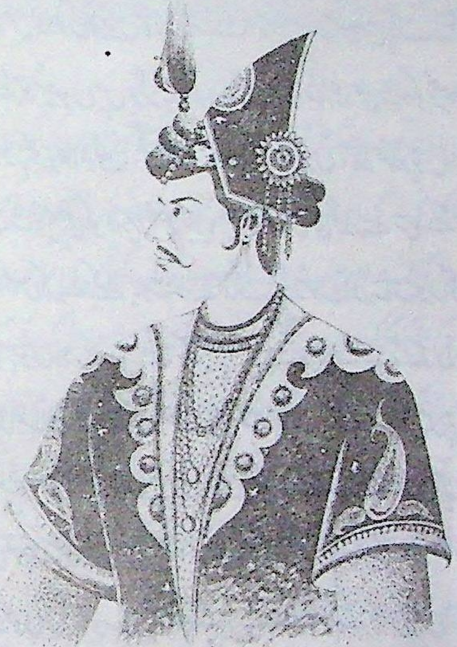

شبیہ یوسُف شاہ چک ـــ عمل: غیور حسن

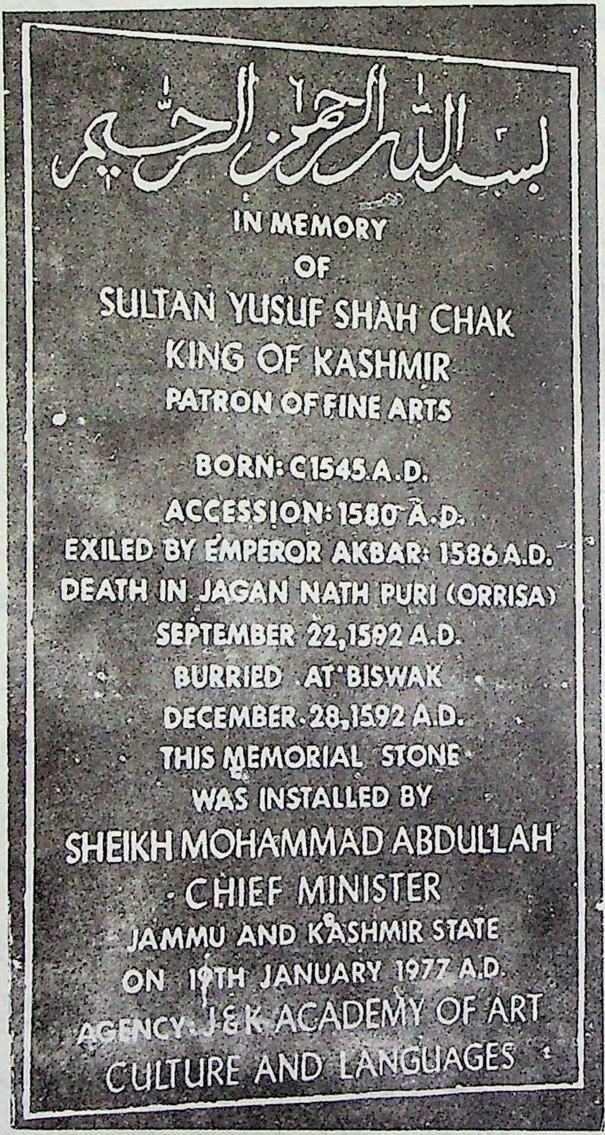

بسم اللہ الرحمن الرحیم

IN MEMORY
OF
SULTAN YUSUF SHAH CHAK
KING OF KASHMIR
PATRON OF FINE ARTS

BORN: C1545 A.D.
ACCESSION: 1580 A.D.
EXILED BY EMPEROR AKBAR: 1586 A.D.
DEATH IN JAGAN NATH PURI (ORRISA)
SEPTEMBER 22, 1592 A.D.
BURRIED AT BISWAK
DECEMBER 28, 1592 A.D.
THIS MEMORIAL STONE
WAS INSTALLED BY
SHEIKH MOHAMMAD ABDULLAH
CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR STATE
ON 19TH JANUARY 1977 A.D.
AGENCY: J & K ACADEMY OF ART
CULTURE AND LANGUAGES

یادگاری کتبہ ۔۔ یوسف شاہ چک ۔۔ ایک عکس

میر میدانِ زال ڈگر میں گھمسان کی زور آزمائی کے بعد یوسف شاہ چک کو شکست کا سامنا ہوا۔ فرار ہو کر فتح پور سیکری شہنشاہ اکبر کے پاس پہونچا۔ کشمیر کے تختِ سلطنت میر سید مبارک خان کو بٹھایا گیا۔ جس نے صرف چھ ماہ حکومت کی۔ ۹۸۸ ہجری بمطابق ۱۵۸۰ء میں شنکر خان کا بیٹا لوہر شاہ چک تخت کا وارث وحقدار قرار دیا گیا۔ ابدال بٹ وزیر اعظم بنا۔ فتح پور سیکری کے قیام کے دوران یوسف شاہ چک نے دربار اکبری میں رسائی حاصل کی اور اِس قول و قرار پر کہ فتح کے بعد کشمیر پر اکبر بادشاہ کی شہنشاہست قائم ہوگی۔ شاہان کشمیر سالانہ خراج ادا کریں گے، ان کی حیثیت باجگذار بادشاہوں جیسی ہوگی۔ ان شرائط پر اکبر بادشاہ لشکر کشی کرنے پر آمادہ ہوا۔ اِس سے عیاں ہوتا ہے کہ یوسف شاہ چک نے اپنے اقتدار کو بحال کرنے کیلئے سیاسی آزادی کا سودا کرنے سے کوئی دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ مرزا یوسف خان مشہدی اور راجہ بھگوان داس کی قیادت میں یوسف شاہ چک مغل افواج لے کر لاہور پہونچا جہاں محمد بٹ جلاوطنی کے دن بتا رہا تھا۔ اور اُس نے کشمیر پر حملہ کرنے کیلئے خاصی فوج تیار کی تھی۔ محمد بٹ کے مشورے پر ہی یوسف شاہ چک نے مغل سرداروں سے پوچھے بغیر ان سپاہیوں کی کمان سنبھال کر کشمیر پر حملہ کر کے لوہر شاہ کو شکست دی۔ ابدال بٹ مارا گیا۔ اِس طرح یوسف شاہ ۹۸۹ ہجری مطابق ۱۵۸۱ء میں دوسری مرتبہ بادشاہ بنا۔ منصب وزارت پر محمد بٹ فائز ہوا۔

یوسف شاہ چک نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالتے ہی انتقام گری کا بازار گرم کیا جس سے بد دل ہو کر وزیر اعظم محمد بٹ مستعفی ہوا۔ شاہزادہ یعقوب شاہ وزیر اعظم بنا۔ ان حالات کے پیش نظر مخالفین نے باضابطہ طور پر قاضی موسیٰ کے مکان پر حکومت کے خلاف موثر اقدامات اُٹھانے کی غرض سے کئی خفیہ اجتماعات کئے جن میں لوہر چک بھی شریک ہوتا رہا۔ اور طے پایا کہ شیخ یعقوب صرفیؒ کی قیادت میں ایک وفد شہنشاہ اکبر کے پاس کشمیر میں مداخلت کرنے کی غرض سے بھیجا جائے۔

اسی دوران حیدر چک کی سربراہی میں باغی فوجوں نے کشتواڑ میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا جہاں حیدر چک، یوسف شاہ چک کے ہر مخالف کی آؤ بھگت کر کے اپنی افرادی قوت میں اضافہ کرتا رہا۔ حیدر چک نے یوسف شاہ چک پر کامیاب اور موثر حملے کے پروگرام کو عملی شکل دینے

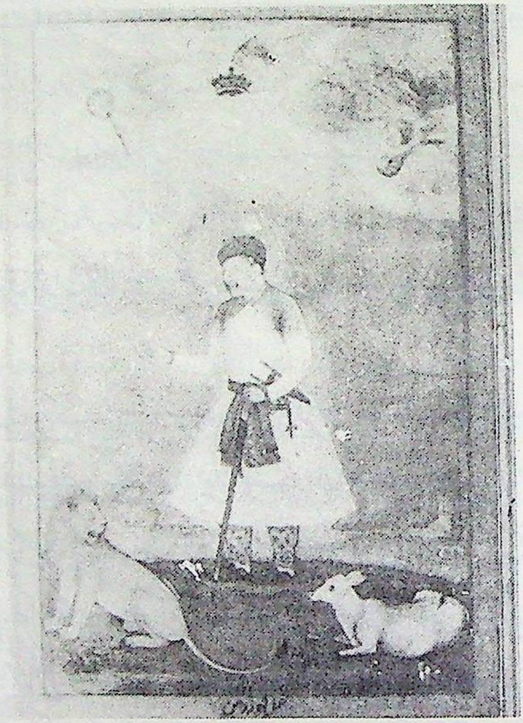

شہنشاہِ اکبر (مغل قلم — ۱۷ویں صدی)

کی خاطر لاہور میں راجہ بھگوان داس سے بھی کئی ملاقاتیں کیں۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ وہ دور تھا جب کشمیر میں چک سلاطین کی غلط حکمت عملی اور تنگ نظری نے مسلمانوں کو دو الگ الگ فٹ پاتھوں پر کھڑا کر کے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور زیر کرنے کی سازشوں پر تیار کیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ شہنشاہ اکبر نے ۹۸۹ھ میں مرزا طاہر اور مرزا عاقل کو کشمیر یوسف شاہ چک کے نام پیغام دیکر بھیجا۔ "بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اطاعت گذاری کا ثبوت پیش کرو" اس پیغام سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یوسف شاہ نے جلاوطنی کے ایام میں مغل بادشاہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے تھے جب ہی تو اُسے اطاعت گُذاری کا ثبوت پیش کرنے کی فہمائش کی گئی۔ یوسف شاہ چک کو متذکرہ پیغام پڑھ کر احساس ضرور ہوا ہوگا کہ اکبری افواج کو لاہور میں چکمہ دے کر کشمیر پہونچنے کے بدترین نتائج برآمد ہونے کی ابتداء ہوئی ہے۔

یوسف شاہ چک نے اپنے مشیروں کے صلح ومشورے اور ہدایت پر شہنشاہ کے دربار میں حاضری دینے کے بجائے اپنے بدلے شہزادہ حیدر چک کو اور حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کو بحیثیت سفیر تحائف دے کر بھیجا۔ ایک سال کے بعد ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ اکبر کا یہ واضح پیغام لے کر واپس لوٹے اگر اب کے فتح پور سیکری آنے میں تاخیر کی تو فوجی کاروائی کی جائے گی"۔ باوجود اس کھلی دھمکی کے یوسف شاہ نے ٹال مٹول کی پالیسی اپناتے شاہزادہ یعقوب شاہ کو فتح پور سیکری بھیجا۔ جو کچھ عرصہ وہاں رہ کر بھاگ آیا۔

ایک جانب تو یہ حال تھا کہ یوسف شاہ چک کی راتوں کی نیند اکبر بادشاہ نے حرام کی اور دوسری جانب وہ اپنے طرز عمل میں ذرّہ بھر فرق لانے پر تیار نہیں تھا۔ ان حالات نے کشمیریوں کو جامع الکمالات حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کی قیادت میں ایک وفد فتح پور سیکری بھیجنے پر مجبور کیا۔ اس وفد میں حیدر چک کے علاوہ حضرت بابا داود خاکیؒ جیسے بزرگ بھی شامل تھے۔ وفد سے تبادلہ خیالات کے بعد فریقین کے درمیان مندرجہ ذیل معاہدہ طے پایا۔

مذہبی عبادت کی مکمل آزادی ہوگی۔ مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت

نہیں کی جائے گی۔

- کشمیریوں کو نہ غلام بنایا جائے گا اور نہ غلام سمجھا جائے گا۔
- رموز مملکت میں چک خاندان کے عمل دخل کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے گا۔
- کشمیریوں سے نہ بیگار لی جائے گی اور نہ انہیں ذہنی وجسمانی اذیتیں دی جائینگی۔
- کشمیر میں قدیم ہندو حکمرانوں کے زمانے سے کاشتکاروں اور زمینداروں سے جبراً دھان وصول کیا جاتا تھا۔ جسے کشمیری اصطلاح میں مجوزہ کہتے ہیں۔ اسے منسوخ کیا جائے گا۔
- تجارت اور خرید وفروخت کے بارے میں کوئی مداخلت نہ ہوگی وغیرہ وغیرہ

متذکرہ معاہدے میں اکبر بادشاہ نے اپنی طرف سے صرف ایک دفعہ کو بڑھایا جس کے تحت کشمیریوں پر آیندہ عسکری دروازے بند کئے گئے اور کشمیریوں کو ہتھیار رکھنے کے حق سے محروم کیا گیا۔

غرض معاہدے پر فریقین کے دستخط ہوتے ہی ۲۰ر دسمبر ۱۵۸۵ء کو حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ اور حیدر چک کی سربراہی میں اکبر بادشاہ نے مرزا شاہ رُخ بہادر۔ راجہ بھگوان داس، شاہ قلی محرم۔ مادھو سنگھ، مبارک خان جیسے جری فوجی سرداروں کو کشمیر پر چڑھائی کا حکم دیا ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کیلئے یوسف شاہ چک نے اپنے کئی پرانے حریفوں کو قید خانوں سے رہا کیا۔ طرفین کے درمیان درہ بُلیاس میں گھمسان کا رن پڑا۔ ناسازگار موسم مغلوں کی فتحیابی میں سدراہ بنا۔ اور اُن کی فتح شکست میں تبدیل ہوئی۔ اسی دوران راجہ بھگوان داس نے یوسف شاہ چک کو ایک مکتوب کے ذریعہ انتباہ کیا۔ "برسبیل تذکرہ اگر ناموافق موسمی حالات کی وجہ سے مغل فوج پیچھے ہٹ بھی جائے تو اگلے سال ایک لاکھ فوج سے نہ صرف تمہیں زیر کیا جائے گا۔ بلکہ کشمیر کا چپہ چپہ روند دیا جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔" اس مکتوب سے یوسف شاہ کے اوسان خطا ہوئے اور اپنی عافیت اسی میں سمجھی، ہر چند کہ مصاحبوں اور فوجی جرنیلوں نے یہ مشورہ دیا اگلے سال دیکھا جائے گا لیکن یوسف شاہ پر ہیبتِ شہنشاہی اس قدر سوار ہو چکی تھی کہ اس نے کوئی مشورہ قبول نہیں کیا اور ۱۴ر فروری ۱۵۸۶ء کو

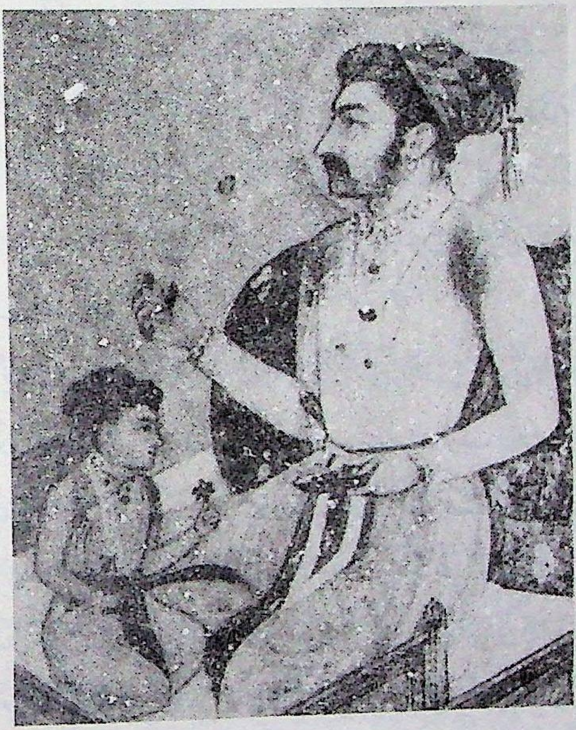

شہزادہ داراشکوہ اپنے والد کے ساتھ

خاموشی سے راجہ بھگوان داس کے سامنے بغیر کسی شرط کے حاضر ہوا۔ ۲۹؍ ربیع الاوّل ۹۹۴ھ بروز جمعہ اٹک کے مقام پر یوسف شاہ چک مجرموں کی طرح گلے میں طوق پاؤں میں فولادی زنجیریں باندھ کر شہنشاہ جلال الدین اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل کی نگرانی میں قید کی سزا دی گئی۔ دو سال بعد راجہ بھگوان داس کی سفارش پر قید سے رہائی پائی اور مہم بنگال میں مغل افواج کے ساتھ شامل ہوا۔ ۱۴؍ ذی الحجہ ۱۰۰۰ھ مطابق ۱۲؍ ستمبر ۱۵۹۲ء بدھ وار کو اس کا اس دنیائے فانی سے رشتہ ٹوٹا۔ ۱۸؍ نومبر ۱۵۹۲ء کو صوبہ بہار کے لبسوک پرگنہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے سیکرٹری جناب محمد یوسف ٹینگ کی سعی سے لبسوک میں اس کی قبر کی نشاندہی اور مرمت کے بعد جناب شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھوں لوحِ مزار نصب کی گئی۔

یوسف شاہ چک اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود آج بھی کشمیریوں کی نگاہ میں مغل اعظم شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر سے زیادہ محترم اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس کو کشمیر کا آخری آزاد اور خود مختار تاجدار تسلیم کر کے وہ اس کا نام بڑی عقیدت و احترام سے لیتے ہیں۔

گو کہ یوسف شاہ چک کی گرفتاری کے ساتھ ہی کشمیر کی آزادی اور خود مختاری کا باب ختم ہوا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بادشاہ کی گرفتاری کے باوجود کشمیریوں نے بڑی جرأت اور پامردی کا ثبوت دیتے ہوئے من حیثیت القوم یعقوب شاہ چک کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ اس سے قبل جو سنی مسلمان چک حکومت کے خاتمے کی دعائیں مانگتے تھے یعقوب شاہ چک کے ہمدرد اور کشمیر کی آزادی کے محافظ و پاسبان بن کر سامنے آئے۔ یعقوب شاہ نے علی ڈار کو وزیر اعظم کا عہدہ سونپا۔ لیکن اس نے اتحاد المسلمین سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اپنی کوتاہ اندیشی سے قاضی الوقت قاضی موسیٰ سے یہ جانتے ہوئے کہ وہ حنفی مسلک کے پیرو ہیں اذان کے معاملے پر جھگڑا مول لیا۔ اختلافات نے شدّت اختیار کی اور لوگ مقناطیسی کشش کی طرح قاضی صاحب کے گرد جمع ہونے لگے۔ حالات بد سے بدتر ہوئے اور بغاوت پھوٹ پڑی۔ وزیر اعظم علی ڈار بھی باغیوں کے ساتھ مل گیا۔ اس کی جگہ محمد بٹ نے لی۔ شمس چک، علم شیر ماگرے اور علی ڈار نے یعقوب شاہ کی معذولی کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ شمس چک کپواری کا نام نئے بادشاہ کے طور پر تجویز

کیا۔ دونوں جانب کی فوجیں نوہٹہ کے میدان میں صف آرا ہوئیں۔ سات دن تک خونریز جنگ کے بعد میدان یعقوب شاہ کے ہاتھ رہا۔ شمس چک قید اور قاضی موسوی[1] شہید کر دئے گئے، جس نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ انتشار اور افراتفری کے عالم میں محمد بٹ کی جگہ نازک بٹ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا جس سے حالات اور بھی بگڑ گئے۔

کشمیر کی اندرونی بغاوتیں، طوائف الملوکی اور انتشار کی خبریں اکبر بادشاہ کے حوصلوں کو بلند سے بلند تر کر رہی تھیں۔ چنانچہ اُس نے ان موافق حالات میں تسخیر کشمیر کے سلسلہ میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے اپنے نامور فوجی جرنیلوں فتح خان، شیخ سکندر، گوجر خان، مرزا اکبر شاہی، شیخ دولت خنجری، بہزاد بیگ کو قاسم خان اور حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کی قیادت میں پیش قدمی کا حکم دیا۔ یعقوب شاہ اور مغل فوج کا مقابلہ پیر پنچال میں بڑوت کے قریب ہوا۔ اس جنگ میں یعقوب شاہ کی فوج کے اکثر افسران نے میدان جنگ میں مغلوں کا ساتھ دیا۔ سرینگر میں شمس چک، کے بیٹے ظفر چک نے علم شیر ماگرے سے ملکر قید خانے پر حملہ کیا۔ شمس چک اور محمد بٹ کو رہا کر کے انتقام گیری اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ یعقوب شاہ کیلئے اب نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والا معاملہ تھا۔ آگے جائے تو مغلوں کے ہتھے چڑھنے کا ڈر اور پیچھے مڑے تو اپنوں سے قتل ہونے کا خطرہ۔ لاچار ہو کر کشتواڑ کی طرف فرار ہوا۔ یہ خبر سرینگر پہونچتے ہی حسین خان ولد ایبہ خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ وہ چار دن تک بادشاہ بنا رہا اور جب شمس چک سرینگر پہونچا تو اُس نے حسین خان کو معزول کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ شمس چک کے بیٹے ظفر چک نے زڈی بل کو نذر آتش کیا۔ ابھی سرینگر میں یہ سلسلے جاری ہی تھے کہ ۱۷، ذی القعدہ ۹۹۴ ہجری بمطابق ۲۰، اکتوبر ۱۵۸۶ء کو مغل سپہ سالار قاسم خان بحیثیت فوجی گورنر سرینگر میں داخل ہوا۔ بیشتر اہل شہر نے مغل افواج کا استقبال کیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یعقوب شاہ چک نے مغلوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی۔ اس دوران مغل گورنر قاسم خان کی مطلق العنانیت سے کشمیری امرا کی ایک جماعت بدظن ہو چکی تھی وہ یعقوب شاہ

---

[1] اُنکی قبر بلہ کھاہ سرینگر میں موجود ہے

کا ساتھ دینے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ قاسم خان نے اُن کی املاک ضبط کیں اور انہیں جلاوطن کر کے دہلی بھیجا۔ ان میں سید حسین خان بیہقی، علی ڈار، لوہر چک، اسماعیل دھوبی وغیرہ شامل تھے۔ ان حالات نے اکبر بادشاہ کو پریشان کیا۔ اُس نے بابا خلیل اللہ اور محمد بٹ کو جو مغل افواج کے کشمیر میں داخل ہوتے ہی دہلی بھاگ گئے تھے، اپنے پاس بلا کر مرزا یوسف خان کی لشکر کے ساتھ کشمیر بھیجا۔ تاکہ بابا خلیل اللہ اور محمد بٹ شیعہ اور سنّی فرقے کے مسلمانوں پر دباو ڈالیں۔ اِس موقعہ پر یعقوب شاہ چک کے سپہ سالار ملک محمد حسن چاڈورہ نے اُسے مشورہ دیا کہ مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے شمس چک کو پہاڑی دروں پر تعینات کیا جائے تاکہ وہ مرزا یوسف خان کی پچیس ہزار کی لشکر پر شب خون مار کر اُسے تباہ کرے۔ یعقوب شاہ نے یہ تجویز رد کرتے اُس کے بھائی لوہر چک کو اِس مہم پر بھیجا۔ لیکن وہ بابا خلیل اللہ کی ہدایت پر بیرہ پورہ میں مغل افواج میں شامل ہوگیا۔

اس طرح دونوں ہی فرقوں نے اپنے اپنے طرز عمل سے مغل قبضہ کو کشمیر پر مضبوط و محفوظ بنانے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر مدد کی۔ مرزا قاسم خان نے ۹۹۴ھ بمطابق ۱۵۸۵ء بمطابق ۱۶۴۲ بکرمی گیارہ ماہ دس دن کشمیر پر حکومت کر کے مرزا یوسف خان کو ۹۹۵ھ میں اقتدار منتقل کیا۔ مرزا یوسف خان نے اپنے دو سال چھ ماہ سات دن کی حکومت میں مغل حکومت سے احتمالِ دشمنی رکھنے والوں کو بھی تہہ تیغ کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ۹۹۶ ہجری میں شہنشاہ اکبر پہلی بار کشمیر آئے اور واپسی پر اُن تمام کشمیری امرا کو جنہیں قاسم خان نے جلاوطن کیا تھا، جاگیریں عطا کیں۔ اکبر بادشاہ کے قیام کشمیر کے دوران ہی مرزا یوسف خان نے یعقوب شاہ چک سے عہد و پیماں کر کے اُسے اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اور شہنشاہ اکبر کے حکم سے وہ مرزا یوسف کے ساتھ دہلی بھیجا گیا۔ جہاں مالیخولیا کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا اور ۶، محرم ۱۰۰۲ھ دوشنبہ مطابق ۲۲، ستمبر ۱۵۹۲ء بسوک میں یوسف شاہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اکبر بادشاہ نے اُسے پان میں زہر دے کر ہلاک کروایا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ کشتواڑ میں اُس کے بھائی نے اُسے زہر دے کر ہلاک کیا اور کشتواڑ میں ہی دفن ہے۔ بہرکیف یعقوب شاہ چک کے انتقال کے ساتھ ہی خاکِ کشمیر میں چھپی ہوئی وہ آخری چنگاری جس کی ضیا لئے سولہویں صدی کے آخر میں

کشمیری مجاہدین آزادی مغلوں کے خلاف برسرپیکار ہوتے تھے ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

مرزا حیدر گورگانی نے حنفی مسلک کے مسلمانوں کی حمایت اور امداد سے دس سال تک کشمیر پر حکومت کی اور مغلوں پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ کشمیری کوئی مافوق الفطرت قوم نہیں جن پر حکومت نہیں کی جاسکتی۔ یہ حقیقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مغلوں کے ہندوستان میں وارد ہوتے ہی اُن کی نظریں کشمیر کی زرخیز اور دلفریب خطہ پر لگی ہوئی تھیں۔ بابر کو موت نے فرصت نہیں دی۔ ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے تابڑ توڑ حملے نے اس قابل نہ رکھا کہ وہ سرزمین کشمیر کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھے لیکن وہ موقع کی تاک میں بیٹھے تھے۔ حسین شاہ چک نے جلال الدین اکبر کیلئے کشمیر میں مداخلت کی راہیں ہموار کردیں۔ اس کے باوجود اگر سلاطین چک تدبّر اور فہمیدگی سے کام لے کر رواداری، عدل و انصاف سے کام لیتے تو یہ یقینی بات تھی کہ مغلوں کو سرزمین کشمیر پر قبضہ کرنے کیلئے اپنی عظیم الشان سلطنت کی بازی لگانی پڑتی۔ اور اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کیلئے غالباً وہ کبھی تیار نہیں ہوتے۔ لیکن سلاطین چک کی غلط پالیسیوں نے مغلوں کی مشکلات میں آسانیاں پیدا کیں۔ اور وہ کشمیریوں کی باہمی چپقلش اور نااتفاقی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے۔۔

کتابیات

۱۔ کشیر (جلد اوّل)	جی، ایم، صوفی
۲۔ کشمیریز فائٹ فار فریڈم	محمد یوسف صراف
۳۔ کشمیر انڈر سلطانز	محب الحسن
۴۔ تاریخ رشیدی	مرزا حیدر
۵۔ تحریک حرّیت کشمیر	رشید تاثیر
۶۔ تاریخ بہارستان شاہی	
۷۔ تاریخ لداخ	مولوی حشمت اللہ خان
۸۔ تاریخ کشمیر	خواجہ اعظم دیدہ مری
۹۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ مغل پیریڈ۔	ونسنٹ سمتھ
۱۰۔ سلطان یوسف شاہ چک	محمد یوسف ٹینگ، مطبوعہ کلچرل اکادمی
۱۱۔ منتخب التواریخ	ملا عبدالقادر۔ ترجمہ محمد احمد فاروقی

مرغوب بانہالی

سرینگر اور مغل سلاطین

مغل سلاطین کو تواریخ میں سلاطین چغتائیہ اور سلاطینِ تیموری کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے گرمائی دارالخلافہ، خطۂ جنت نظیر کے دِل اور عروس البلاد شہر سرینگر کے ساتھ مغل سلاطین کو امیر تیمور گورگانی کے زمانے سے ہی ایک معنی خیز وابستگی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۲۹۸ء عیسوی میں جب امیر تیمور محمود تغلق کا تخت اُلٹنے کیلئے افغانستان کے راستے دلی پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے آگے بڑھا[1] اور دلی کو فتح کر کے دوسرے ہمسایہ خودمختار حکمرانوں کو پیغام اطاعت بھیجے گئے تو ایک وفد کشمیر کی جانب بھی روانہ کیا گیا تھا جس میں امیر تیمور کے خاص اعتماد والے لوگ شامل تھے۔ وفد میں اُس وقت کے دارالخلافہ کشمیر قطب الدین پورہ (سرینگر) تک پہنچنے والے امیرزادہ رُستم اور مولانا نورالدین بطور سربراہ شامل تھے[2]

اس بات کی شہادت مولانا شرف الدّین علی یزدی کی معاصر تاریخی سند ظفر نامہ سے ملتی ہے کہ تیموری وفد شہر سرینگر میں داخل ہو جانے کے بعد سلطان سکندر سے ملاقی ہوا تھا[3] انہوں نے تقاضائے خراج کے اعداد

---

[1] تاریخ ہند (مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۹ء) ص ۱۲۸

[2]، [3] ظفر نامہ (مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۸۸ء) ص ۱۶۳

وشمار سلطان سکندر کے سامنے اس قدر مبلغے کے ساتھ بیان کئے تھے کہ بعد میں پتہ چل جانے پر امیر تیمور نے اراکین وفد سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور خراج کی فرمائش میں ترمیم کے احکام جاری کر دئے تھے۔ مغلوں کے پیشرو امیر تیمور کی جانب سے سرینگر میں وارد ہونے والے اس تاریخی اہمیت کے حامل وفد سے متعلق ظفر نامہ کا فکر انگیز۔ اقتباس من وعن درج کیا جاتا ہے:۔

"وازجملہ امیرزادہ رُستم ومعتمد زین الدّین کہ از دہلی برسم رسالت بطرفِ کشمیر رفتہ بودند۔ درصحبت ایشان احکام لازم الاتباع بنام شاہ اسکندر والیٔ آنجا (کشمیر) نفاذ یافتہ۔ درآن منزل با ایلچیان شاہ اسکندر باردوی اعلیٰ رسیدند وعرضہ داشتند کہ شاہ اسکندر احرام بندگی بستہ روی نیاز بقبلۂ اقبال وکعبۂ آمال آوردہ بود۔ وبموضع جبہان رسیدہ دران مرحلہ مولانا نورالدّین کہ از جانب او برسالت آمدہ بود بلوی بپیوست وتقریر کرد۔ کہ امرای دیوانِ اعلےٰ مقرر فرمودہ اند کہ سی ہزار اسپ وصد ہزار داست زر ہریک بوزن دوٗ مثقال ونیم از کشمیر نسق نمایند۔ وبجہت امتثالِ آن امر بازگشت تا بعد از اتمام آن مہم دیگر بارہ متوجہ شود۔ وباحرازِ سعادت بساط بوس فائز گردد۔ وچون این معنی بسمع عالی رسید۔ رای عالم آرای آن را نہ پسندید۔ ورقم ارتضا برآن نکشید وباز خواست فرمود کہ شاہ سکندر را تکلیف مالایطاق کردہ اند"

امیر تیمور کی جانب سے بھیجے گئے وفد کے ساتھ سیّد محمد مدنی المعروف مدیّن صاحب کا شامل ہو جانا اگرچہ ایک غور طلب معاملہ ہے کیونکہ وفد دہلی سے بھیجا گیا تھا اور سید محمد مدنی زیارتِ حرمین شریف کے بعد سیدھے کشمیر آئے تھے، تاہم امیر تیمور کے وفدِ سفارت سے منسوب اُس سید عالی مرتبت کے بارے میں فراہم کردہ اطلاعات کو پیش نظر رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مورّخ حسن کھویہامی نے اپنے سے پیشتر کی چند تواریخ کے سہارے لکھا ہے:

"سیّد محمد مدنی از منسوبانِ میر محمد ہمدانی است کہ بعد زیارت حرمین الشریفین باتفاقِ سفیر امیر تیمور گورگانی درعہد سلطان سکندر خطۂ کشمیر را رونق بخشید۔ چوں گوشۂ دلپذیر دید اقامت گزید۔ اما برای ادای بعضی عہود رسالت باز توجہ بولایت ماورالنہر نمود وزود رجعت فرمود وچند سال با عیال واطفال درعناواری مقام ساخت۔ وقتیکہ سلطان سکندر از حالات وکمالات او اطلاع یافت۔ بکمال الحاح وابرام متصل

دولت خانہ خود مسکن ایشان قرار داد و خانقاہی عجیب برای خادمانِ ایشان بنا نہاد"

سلطان سکندر سے بیشتر امیر تیمور کے سفارتی وفد کے ساتھ سید محمد مدنی کے تعلقات کس نوعیت کے رہے ہیں، یہ ایک الگ موضوعِ بحث ہے۔ البتہ اس بات کی توثیق ہو جاتی ہے کہ اس مغل کے ہم عصر سید محمد مدنی نے رعناواری اور نوشہرہ میں فارسی زبان و ادب اور مذہب اسلام کی خدمت کے اہم ادارے قائم کر لئے تھے۔

امیر تیمور کے عہد میں سرینگر شہر میں جو سادات اور علماء ایک یا دوسری وجہ سے وارد ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف شہر سرینگر کی تزئین نو کا اہم کام انجام دیتے ہیں گرانقدر حصہ ادا کیا ہے بلکہ پورے کشمیر کے رنگین تمدن کی تعمیر نو پر اُن کے نقوش اب تک ثبت ہیں۔

امیر تیمور کے بعد جو مغل حکمران شہر سرینگر بالواسطہ وابستگی اختیار کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ شہنشاہِ بابر کا خالہ زاد بھائی میرزا حیدر دغلت چغتائی تھا جس نے کشمیری سلطان نازک شاہ کا خطبہ اور سکہ جاری رکھ کر عرصہ دس سال (اگست ۱۵۴۱ء سے اکتوبر ۱۵۵۱ء) تک حکومت کی تھی اور جس نے ایک طرف اپنے وفاداروں کو نوازنے کے لئے کشمیر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بٹوارہ کرنے کا پہلا اقدام کیا تھا اور دوسری طرف علوم و فنون کو رواج دینے کی سعیٔ بلیغ کر کے لوگوں کی توجہ ایک خاص سمت کی جانب منتقل کرتے ہوئے سلطان زین العابدین بڈشاہ کی فن پروری اور ادب نوازی کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرزا حیدر پہلا مغل حکمران تھا جس کو بہادر کشمیریوں کی سخت جانی کا بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا اور یہیں سے اُس خفیہ انتقام کی خونین داستان شروع ہو جاتی ہے جس کی تکمیل یوسف شاہ چک اور یعقوب شاہ چک کی جلاوطنی اور اکبر بادشاہ کے کشمیر پر قابض ہونے کی صورت میں ہو جاتی ہے۔ میرزا حیدر چغتائی اگرچہ دس سالہ حکومت کے بعد تحصیل بڈگام کے خانپورہ گاؤں کے متصل مارا گیا تھا لیکن آپ کو اپنے چند خیر خواہوں نے سرینگر شہر میں پہنچا کر دفن کیا تھا۔[1]

شہنشاہ بابر اور ہمایوں کے کشمیر پر قابض ہونے کے ارادوں میں اگرچہ میرزا حیدر نے کسی قدر رنگ بھر دیا تھا لیکن ابھی کشمیریوں کو زیر کرنے کی مغل کارروائی پوری طرح بروئے کار نہ آسکی تھی۔ اس اہم کارنامے کے لئے مغل حکمرانوں کی جانب سے جس شاطری کی ضرورت تھی وہ دربارِ اکبری سے البتہ چند باکمال

---

[1] کشمیر ج ۱، ص: ۲۰۴

استادوں کے بغیر ممکن نہ تھی، چنانچہ یکم ذی قعدہ ۹۹۴ھ (مطابق ۴، اکتوبر ۱۵۸۶ء) تاریخ کشمیر کا وہ تاریک دن واقع ہوا جب مقامی شہمیری سلاطین کے بعد مقامی چک سلاطین کا بھی خاتمہ ہوگیا اور اکبر بادشاہ کا قبضہ کشمیر پر مستحکم ہوگیا۔[۶]

کشمیر پر اکبر کے قابض ہوجانے کا فخر شہنشاہ جہانگیر نے مقامی سلاطین کا نام سرے سے حذف کر کے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ”ملکِ کشمیر زمانہ قدیم میں راجاؤں کے زیرِ حکومت رہا ہے لیکن ۹۹۴ھ میں حضرتِ عرش آشیانی (اکبر) نے اس کو فتح کیا۔ جب سے لیکر اب تک یہ ہماری سلطنت کے امراء کے زیرِ انتظام ہے۔“[۷]

شہنشاہ اکبر خود کشمیر میں ۱۵۸۹ء میں وارد ہوا۔ تب تک کشیریوں کی بہادری کچلنے کے بہت سے ہتھکنڈے آزمائے گئے تھے اور قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا تھا۔ البتہ شہر سری نگر میں مغلوں کو ابھی عظمت کا نشان کشمیریوں کی چھاتی پر گاڑنا باقی تھا۔ سو وہ گاڑنے کے لئے اور اپنی برتری کا اظہار کرنے کے لئے شہر کے متصل ایک عالیشان قلعہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کی تعمیر کا محرک کئی سال بعد شروع ہوئے اس قحط کو قرار دیا گیا جو مغلوں کے کشمیر پر قابض ہوجانے کے دس سال بعد ۱۵۹۶ء میں رونما ہوا تھا۔ یہ قلعہ کوہِ ماران (سانپوں کی پہاڑی) المعروف ہاری پربت پہاڑی پر تعمیر کیا گیا اور اس پوری پہاڑی کے گرد ایک اونچی سنگین دیوار تعمیر کرنے کا کام بھی ہاتھ میں لیا گیا۔ اس پوری تعمیر کو قلعہ ناگر نگر کوٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگرچہ اکبر نے پہلے دورۂ کشمیر کے وقت ہی اپنے گورنر سید یوسف خان کو قلعۂ ناگر نگر تعمیر کرنے کی ہدایت دی تھی لیکن یہ تعمیر التوا میں پڑ جانے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کشیری قوم کی بجھی ہوئی راکھ میں ابھی کہیں کہیں سے چنگاریاں نمودار ہو رہی تھیں اور مغلوں کو وہ فراغت میسر نہ ہوسکی تھی جو ایک مغلوب قوم پر اپنی برتری اس ڈھنگ سے ظاہر کرنے کیلئے، جو وہ اُن کے سر پر ایک بڑا قلعہ تعمیر کر سکتے۔ وہ بھی اس طرح کہ مغلوبِ کشیری

---

[۶] کشیر ج ۱ ضمیمہ ص ۳۸

[۷] تزکِ جہانگیری (چھاپ لاہور ۱۹۶۷ء) ص ۳۸۵

ملنے والی تھوڑی سی اُجرت کو مغلوں کی امداد سمجھ سکتے۔ البتہ جب قحط اور وبا جیسے آفات سماوی نے کشمیر میں مغل اقتدار کی علامت قائم ہونے کی زمین ہموار کر لی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے تو تیر و کمان سے آراستہ رہنے والے صفِ شکن کشمیری بھوک اور بیماری کے ہاتھوں رسی اور بوری سر پر اٹھانے والے مزدور بن جانے پر مجبور ہو گئے۔ آج کے کشمیریوں کے اُنہی مزدور آبا، واجداد نے اس پہلی مغل یادگار کے پتھر نہایت کم اُجرت پر ڈھونے اور چُنے تھے۔ اس پہلی مغل فصیل میں تین بڑے دروازے رکھے گئے تھے جو اب تک سنگین دروازہ، باچھی دروازہ اور کاٹھی دروازہ کے نام سے معروف ہیں۔ کاٹھی دروازے کی محراب پر مغل شہنشاہ کے شوقِ تعمیر کی ترجمانی اور تعمیری کام کی تفصیل پیش کرنے والے یہ فارسی اشعار کندہ ہیں ؎

بنای قلعۂ ناگر نگر شد — بحکم پادشاہِ دادگستر
سر شاہانِ عالم شاہ اکبر — تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر
شہنشاہی کہ در عالم مثالش — نبود است و نخواہد بود دیگر
کرور دہ لک از مخزن فرستاد — دو صد اُستادِ ہندی جملہ چاکر
نکردہ ہیچکس بیگار آنجا — تمامی یافتند از مخزنش زر
بچہل چار از ظہور پادشاہی — ہزار و شش ز تاریخ پیمبر

بنای قلعۂ ناگر نگر بعونِ اللہ — بحکم حضرت ظل اللہ اکبر شاہ
بسعیٔ خواجہ محمد حسین گشت تمام — حقیر بندہ از بندہای اکبر شاہ
بقای دولت این شاہ تا ابد بادا — بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

جہانگیر نے شہر سرینگر میں قائم کی گئی اس پہلی مغل یادگار کے متعلق لکھا ہے:

"شہر سے متصل ایک پہاڑی ہے جسے کوہِ ماران کہتے ہیں۔ اسے ہری پربت کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اس کے مشرق کی جانب ڈل واقع ہے۔ میرے والد بزرگوار کے عہد میں یہاں پتھر اور چُونے

سے ایک مضبوط قلعے کی تعمیر شروع کی گئی تھی جو میرے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ قلعہ اتنا بڑا ہے کہ پہاڑی اس کے اندر آگئی ہے۔ اس کے پاس دولت خانہ بنایا گیا ہے۔ ...... عمارت کو نادر روزگار مصوّروں کی نقاشی سے نگار خانۂ چین بنا دیا گیا ہے۔ میں نے اس باغیچے کا نام نور افزا رکھ دیا ہے۔"[1]

اکبر کے جن ہم سفر اور ہم نشین شعراء نے سرینگر میں کچھ دیر قیام کرنے کی سعادت پائی تھی۔ اُن میں ملک الشعراء فیضی اور آتش نوا عرفی شیرازی کا نام سرفہرست ہے۔ دونوں کی مدحِ کشمیر میں سرینگر شہر سے متعلق تاثرات کا عکس جمیل بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فیضی نے کشمیر کے متعلق کہا تھا ؎

هزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر   که بارِ عیش کشاید بعرصۂ کشمیر
تبارکَ اللہ ازان عرصه که دیدن او   ورق نگارِ خیال است و نقشبند ضمیر
غبار او بتوان خواند چشم را دارو   گیاهِ او بتوان گفت روح را اکسیر
دیارِ دلکشِ کشمیر را مسخر کرد   بدان صفت که سلیمان پری کند تسخیر

اور عرفی شیرازی یوں مچل اُٹھا تھا:۔

هر سوخته جانی که بکشمیر در آید   گر مرغ کباب است که با بال و پر آید
بنگر که ز فیضش چه شود گوهر یکتا   جایی که خذف گر رود آنجا گهر آید
این سبزه و این چشمه و این لاله و این گل   آن شرح ندارد که به گفتار در آید

جانباز اور سر فروش کشمیریوں کو کچل کر اس وادیٔ گل و لالہ کو اپنے مست اور مغرور ہاتھیوں کے قدموں تلے روندنے والے مغلوں کے درباری شاعروں کے یہ قصیدہ ہائے کشمیر اُس وقت کے حساس مگر دبے ہوئے فرزندانِ سرینگر کے لئے نشتر اور زہر خند بن گئے تھے۔ اکبر کے بعد عاشقِ کشمیر جہانگیر کا دور شروع ہوا۔ گو اُس کی رگوں میں مغل خون ہی گردش کر رہا تھا۔ مگر اُس کے دل میں ذوقِ سلیم نے نئی طرح سے انگڑائی لینے کی سعادت پائی۔ چنانچہ اُس نے اس خطے کو سنوارنے اور نکھارنے میں محض سیاسی مقاصد سے کام نہیں لیا۔ بلکہ بڈشاہی روایت کو اپنانے

---

[1] تزکِ جہانگیری ص ۳۸۶

کی سعادت ظاہر کر کے نکھرے ہوئے ذوقِ لطیف کا مظاہرہ بھی کیا، چنانچہ جہاں وہ کشمیر کے گرد و نواح کا مداح بنا وہاں وہ شہر سرینگر کی شائستگی میں بھی سرگرمِ عمل ہو گیا۔ کبھی نذرِ آتش ہو جانے والی عظیم جامع مسجد کی آگ بجھانے اور تعمیرِ نو کرانے کے لئے پیدل وہاں جا پہنچا اور کبھی شہر سرینگر کو اپنی عروسِ تمنا کی صورت میں ابھارنے کے لئے ملکۂ نورجہاں کی شایانِ شان قدمگاہ بنانے کیلئے مشغولِ باغبانی دکھائی دینے لگا۔ کبھی ویری ناگ میں مرجانے کی تمنا ظاہر کرتا رہا اور کبھی شالامار سے اُتر کر جھیل ڈل میں چاندنی رات میں کشتی رانی کرنے کے خواب دیکھتا رہا۔ ایک ہم عصر شاعر طغرائی مشہدی نے جہانگیر کی کشمیر پسندی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

از شاہ جہانگیر دمِ نزع چو جُستند
باحسرتِ دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

جہانگیر خود شہر سرینگر کے متعلق ایک جگہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔

" اس شہر کا نام سرینگر ہے۔ دریائے جہلم اس کے درمیان سے گذرتا ہے۔ شہر میں ایک عالیشان (جامع) مسجد ہے جو ۷۹۵ھ میں سلطان سکندر نے بنوائی تھی۔ شہر کے متصل دو بڑی بڑی جھیلیں ہیں۔ اس شہر میں لوگوں کی آمد و رفت کشتیوں سے ہوتی ہے۔"[۱]

شہنشاہ جہانگیر نے کشمیر کے حسن کا ہر پہلو بنظرِ غائر دیکھا ہے۔ سرینگر شہر کی بادام واری بھی اُس کو مسحور کرتی رہی ہے اور شہمیری اور چک دور میں تعمیر کی گئیں لکڑی کی عظیم عمارتیں بھی اُس کو جاذبِ نظر معلوم ہوئی ہیں اور ان مکانوں کے خس پوش چھتوں پر اگائے گئے لالے بھی جہانگیر کو خوشنما لگتے رہے ہیں۔ چنانچہ کشمیر کو بادشاہوں کے لئے ایک گلشن اور درویشوں کے لئے ایک دلکش سرائے قرار دیتے ہوئے شہر سرینگر کے حصے میں آئے ہوئے مختلف رنگہائی تمدن کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے " بادام اور آڑو کے شگوفے یہاں کے بہترین شگوفے خیال کئے جاتے ہیں۔ کشمیر میں عمارتیں لکڑی سے تعمیر کی جاتی ہیں اور تقریباً چار چار منزلیں ہوتی ہیں۔ یہاں پر مختلف اقسام کے پھول دیکھنے میں آتے ہیں۔ کشمیریوں کی غذا چاول ہے "[۲]

جہانگیر کے دور میں جہاں چشمۂ ویری ناگ سے بارہمولہ تک مختلف قسم کے تعمیری منصوبے ہاتھ میں لئے لئے گئے وہاں شہر خاص سرینگر میں بھی کئی تعمیرات پر کام شروع کیا گیا تھا ان میں سرِفہرست باغ شالامار اور باغ نشاط

---

[۱]، [۲] تزکِ جہانگیری ص ۳۸۵

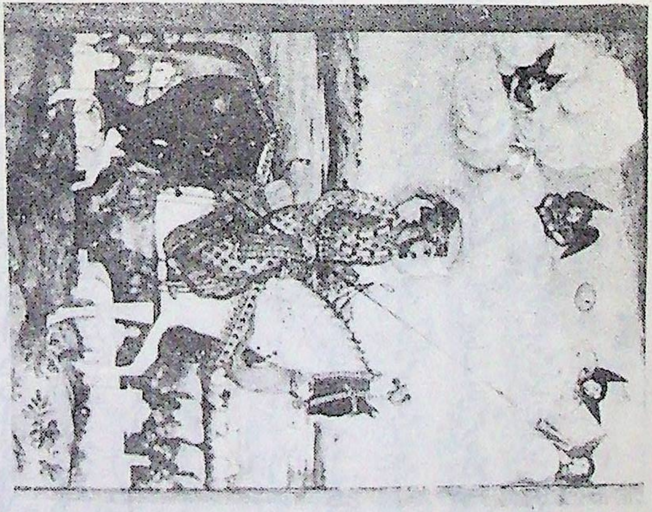

گھوڑ سوار شاہجہان (مغل قلم — انیسویں صدی)

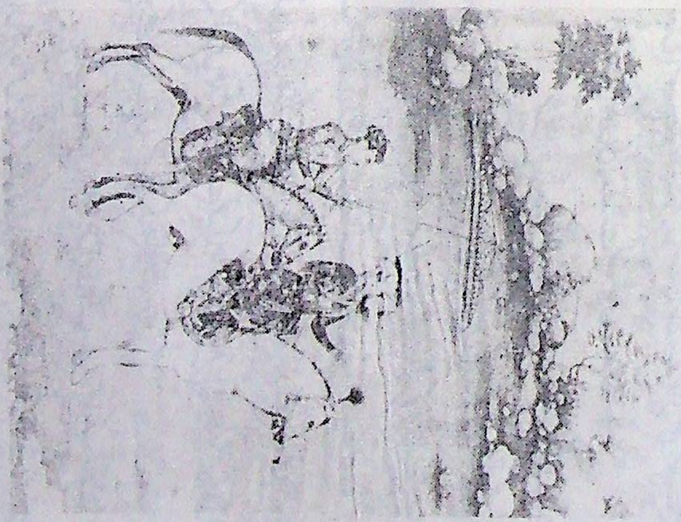

دو گھوڑ سوار ۔ نوجوان اور دارا شکوہ

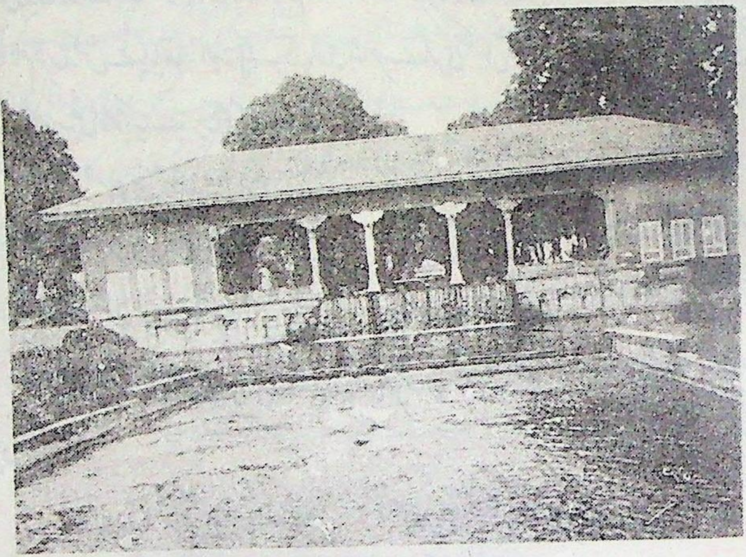

بارہ دری شالیمار۔ سری نگر

آج تک شہر سرینگر کی سحر کاریوں میں اضافہ کرنے کے ضامن ہیں۔ جہاں تک شالامار باغ کا تعلق ہے اس کی تعمیر کی تمنا اکبر بادشاہ نے بھی کی تھی۔ البتہ اُس کے عہد میں صرف باغ کی چار دیواری تیار کی جا سکی تھی، آخر جہانگیر نے اپنے فرزند دلبند شہزادہ خرم (شاہجہان) کی نگرانی میں اس باغ کو تعمیر کرنے کا منصوبہ ۱۰۲۶ھ ہجری میں شروع کرایا اور کاریگروں کو رات دن مشغولِ کار رہنے کا حکم دے کر ۱۰۳۰ھ ہجری میں باغِ شالامار کو مکمل کرایا گیا۔ شاہی سطح پر اس باغ کا نام فرح بخش طے پایا تھا۔ البتہ ایک درباری شاعر نے تاریخِ تکمیل برآمد کرنے کے لئے اس کو فرحت بخش شاہی کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے ؎

چو شُد آراستہ باغِ فرح بخش . بحکمِ حضرتِ ظلِّ الٰہی
شہنشاہِ شہان شاہ جہانگیر کہ مشہور است از مہ تا بہ ماہی
پئی تاریخ این گلزارِ ریحان !! خرد فرمود "فرحت گاہ شاہی"

شالامار کا تیسرا یعنی آخری طبق عہد شاہجہان میں ظفر خان احسن کی نگرانی میں مکمل ہو گیا تو کسی نے تاریخ تکمیل یوں کہی

ازین رو کاشمر فخر جہان است کہ دروی گلشنِ شاہ جہان است
پئی تاریخ سالش صبحگاہی خرد گفتا "مسرت گاہِ شاہی"

جہانگیر کے بعد مغل شہنشاہ شاہجہان نے سرینگر کی تزئین و توقیر کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ اُس کے دور میں بیرونی آرائش سے زیادہ کشمیریوں کو پھر ایک بار اپنی ذہنی آرائش کرنے کا احساس بیدار ہوا اور انہوں نے اپنی برتری ظاہر کرنے کے مواقع ہاتھ سے جانے نہ دئے۔ چنانچہ فنونِ لطیفہ اور ادبیات میں جب شاہجہان نے جہانگیر کی روایت کو استحکام بخشنے کی کاروائی کشمیر میں بھی جاری رکھی تو اُس کے نتائج چند ممتاز کشیری شاعروں، فنکاروں اور صنعت کاروں کی شکل میں نمودار ہونے لگے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عاشق کشمیر جہانگیر نے اکبر کی دو بار کشمیر نوردی کے برعکس کشمیر کا آٹھ بار دورہ کیا تھا اور اس طرح اُس نے اپنی کشمیر پسندی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ اسی طرح شاہجہان نے بھی چار بار کشمیر آکر یہاں کے سلسلہ ہائے تعمیرات میں سرگرمی ظاہر کی تھی۔

مغلوں کی کشمیر نوازی کا بیرونی پہلو جس قدر دلکش محسوس ہوتا ہے کشمیریوں کی کردار کشی کے لئے

مغلوں کے اقدام کا یہ پہلو اُسی قدر دل آزار رہا ہے۔ چنانچہ اکبری عہد کے جابر گورنروں کے انسانیت سوز ادوار کے بعد جہانگیری عہد کے قلیچ خان اور سعادت خان جیسے تشدد پسند گورنروں نے کشمیریوں خصوصاً چکوں کو ہمیشہ کے لئے کچل کے رکھدیا تھا اور شاہجہانی عہد کے گورنروں نے بھی کشمیریوں پر اپنی یہ مشقِ ستمرانی جاری رکھی تھی۔ ماسوائے ایک کشمیر نواز گورنر یعنی محسنِ کشمیر ظفر خان احسنؔ سب مغل گورنر درپردہ کشمیریوں کی حمیّت، قومی غیرت اور یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کی کارروائیوں میں سرگرم رہے ہیں۔ یوں تو شاہجہانی عہد کے گورنر بھی کشمیریوں کو کھلونے دے کر بہلانے کی کارروائی اور آزادی کے بغیر سب کچھ مانگنے کی رعایت سے نوازتے رہے ہیں لیکن جب کبھی اِس کرم فرمائی کا اصلی پہلو کھُل کر سامنے آجاتا تو انسانیت سہم جاتی تھی۔ مغل گورنروں کی عوام نوازی اور خواص کُشی کی غیر محسوس کارروائی کا سلسلہ جب اعتقاد خان تک پہنچا تو حقیقت کھُل کر سامنے آگئی۔ جب گورنر اعتقاد خان کی مشقِ ستم رانی حد سے بڑھ گئی تو ایک غیر کشمیری ہو کر بھی ظفر خان احسنؔ کی انسان دوست روح اس غیر انسانی کارروائی کے خلاف احتجاج پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ جو کشمیری وفد فریاد رسی کیلئے لاہور پہنچا اُسکی ترجمانی کرنے کیلئے احسنؔ نے راہ تیار کر لی اور ملائم ترین الفاظ میں شاہجہان کو کشمیریوں کی حالتِ زار پر متوجہ ہونے کی دعوت اِس طرح دی گئی ؎

خسروا، دانش پژوہا، داورا، دین پرورا
اہلِ کشمیر اند در دیوانِ عدلت دادخواہ
زعفران گویند خندان سازد اندہناک را
آمدند از زعفران در گریہ جمعی بیگناہ

اِن جگر سوز حقائق کے باوجود اس بات سے صرف نظر کرنا ناانصافی ہوگی کہ شاہجہانی عہد میں قصائدِ کشمیر لکھنے اور کشمیر سرائی سے مناظرِ فطرت کی داد دینے کی وہ روایت اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے جس کا آغاز فیضیؔ اور عرفیؔ کے قصائدِ کشمیر سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس عہد کے طالبؔ، کلیمؔ، صائبؔ، قدسیؔ، احسنؔ اور ملا شاد جیسے برگزیدہ شاعروں نے کشمیر کی تعریف میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ یہ اور بات ہے کہ کشمیر کے مناظر سے ہٹ کر اُن درباری شاعروں کی نظر پریشان حال اور مغلوب کشمیریوں کی جانب کم ہی اُٹھی ہے۔ کشمیر سرائی کی دُھن میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرنے والے مناظرِ فطرت کے ان عاشقوں کی نمائندگی

کے لئے محسن کشمیر ظفر خان احسن کے چند شعر نذر قارئین کئے جاتے ہیں: - ؎

کشمیر مگو رشکِ پری خانۂ چین است
القصہ بہشتیست کہ بر روی زمین است

چہ کشمیر انتخاب ہشت جنت
بہار اینجا کمر بستہ بخدمت
چنین تا گلشن ندیدہ چشم اختر
بود خلدش پدر، فردوس مادر
الٰہی تا بود کشمیر آباد
ز گلزارِ خراسانم مدہ یاد
بہر کس ہر چہ خواہد بے سخن دہ
مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

کشمیر کو لوگ، خاص طور پر مغل کیوں چاہتے رہے ہیں۔ اِن اشعار پر غور کرنے سے وہ بات پوشیدہ نہیں رہتی ۔ ایسی چاہت کے پیچھے حق شناسی سے زیادہ حسن شناسی اور فلاح کوشی سے زیادہ عیاشی اور عیش کوشی کا جذبہ کار فرما ہونے کی بات بھی مخفی نہیں رہتی ۔

شاہجہان کے بعد اگرچہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ملکی مسائل میں بہت زیادہ مشغول رہا پھر بھی وقت میسر ہو جانے پر وہ ایک بار کشمیر آیا اور اپنی خرابیِ صحت کی بحالی کے لئے کچھ عرصہ تک یہاں قیام پذیر ہو کر آرام کرتا رہا۔ مشہور فارسی شاعر غنی کشمیری کے ساتھ ملاقات کی خواہش کا اظہار اُس نے اسی قیام کے دوران کیا تھا۔ لیکن غنی کشمیری نے اورنگ زیب کی نیک نامی اور فضیلت کے باوجود دربار کی جانب رُخ کرنا اپنی شانِ استغنا کے خلاف سمجھ کر ملاقات کرنے سے اپنے آپ کو معذور قرار دیا تھا۔ اورنگ زیب کی حکومت کے دوران کشمیر میں مختلف گورنروں کی معزولی اور تقرری چودہ بار عمل میں آئی تھی جو بجائے خود

سیاسی عدم استحکام کا پیش خیمہ ثابت ہوگیا۔ چودہ بار کی تقرریوں میں سے تین بار علی مردان خان کے فرزند ابراہیم خان کی تقرری ہوئی تھی اور دو بار سیف خان بحیثیت گورنر مقرر ہوا تھا۔ ملکی سطح پر بہت سے مسائل کے سر اٹھانے کے باعث اورنگ زیب کشمیر کے بناؤ سنگھار کی جانب زیادہ دھیان نہ دے سکا۔ ویسے بیرونی آرائش کی جانب یوں بھی اُس کی طبیعت کم ہی مائل ہوتی تھی۔ اپنے دورِ حکومت کے آخری حصے میں دکن کی جانب سے بغاوتوں کا زور بڑھ جانے کے سبب اورنگ زیب کے عہد میں کشمیر کی طرف توجہ کرنے کا سلسلہ اور بھی مبہم تھا۔ پھر جب اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت روبزوال ہوگئی تو کشمیر مغل گورنروں کے رحم وکرم پر ہونے کے سبب تردد کے ایک عبوری دور سے دوچار ہوگیا۔ پھر جب اس عبوری دور کا ایک چکر اورنگ زیب کے دو بیٹے اور تین پوتے کام آنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر ختم ہوگیا تو کشمیر کا گورنر ایک خود مختار حکمران کی صورت میں بھی سامنے آگیا اور چوپٹ راج کا تقاضا بھی یہی تھا۔ یہ ایک مسلم امر ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے چار بیٹوں میں سے ایک بھی حکومت کے اہل ثابت نہ ہو سکا۔ اگرچہ جنوری سنہ ۱۷۱۳ء میں بہادر شاہ کے پوتے یعنی عظیم الشان کے فرزند فرخ سیر نے تخت نشین ہو کر مغل سلطنت کو بحال رکھنے کی بہتری کوششیں کیں لیکن غیر ملکی مداخلت غیر محسوس طریقے پر اپنا جال ملک کے کونے کونے میں پھیلا چکی تھی۔ چنانچہ فرخ سیر بھی جلد ہی سید برادران یعنی سید عبداللہ اور سید حسین علی کے ذریعے ترتیب دی گئی سامراجی سازش کا شکار ہوگیا۔ اس طرح سے فرخ سیر کا وہ جذبۂ کشمیر نوازی تھا کہ باوجود بروئے کار نہ آسکا جو اُس کی رگوں میں ایک کشمیری خاتون کا خون ہونے کے ناطے موجزن تھا۔ شاید یہ بات سب کو معلوم نہیں کہ فرخ سیر کی والدہ ماجدہ صاحبہ (صاحبہ نسواں) ایک کشمیری خاتون تھیں اور فرخ سیر کا ماموں عنایت اللہ المعروف شائستہ خان شہر سرینگر کا ہی رہنے والا تھا۔ لیکن افسوس ماموں اور بھانجے کے وہ ارادے تشنۂ تکمیل ہی رہے جو وہ پیشرو مغل گورنروں کی غلطیوں کی تلافی کے لئے رکھتے تھے۔

فرخ سیر کے بعد آخری مغل تاجدار محمد شاہ بُری صحبت اور بُری عادتوں میں پڑ کر اپنی صحت، جوانی، خوبصورتی اور سلطنت کو بُری طرح زوال آمادہ بنانے کا باعث بن گیا۔ اُس کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی طرح کشمیر کا شہر سرینگر بھی لوٹ مار کا مسکن اور بے ضابطگیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اگرچہ محمد شاہ کے عہد میں عنایت اللہ خان کو کشمیر کا گورنر مقرر کر بھی لیا گیا لیکن چونکہ طوفان بدتمیزی سے قابو ہو گیا تھا

اس لئے وہ بھی اپنے شہر سرینگر کو مغلوں کی زوال پذیر سلطنت کے آخری ایام کی تباہ کن صورت حال سے نہ بچا سکا۔ یہیں سے وہ موڑ شروع ہو جاتا ہے جس پر شہر سرینگر مغلوں کا عروج اور زوال دیکھ چکنے کے بعد اغیار کے زیر نگین رہنے کا سفر جاری رکھتے ہوئے افغان سرداروں کی گرفت میں آجاتا ہے۔

قارئین سے گذارش

- "شیرازہ" کے بارے میں اپنی رائے بطور خاص مرحمت فرمائیے اور اپنے مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیے۔
- "شیرازہ" کو اپنے دوستوں سے متعارف کرائیے اور خریداری کے لئے توجہ دلا کر اسے زیادہ سے زیادہ ادب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجیے۔

موتی لال ساقی

کشمیر میں ڈھالے گئے مغل سکّے

وادیٔ کشمیر کو اکبر نے سنہ ۱۵۸۶ء میں چکوں سے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر دیا مگر اصل میں مُغلوں کی آنکھیں بہت پہلے سے ہی اس جنّت نظر وادی پر جمی ہوئی تھیں۔ کشمیر پر مرزا حیدر دوغلات یا مرزا حیدر کاشغری جسے عام کشمیری "مبرزہ کاشکاڑی" کے نام سے جانتے ہیں، کا حملہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ چنانچہ اُس نے کشمیر پر ہمایوں کے نام پر حکومت کی۔ مرزا حیدر کی یاد کو کشمیریوں نے ایک لوک گیت میں اس طرح محفوظ کیا ہے ؎

خابہٕ ئُنزٕ دُچھنکھ مبرزہٕ کاشکاڑی
یا شیخ نورُالدینہٕ یارٕی کر

ترجمہ:۔ (مرزا کاشغری نے تمہیں خواب میں دیکھا
اے شیخ نورالدینؒ دستگیری کر)

اکبر نے جونہی کشمیر کو فتح کر لیا اُسی وقت سے کشمیر میں مغل سکے ڈھالنے کا کام بھی شروع

ہو گیا مگر اس معاملے میں شہنشاہ نے روایت سے انحراف نہیں کیا۔ چنانچہ اکبر کے ابتدائی دور کے کشمیر میں ڈھالے گئے سکے اُسی طرز کے ہیں جو پہلے ہی یہاں مروج تھا۔ اکبر کے زمانے کی کشمیر میں ڈھالی گئی سونے کی پہلی مہر تو چوکور تھی۔ یہ مہر اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ یہ اپنے طرز کی واحد مہر ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہاں پر ایک خاص امر کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے کہ سرینگر کے ضراب خانے یا ٹکسال میں ڈھالے گئے اسی طرز کے چاندی اور تانبے کے سکے اب بھی موجود ہیں۔ یہ بات بھی مصدقہ ہے کہ مغل دور میں بھی سرینگر ہی کشمیر کی راجدھانی تھا مگر اکبر کے بعد ہمیں کسی بھی مُغل سکے پر سرینگر کی ٹکسال کا نام کندہ نظر نہیں آتا بلکہ تمام سکوں پر "ضرب کشمیر" درج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضربیات کے ماہرین نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مغل سکوں پر کندہ "سرینگر" کے ساتھ کشمیر کی راجدھانی "سرینگر" کا کوئی تعلق نہیں بلکہ اس سے مراد وہ سرینگر ہے جو گڑھوال میں ہے۔ ماہرینِ ضربیات کا اندازہ قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ باور بھی، کیونکہ مغل دور میں سرینگر کا ذکر نہ تو تاریخی کتب میں آیا ہے اور نہ ہی یہ نام سکوں پر درج کیا گیا ہے۔ اگر سکوں پر درج سرینگر کا تعلق کشمیر سے ہوتا تو اکبر کی سونے کی مہر پر بھی سرینگر ہی درج ہوتا اور دیگر مغل سکوں پر بھی مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اکبر کی مہر سمیت دیگر تمام مُغل سکوں پر ضرب کشمیر کا ٹھپہ لگا ہوا ہے جو سکوں پر درج سرینگر کو کشمیر سے الگ کر دیتا ہے۔

جہانگیر کے ابتدائی دور میں ڈھالے گئے چاندی کے سکے بھاری تھے مگر ۱۶۱۳ء میں ان سکوں کی جگہ الٰہی طرز کے جہانگیری سکوں نے لے لی۔ شہنشاہ نے قطعۃ ابروج طرز کے دو سکے اپنی حکومت کے پندرھویں سال میں کشمیر سے جاری کئے۔ ان سکوں پر برج جوزا (متحن) کی شبیہہ بھی نظر آتی ہے۔ نور جہاں کے نام سے جاری کی گئی ایک مہر کا بھی کشمیر سے اجرا کیا گیا ہے۔ اس مہر پر سرطان (کرک) کی شبیہہ بنی ہوئی ہے۔ مہر کا اجرا ۱۶۲۴ء میں کیا گیا ہے۔ نثار طرز کا بھی ایک سکہ موجود ہے۔ مگر اس سکے پر کندہ عبارت دوسرے سکوں پر کندہ عبارت سے مختلف ہے۔ شہنشاہ شاہ جہان نے کشمیر کی ٹکسال میں سونے، چاندی اور تانبے کے سکے ڈھلوائے۔ سکوں کی یہ تینوں قسمیں آج بھی دستیاب ہیں اور ملک کے مختلف عجائب گھروں اور ذاتی ذخیروں کی زینت ہیں۔ شاہجہانی روپیہ مروج کلمہ، کلمہ الٰہی اور چوکور طرز میں ہیں۔ شہنشاہ نے نثار طرز کے چاندی کے سکے بھی کشمیر میں ڈھلوائے تھے۔

اورنگ زیب اور شاہ عالم اوّل کے کشمیری طرز کے روپے کے سکّے بھی ملے ہیں۔ جہاں تک سونے کی مہروں کا تعلق ہے اورنگ زیب اور فرخ سیر کی ڈھالی ہوئی سونے کی مُہریں بھی ملی ہیں۔ محمد شاہ نے سونے، چاندی اور تانبے کے سکّے کشمیر کی ٹکسال میں ڈھلوائے۔ عالم گیر ثانی کے روپے کے صرف چند ایک سکّے ہی دستیاب ہو سکے ہیں۔ شاید اُس نے کشمیر کی ٹکسال میں محدود تعداد میں ہی سکّے ڈھلوائے تھے جس کی بنا پر اُن کے زمانے کے سکّے کم تعداد میں دستیاب ہو سکے ہیں۔

احمد شاہ کے دور کا دوبیتی طرز کا ایک سکّہ اسوقت دستیاب ہے۔ یہ سکّہ اپنی طرز کا اوّلین سکّہ ہے۔ سکّے کو راجرس نے افغان بادشاہ احمد شاہ درانی کے کھاتے میں ڈالا تھا مگر وایٹ ہیڈ کا دعویٰ ہے کہ اس سکّے کو اُسی احمد شاہ نے جاری کیا ہے جس کا تعلق مُغل خاندان سے ہے، کیونکہ احمد شاہ درانی کے کسی بھی سکّے پر وہ شعر کندہ نہیں جو شعر دوبیتی طرز کے اس سکّے پر کندہ ہے۔ یہی شعر امتیاز گڈھ کی ٹکسال سے جاری کئے گئے احمد شاہ (مغل) کے سکّے پر بھی کندہ ہے۔ دلائل کی روشنی میں وایٹ ہیڈ کا بیان قابلِ اعتبار ہے کیونکہ امتیاز گڈھ ایک ایسا مقام تھا جہاں تک احمد شاہ دُرانی کی رسائی ناممکن تھی اور تاریخی شہادت کی بنا پر بھی ثابت نہیں ہوتا کہ امتیاز گڈھ کا علاقہ کبھی احمد شاہ درانی کی سلطنت میں شامل تھا۔

اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ مغلوں نے کشمیر کی ٹکسال سے سکّے جاری کر کے اس کی انفرادیت پر آنچ آنے نہیں دی مگر مغل دور میں جو سکّے کشمیر کی ٹکسال سے جاری کئے گئے اور جن کی تفصیلات ہمیں مختلف کتابوں میں ملتی ہیں، وہ سکّے زیادہ تعداد میں اب دستیاب نہیں۔ اس کی تہہ میں جانا اگرچہ اسوقت میرا موضوع نہیں پھر بھی اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہمیں مُغل دور کے اختتام پر جموں کی ٹکسال سے سکّے ڈھلوانے کا حوالہ ملتا ہے۔ مغل سلطنت کا حصّہ بننے سے پہلے یا اکبر سے لیکر شاہ عالم دوّم کے زمانے تک جموں میں کونسے سکّے مُروّج تھے اس بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک اور بات بھی ہے کہ مغلوں کی سلطنت میں شامل ہونے سے پہلے جموں مختلف راجواڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان راجواڑوں میں کونسے سکّے مُروّج تھے اور ان کی کرنسی کیا تھی اس بارے میں ابھی کام کیا جانا باقی ہے۔ کیونکہ سکّے محض دھات کے ڈھلے ڈھلائے ٹکڑے اور لین دین میں سہولت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں

ہوتے، بلکہ سکّوں کی زبان کو پرکھنے سے تاریخ کے ایسے راز افشاء ہو سکتے ہیں جن کا ذکر تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس اعتبار سے سکّوں کو کتبوں کا درجہ حاصل ہے۔ سکّے جہاں ہمیں حکمرانوں کے مزاج، اُن کے زاویۂ نگاہ، اعتقادات اور ذوقِ جمال کا پتہ دیتے ہیں وہاں ہمیں مختلف ادوار میں ہُنرمندی اور کاریگری کے عروج و زوال کا پتہ بھی سکوں کی مدد سے چلتا ہے۔ اسی طرح کسی حکمران کی مالداری اور غربت کا اندازہ اُس کے سکّوں کو پرکھنے سے ہوتا ہے۔ مالدار بادشاہ قیمتی دھات کے سکّے ڈھلواتے رہے ہیں اور قلاش بادشاہوں نے تانبے کا سہارا لیکر کام نبھایا ہے۔ اس طرح سکّے ملک کے مالی استحکام کا اتا پتا دیتے ہیں۔

ضربیات پر بات کرتے ہوئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کا سرسری طور پر جائزہ لیں کہ ہمارے ملک میں جنسی لین دین کی جگہ کس زمانے میں کرنسی نے لی۔ موہنجو ڈارو، ہڑپا اور لوتھل سے جو مہریں دستیاب ہوئی ہیں اور جن کا تعلق وادئ سندھ کی تہذیب کے ساتھ ہے انکے بارے میں ابھی تک مصدقہ طور پر یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ یہ مہریں سکّوں کا کام دیتی تھیں یا لیبلوں کا۔ اس لئے نظریں جاتک کتھاؤں پر آکر ٹھہرتی ہیں۔ جاتک کتھاؤں میں آیا ہے کہ بھگوان بُدھ کی زندگی میں یعنی ۶۰۰ قبل مسیح اور ۴۸۳ قبل مسیح کے درمیان یہاں ایک سکّہ مروج تھا جسے "پُرانا" کہتے تھے۔ یہ سکّہ چاندی کا ہموار ٹکڑا ہوتا تھا جس پر ٹھپا لگا ہوتا تھا۔ اس سکّے کی خاص بات یہ تھی کہ اسے کسی دوسرے ملک کی کرنسی کو سامنے رکھ کر ڈھالا نہیں گیا تھا، اس لحاظ سے اس سکّے کی ایک الگ انفرادیت تھی۔ بعد میں دوسرے ممالک کا اثر قبول کرتے ہوئے سکّوں کی ساخت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ہمارے یہاں کشمیر میں جو سکّے دریافت ہوئے ہیں اُن میں کشان سکّوں کو اوّلیت دی جاتی اور مگر یونانی سرتاپوں کے کچھ سکّے بھی اپنے یہاں ملے ہیں۔ آثارِ قدیمہ کو دیکھ کر اب یہ بات کم و بیش پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کشمیر کسی زمانے میں یونانی سرتاپوں کے بھی زیر نگین رہا ہے۔ اس بات کے پیشِ نظر کشمیر میں حاصل شدہ یونانی سرتاپوں کے سکّوں کو ہی اس سلسلے کی پہلی کڑی مانا جا سکتا ہے۔ کشانوں کے بعد شاہمیری دور تک کشمیر میں ڈھالے گئے تمام تر سکّے کشان سکّوں کی طرز پر ڈھالے گئے ہیں مگر ان سکّوں میں وہ نفاست اور نزاکت نظر نہیں آتی جو کنشک (۷۸ء) کے کچھ سکّوں میں نظر آتی ہے۔ کشمیر میں ڈھالے گئے ہندو دور کے اکثر سکّے یک رنگی کے شکار ہو گئے ہیں اور اُن کا کھردراپن نمایاں ہے۔

ہاں کشمیر سے باہر پائے گئے للتادت (۷۳۱ ۔ ۶۹۵ء) کے سکوں میں فنکاری کی ایک ہلکی سی جھلک ملتی ہے۔

جہاں تک مسلمان بادشاہوں کا تعلق ہے اکثر مسلمان بادشاہوں کے سکے صرف اُن کے عقیدے کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ اُن کے سکوں پر روایتی القاب، سن اور ضراب خانے کا نام کندہ ہوتا تھا حالانکہ ایسے بھی سکے ملے ہیں جن پر نہ سن کندہ ہے اور نہ ٹکسال کا نام درج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبیل کے سکے اُن لوگوں کیلئے کوئی کشش نہیں رکھتے جنکا مشغلہ سکے جمع کرنا ہے۔ یک رنگی کی وجہ سکے نوادرات سے شغف رکھنے والوں اور اور ذوقِ جمال سے آراستہ و پیراستہ لوگ ان سکوں سے کوئی جمالیاتی حظ حاصل نہیں کر پاتے اور انہوں نے ایسے سکے جمع کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ مگر اس اصول کا اطلاق مغلوں پر نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو سکے جاری کئے اُن میں ایک رنگا رنگی ہے جو دامنِ دل کو کھینچ لیتی ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے سکے خاص طور پر اس ضمن خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں۔ اُن کے سکوں پر نستعلیق رسم الخط کا استعمال آرائش اور تزئین کے اعتبار سے ایسے ڈھنگ سے کیا گیا ہے جو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، ساتھ ہی اقلیدس کی علامات اور بیل بوٹیوں سے سکوں کو کچھ اسطرح آراستہ کیا گیا ہے کہ دیکھنے والا داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شہنشاہ اکبر کے سکے اُس کی فراخدلی اور رواداری کی ایک اور جہت کا پتہ دیتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک ایسا سکہ بھی جاری کیا تھا جس پر رام اور سیتا کی شبیہیں بنی ہوئی ہیں۔ اس طرز کے اگرچہ صرف چند ہی سکے برٹش میوزیم میں موجود ہیں مگر یہ سکے اُنکی رواداری کا بلند بانگ ثبوت ہیں۔ ساتھ ہی ان سکوں کا وجود ایک اور سمت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتا ہے کہ سولہویں صدی کے دوران وشنو دھرم شمالی ہندوستان میں پورے عروج پر تھا۔

اپنی حکومت کے پانچویں اور چھٹے سال میں جو سکے جہانگیر نے آگرہ سے جاری کئے اُنکی ساخت آرائش نزاکت اور نفاست اس قدر دلربا ہے کہ انسان کا دل موہ لیتی ہے۔ جہانگیر کے ان سکوں کو دُنیا کے عمدہ سے عمدہ سکوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے سکوں کی ساخت اور سائز متنوع ہے۔ اورنگ زیب اور اُس کے بعد کے مُغل بادشاہوں کے سکوں میں اگرچہ تنوع زیادہ نہیں مگر سائز اور الگ الگ ٹکسالوں میں ڈھالے جانے کی وجہ سے ان فرمانرواؤں کے سکے بھی جاذبِ نظر ہیں اور تاریخی اعتبار سے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اکبر اعظم نے جو سکے کشمیر کی ٹکسال سے ڈھلوائے، روایت کا پاس کرتے ہوئے، اُس نے اُن کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ دوسرے ضراب خانوں میں ڈھالے گئے سکوں کو مروج کرنے کی بجائے اُس نے مقامی ٹکسال کو قائم رکھا۔ اس روایت کو اُس کے جانشینوں نے بھی بنائے رکھا۔ یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا مقامی طور پر سکے ڈھال کر اکبر نے کشمیریوں کی انا کی تسکین کا سامان کیا یا اُسے دوسری ٹکسالوں میں ڈھلوائے گئے سکوں کو کشمیر لانے میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا تھا۔ میری دانست میں اکبر نے کشمیریوں کی انا کو تسکین دینے کیلئے سکوں کے قدیم طرز کو ہی جاری رکھا کیونکہ اُسے کشمیریوں کے ساتھ مقابلہ آرائی میں ہزیمت اُٹھانا پڑی تھی اور وہ انکی انا کو زخمی کرکے مزید خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے یوسف شاہ چک کے ساتھ وعدہ وفا نہیں کیا تھا جس کے نتیجے میں کشمیری ابتدا میں ناراض رہے ہوں گے۔

اکبر نے ۱۵۸۶ء میں جو سکہ کشمیر سے جاری کیا اس پر روایت عربی میں کندہ ہے جب کہ سلطنت کے دوسرے حصوں میں ڈھالے گئے سکوں پر عربی کی جگہ فارسی نظر آتی ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں بھی کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

مغلوں کے زمانے میں ٹکسال لازماً سرینگر میں قایم ہوئی مگر سکوں پر سرینگر کی جگہ کشمیر کندہ ہے۔ سرینگر میں مغل ٹکسال کس جگہ قائم تھی اُس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

مُغل سکوں کی تفصیل

دھات	ٹکسال	چہرہ	پشت	سن
سونا ۱۵۱	کشمیر	حروف کو بڑھا کر بنائے گئے ہیرے کے درمیان۔ کلمہ حاشیوں پر بصدق ابی بکر العدل عمر الحیائی عثمان العلم علی وزن: ۱۶۸ سائز: ۶۵.	.... اکبر بادشاہ غازی محمد شاہ جلال الدین ضرب کشمیر	۹۹۹ھ

چاندی	کشمیر	مہر و ماہ نگر ساخت نورا روی زر را نے بر ۱۰۱۹ کشمیر وزن ۲۱۰ سائز ۰.۸	شاہ ابن اکبر باد نگیر نورالدین جہا شاہ	۱۰۱۹
″	کشمیر	″ وزن ۲۰۹ سائز ۰.۸۵	″	۱۵۲۰
″	کشمیر	″ وزن ۲۱۰	″	۱۰۲۱
″	کشمیر	نگیر شاہ اکبر شاہ جہا نورالدین وزن ۱۷۵ سائز ۰.۸	بہشت ماہ اردی الہی ۸ سنہ کشمیر ۱۰۲۲ ضرب	۱۰۲۲ ۸ اردی بہشت
″	″	″ وزن ۱۷۹	″ شہریور	″ شہریور
″	″	″	″	″ مہر
″	″	وزن ۱۷۴ نگیر شاہ اکبر شاہ جہا نورالدین	مہر اسفندارمز کشمیر ۱۰۲۳ ضرب ″	۱۰۲۳ اسفندارمز ۱۰۲۳ ۹ تیر

		وزن ۔ ۱۷۰	〃	
		〃	۱۰۲۳	
			۹	
〃	〃	وزن ۱۷۵	تیر	
چاندی	کشمیر	〃	〃	۱۰۲۴
		وزن ۱۷۴	۱۰۲۴	۱۰
			۱۰	اذر
〃	〃	〃	〃	۱۰۲۶
		وزن ۱۷۵	۱۰۲۶	۱۲
〃	〃	〃	۱۲ فرددین	فروردین
〃	〃	وزن ۱۷۲	۱۰۲۷	۱۰۲۷
〃	〃	〃	۱۳	۱۲
		وزن ۱۷۴	اذر	اذر
			〃	۱۰۳۱
			۱۰۳۱	۱۷
			۱۷	فروردی
			فروردی	
〃	کشمیر	شاہ نگیر جہاں ۱۰۲۳ وزن ۲۰ سایز ۔ ۳۵	اللّٰہ اکبر کشمیر ضرب ۱۰	۱۰۲۳ ۱۰

״		کلمہ اور الہٰی کشمیر امرداد ضرب	تگنے دایرے کے درمیان بادشاہ غازی شاہ جہاں سنہ احد محمد شہاب الدین ے صاحب قرآن ثا	امرداد
״	״	کونوں پر گانٹھوں سے مزین مربع کے درمیان کلمہ بائیں حاشیے پر بآزرم عثمان وزن ۱۶۹ سایز ۰.۸	چوکور کے درمیان بادشاہ غازی شاہ جہاں ۱۸ بائیں طرف شہاب الدین نچلے حصے میں ضرب کشمیر	۱۸
״	״	مربع کے درمیان جسکے کونوں پر گرہیں ہیں کلمہ ۱۰۶۵ نچلے حاشیے پر بصدق ابی بکر وزن ۱۶۷ سایز ۰.۸۵	بادشاہ غازی شاہ جہاں حاشیوں پر حسب قاعدہ اندراج جو شہاب الدین سے شروع ہوتا ہے نچلے حاشیے پر ضرب کشمیر ۱۰۶۵	۱۰۶۵

چاندی	کشمیر	تگنے دایرے میں بادشاہ غازے شاہ جہان نثار وزن ۴۰ سایز۔ ۵؍۰	تگنے دایرے میں کشمیر ضرب	
″	کشمیر	اورنگ زیب عالم گیر شاہ زد چو بدر منیر سکہ درجہاں	مانوس میمنت ۳۲ سنہ جلوس کشمیر ضرب	۳۲
″	″	″	مانوس میمنت ۳۰ سنہ جلوس ضرب کشمیر	۱۰۱۵ ۳۰
″	″	″	″	۴۵
″	″	″	″	۴۶
″	″		″	۱۱۱۵ ۴۰
″	″	۱۱۱۰ سن بالائی سطر میں کندہ ہے عالم گیر زیب اورنگ ز شاہ زد چو بدر منیر	″	۱۱۱۶ ۹
″	″			۱۱۱۷ ۵۰

		سکہ درجہاں ۱۱۱۷	مانوس میمنت ۵۰ سنہ جلوس ضرب کشمیر	
″	″	بادشاہ غازے عالم بہادر شاہ سکہ مبارک	مانوس میمنت ۲ سنہ جلوس ضرب کشمیر	۲
سونا	″	بحروبر فرخ سیر بادشاہ ۱۱۳۰ حق برسیم وزر فضل سکہ زداز	مانوس میمنت ۳ سنہ طلوس ضرب کشمیر	۱۱۳۰ ۷
		محمد شاہے فلوس سکہ وزن ۲۷۵ سایز ۰۸	۱۹ سنہ کشمیر ضرب	۱۹
″	″	الہ احمد شاہ شاہ عالم پناہ ۱۱۶۲ بفضل سنہ سکہ برزر زد	مانوس میمنت ۳ سنہ جلوس ضرب کشمیر	

″	″	عالم گیر ے نادر شاہ غاز سکہ مبارک سن نچلے حاشیے کے بائیں طرف	مانوس میمنت سنہ جلوس کشمیر ضرب	۱۱۶۹ ۲
		شاہ عالم ۱۱۹۵ ے بادشاہ غازی	دارالامان جموں ضرب سنہ ۲۳ میمنت جلوس مانوس	۱۱۹۵ ۲۳
″	″	″ ۱۱۹۶ ″	″	۱۱۹۶ ۲۴
″	″	۱۱۹۷		۱۱۹۷ ۲۵
″	″	بُھی نرائن دل کرد شاد دلیو آباد کرد رنجیت خانہ سمبت ۱۱۹۹	″	۱۸۴۱ سموت ہجری ۱۱۸۹

جموں میں ڈھالے گئے سکوں کی نسبت اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ جموں کے راجہ رنجیت دیو نے ابتداء میں شاہ عالم دوم کے نام پر سکے ڈھلوائے مگر بعد میں اُس نے اپنے نام کے سکے جاری کئے۔ تاریخ کے درمیانی دور یا عہد متوسط میں جموں میں ڈھالے گئے سکوں کی نسبت کوئی جانکاری نہیں ملتی جو کہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔

عکسِ مضروب

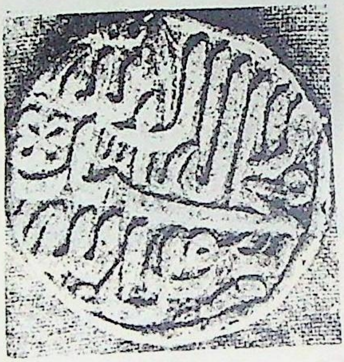

روئے ضربِ اکبرِ اعظم
۱۵۸۶ء

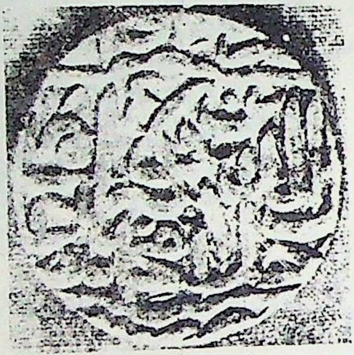

پُشتِ ضربِ اکبرِ اعظم

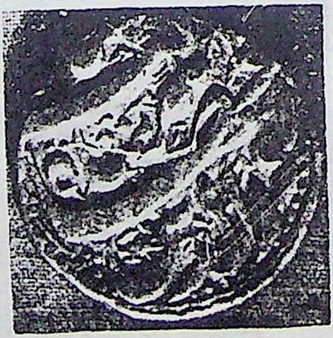

روئے ضربِ جہانگیر
۱۶۰۵ء

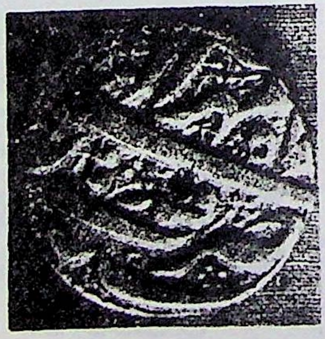

پُشتِ ضربِ جہانگیر

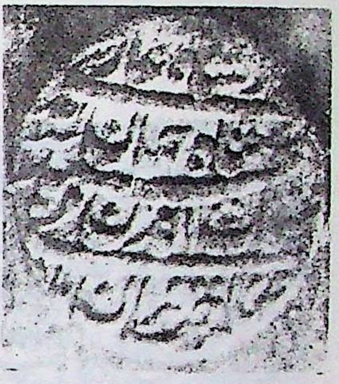

روئے ضربِ شاہِ جہاں
۱۶۲۷ء

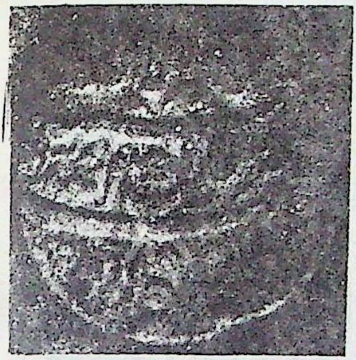

پشت ضربِ شاہِ جہاں

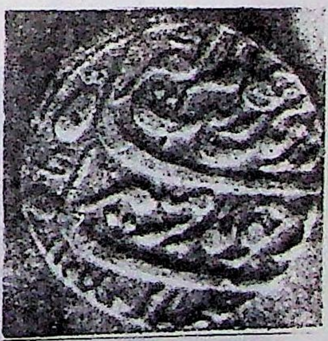

روئے ضربِ اورنگ زیب
۱۶۵۸ء

پشت ضربِ اورنگ زیب

سیّد رسول پونپُر

جہانگیر اور کشمیر

مُغل شہنشاہ محمد سُلطان سلیم، نورالدّین جہانگیر (۱۵۶۹ء - ۱۶۲۷ء)[۱] نے کشمیر کو بجا طور جنتِ ارضی قرار دیا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است ہمیں است

اور شاید اسی لئے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مارچ ۱۶۲۷ء کے دوران چہیتی بیوی نور جہاں، آصف خان شہریار اور دوسرے مصاحب کے ساتھ لاہور سے کشمیر آیا تاکہ عرفی کے شعر کا خود عملی روپ دھار سکے[۲]

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید
گر مُرغ کباب است کہ بابال و پر آید

اور جہانگیر نے کشمیر ہی کو گوشۂ آخرت بنانے کی تمنا بھی کی تھی[۳]

از شاہ جہاں گیر دمِ نزع چو جُستند
با خواہش دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

---

[۱] تاریخ جہانگیر۔ ڈاکٹر بینی پرشاد (ترجمہ رحم علی الہاشمی۔ ترقی اُردو بورڈ۔ ۱۹۷۹ء۔ صفحہ ۱۱ - ۴۲۱ - ۲۔ ایضاً۔ صفحہ: ۴۱۹۔

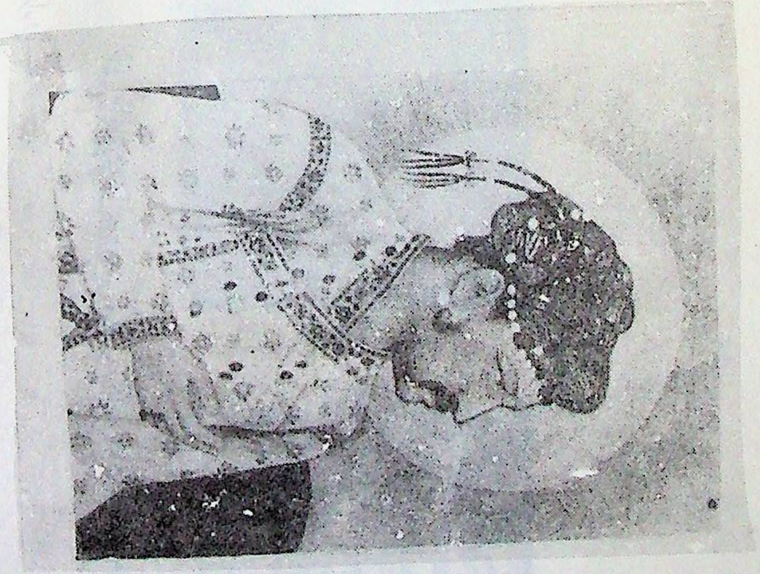

جہاں گیر ــــ (مغل قلم)

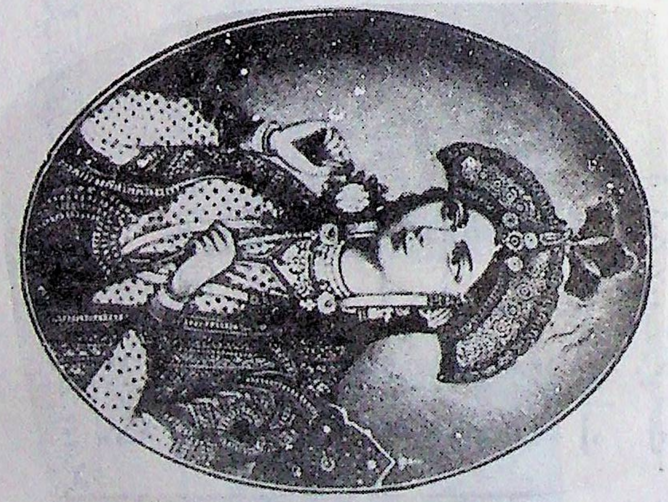

ملکہ نور جہاں

مشیّتِ ایزدی کو شاید یہ اس طور منظور تھا کہ جہاں گیر نے اکتوبر ۱۶۲۷ء میں کشمیر سے واپسی پر جان آفریں کو اپنی جان سُپرد کر دی۔ بقولِ غالب ؎

جان، دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان جہاں دینی تھی دی۔ موت کو بھی بہانہ چاہئے، وہ دن بدن نڈھال ہوتا گیا، یہاں تک کہ شاہ سواری کے قابل بھی نہ رہا اور وہ پالکی کے سہارے ہی اِدھر اُدھر جا سکتا تھا۔ لیکن زندگی کے آخری لمحات کے بیت جانے کے ساتھ ساتھ وہ سرگرم سفر بھی رہا چنانچہ کشمیر سے واپسی سفر پہ جب وہ بیرم کلا[لہ] پہنچا جو اُس کی پُرانی شکار گاہ تھی تو اُسکا جی چاہا کہ وہاں ایک مرتبہ پھر شکار کھیلے اور جیسا ثابت ہوا یہی اُسکا آخری شکار تھا۔

جہانگیر نے اپنی توڑے دار بندوق ایک دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی جو اسی لئے بنی تھی اور ایک ہرن کو نشانہ لگایا جسے گاؤں کے لوگ اُسی طرف ہنکار رہے تھے۔ ایک پیادہ سپاہی جو بادشاہ کے لئے شکار

[لہ] اب اس جگہ کا نام بہرام گلا یا بہرام گلی ہے۔ رچرڈ ٹمپل نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے اور میں نے جہاں جہاں قیام کیا اُن میں سب سے زیادہ اچھی ہے، اسکے قریب پہاڑی سے تیز دھار کا آتا ہوا چشمہ چٹا پانی (جسے سفید پانی کہتے ہیں) ہے یہی دلربا اور سیماب یا آبشار "نوری چھم" کے نام سے مشہور ہے یہ جگہ "نوری چھم" کے نام سے مشہور ہے، "نوری" اسے "نور جہاں" کی نسبت سے کہتے ہیں۔ "چھم" گوجری زبان میں آبشار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دونوں الفاظ کے اتصال سے نوری آبشار بنتا ہے جو شہنشاہ جہانگیر نے اپنی چہیتی ملکہ نور جہاں سے منسوب کیا تھا۔ کول سر اور کٹورہ سر جھیلوں سے نکل کر اور یہاں آ کر اسّی فٹ کی اونچائی سے گرتا ہوا یہ صاف و شفاف پانی نہایت ہی دلربا آبشار کی شکل اختیار کرتا ہے۔ آبشار کے عین مغرب واقع پہاڑی پر شہنشاہ جہانگیر نے ایک قدِ آدم آئینہ اس طرح نصب کروایا تھا تاکہ سامنے والے ایک اور آئینہ میں محوِ آرائش ملکہ نور جہاں کا حسنِ مجسم، حسنِ فطرت سے ہم آغوش ہو کے جلوہ افروز ہوتا تھا جس سے جہانگیر کے ذوقِ جمال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ("پونچھ"، کے، ڈی، مینی۔ مطبوعہ ۱۹۸۰ء)

مہیا کرتا تھا ایک ڈھلوان پہاڑی کے سرے پر کھڑا تھا۔ اُس کا پیر پھسل گیا اور پہاڑی سے نیچے گر پڑا۔ اُس کی ہڈی پسلی چُور چُور ہو گئی۔ اِس حادثہ سے بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے مرنے والے کی ماں کو بُلا کر اُسکی گُذر بسر کیلئے روپیہ دیا مگر اُس کی پشیمانی اور دُکھ میں کسی طرح کی کمی نہ ہوئی اور اُس نے خیال کیا کہ یہ خود اُس کی موت کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ موت کا خیال برابر اُس کے ذہن پہ حاوی رہا اور وہ مایوسی میں ڈوب گیا۔ اُس کی بیماری نے ہمیشہ سے زیادہ سنگین صورت اختیار کرلی۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے نیند آتی اور نہ سکوُن ملتا تھا۔ اس حادثہ کے دوسرے دن شاہی خیمہ تھانہ[1] میں نصب ہوا۔ اگلی منزل راجوری تھی۔ ۲۷، صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۲۹، اکتوبر ۱۶۲۷ء کو وہ بھیم بھار کے قریب چنگیز ہٹلی کی طرف روانہ ہوگیا[2] اُسی رات اپنی فرمانروائی کے بائیس سال، اور عمر کے اٹھاون سال پورے کرکے جان بحق ہوا[3] یہاں سے اُس کے جسدِ خاکی کو نور جہاں کے باغ شاہدرہ لاہور لے جایا گیا جہاں اُسے چُپ چاپ سپُردِ خاک کیا گیا۔ نور جہاں نے اپنے خرچہ سے وہاں ایک شایان شان مقبرہ تعمیر کرایا۔

جہانگیر ۱۰۱۴ھ (مطابق ۱۶۰۵ میلادی) ہر سال کشمیر آتا رہا۔ لیکن مارچ تا اکتوبر ۱۶۲۰ء اُس کا پہلا سات ماہ کا قیام اِس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اِس دوران میں اُس نے کشمیر کے قدرتی حُسن کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ باوجود صحت کی خرابی کے جہانگیر یہاں کے قیام سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اُس نے یہاں کے جتنے بھی تفریح اور خوبصورتی کے مقامات تھے سب دیکھے۔ جیسے کہ ایک فطرت کا گہرا مطالعہ کرنے والے حُسن پرست سے توقع تھی۔ وہ کشمیر سے بہت مسحور ہوا اور دلی مسرت کے جوش کے ساتھ لکھتا ہے کہ "اگر کوئی کشمیر کی تعریف لکھنا چاہے تو پوری کتاب کی ضرورت ہو گی۔ کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے جو شاہی محل کا ایک آہنی قلعہ اور درویشوں کے لئے ایک پھولوں سے لدا ہوا دلفریب ورثہ۔ اس کے خوبصورت مرغزار دلکش چشمے، بے شمار فوارے تعریف سے بالاتر ہیں۔ یہاں بے شمار بہتے ہوئے دریا اور آبشار ہیں۔ جہاں تک نظر جاتی ہے سبزہ زار اور پھول ہیں۔ سرخ گلاب بنفشہ اور نرگس از خود اُگے ہیں۔ میدان میں طرح طرح کے

---

[1] تھنہ منڈی، [2] یہ جگہ آج کل چنگس سرائے کے نام سے مشہور ہے۔ اور سر رچرڈ ٹیمپل نے بھی ۱۸۵۹ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ شاہی قیام گاہ تھی۔ [3] تاریخ جہانگیر۔ صفحہ: ۴۲۰ - ۴۲۱

پھول اور خوشبودار گھاس ہے جس کا شُمار نہیں ہو سکتا۔ روح پرور موسم بہار میں پہاڑ اور میدان پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور دروازے، دیواریں اور صحن لالہ زار ہو جاتے ہیں جہاں ضیافت کا دسترخوان سجانے والے گُلِ لالہ جگمگاتے ہیں اِن وسیع مرغزاروں اور خوشبودار پھولوں کا ہم کیا بیان کریں"[1] یہ جمال پرست بادشاہ پھول چُننے میں بھی مسرت محسوس کرتا تھا۔ ایک اور جگہ وہ یوں رطب الشّان ہے۔

"اِس پھولوں سے بھری ہوئی سرزمین کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، جہاں تک نظر جاتی ہے۔ ہر رنگ کے پھول لہلہاتے ہیں۔ میری موجودگی میں پچاس قسم کے پھول چُنے گئے۔ شاید اِن کے علاوہ اور بھی ہونگے جو میں نے نہیں دیکھے"[2]

اَچھبل کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر نے لکھا کہ اِسکا چشمہ (مچھی بھون، یعنی مٹن) چشمہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اِس کے گرد فلک بوس چنار کے درخت کھڑے ہیں جن کے سر باہم مل کر خوشنُما ستانے کی جگہ بناتے ہیں۔ ایک خوبصورت باغ میں جہاں تک نظر جاتی ہے۔ جعفری کے پھول کھلے ہیں۔ گویا یہ بالکل جنت کا ایک ٹکڑا ہے[3]

پھر چشمہ ویری ناگ کا ذکر ہے جو جہلم کے سرے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے جہاں اپنی شہزادگی کے زمانے میں جہانگیر نے ایک عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ تالاب کا پانی اتنا شفاف ہے باوجودیکہ چار گز (بارہ فٹ) گہرا ہے۔ نہر کی خوبصورتی اور چشمہ کے نیچے گھاس اُگتی ہے اُسکی سرسبزگی کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ مختلف قسم کے پودے اور خوشبودار گھاس یہاں بہ کثرت اُگتی ہے اور اس میں ایک پودے کی ڈنڈی نظر آئی جو ہو بہو مور کی دم کی طرح مختلف رنگوں کی تھی۔ وہ چشمہ کی لہروں میں بَل کھاتی تھی اور کہیں کہیں اس میں پھول بھی تھے۔ مختصر یہ کہ سارے کشمیر میں اِس سے زیادہ خوبصورت کوئی اور جگہ نہیں جو اتنی دلفریب ہو۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں وادی کا اوپری حصہ جتنا خوبصورت ہے اُس کا نشیبی حصہ کی خوبصورتی سے کوئی مقابلہ نہیں۔

---

[1] تُزکِ جہانگیری۔ راجیرس و بیوریج۔ صفحہ ۱۴۲ - ۱۴۴۔ جلد دوم

[2] ایضاً۔ صفحات ۱۶۲۔ ۱۶۳ - [3] ایضاً صفحہ: ۱۷۳

ان علاقوں میں کچھ دن قیام کرنا چاہئے اور قرب و جوار کے مناظر دیکھنے چاہییں۔ میں نے حکم دیا کہ اس چشمہ کے گرد چنار کے درخت لگائے جائیں"[1]

ویری ناگ کے حسنِ فطرت کی تعریف کرتے ہوئے جہانگیر کمراز پر مراز کی فطری برتری کیطرف صریح اشارہ کرتا ہے:

مناظرِ فطرت، دریاؤں، دیہاتوں، وادیوں، پہاڑیوں، پودوں، پھولوں، پرندوں، جانوروں اور لوگوں کا جو حال اُس نے لکھا ہے وہ نہایت شستہ رواں اور خوبصورت فارسی میں ہے جسے لفظ بہ لفظ معاصر مورخین جیسے معتمد خان، اور کامگار نیز بعد کے مورخین جیسے خافی خان، سجان رائے اور دوسروں نے نقل کیا ہے اور آج بھی وہ دلچسپی اور لطف سے پڑھا جا سکتا ہے[2]

پرگنہ لار کے صفاپور گاؤں خاصکر جھیل مانسبل کی بھی وہ بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس جھیل کے شمال میں درختوں سے بھری پہاڑی ہے۔ یہ درخت جھیل میں اپنے عکس سے ایک دلفریب سماں باندھتے تھے کیوں کہ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ خزاں کا حسن و جمال بہار کے حسنِ بوقلموں سے کچھ کم نہیں۔ جہانگیر یہاں کئی روز مرغابیوں کا شکار کرتا رہا بندوق سے نہیں بلکہ شاید جال سے، کیونکہ جہانگیر نے اپنا عہد پورا کرنے کے حوالے سے پچاس کی عمر سے بندوق سے شکار کھیلنا بند کر دیا تھا[3]

جہانگیر اہرہ بل کے آبشار کے حسنِ خداداد میں بھی محو ہو جاتا ہے۔ پامپور (چندہارہ کرلوہ) کے زعفران کے شگوفوں کی بہار دیکھنے بھی گیا۔ جہانگیر تفصیل سے بتاتا ہے کہ زعفران کے پھول کے کتنے حصے ہیں اور یہ کتنی پتیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی کاشت کیسے کی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسوقت زعفران کی پیداوار تین ہزار دو من خراسانی ہے۔ رسم یہ تھی کہ زعفران کی نصف پیدا حکومت وقت کو پیش کی جاتی تھی اور بقیہ نصف کا حقدار کاشتکار ہوتے تھے۔ مروجہ ضابطہ کے مطابق وہ زعفران چن کر لاتے اور اپنے نصف حصہ پیداوار کے عوض نمک لیتے تھے، جو وہ اپنی مزدوری تصور کرتے تھے۔[4]

---

[1] تزک جہانگیری ص: ۱۷۴۔ [2] تاریخ جہانگیر صفحہ: ۲۱۵۔ [3] تزکِ جہانگیری۔ جلد دوم۔ صفحہ: ۱۷۶۔ راجرز د بیوریج۔ [4] تزکِ جہانگیری۔ جلد دوم۔ صفحہ: ۱۷۶۔ راجرز بیوریج۔

زعفران کے شگوفوں کی مہک سے سر درد ہونے کے سلسلہ میں پوچھے جانے پر کارکن کشمیریوں نے نفی میں جواب دیا۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ کشمیری عورتوں میں صاف اور پاکیزہ لباس پہننے کی رسم نہیں۔ پٹو کا کُرتہ سلوانے ہیں جو تین چار سال تک پہنتے ہیں اور پھٹنے تک اسے پانی دیکھنے تک کی نوبت نہیں آتی۔ پاجامہ پہننا عیب سمجھتے ہیں۔ کشمیری اگرچہ دریا کے کنارے پر رہتے ہیں تاہم پانی کی بوند بھی اُن کے جسم کو نہیں چھوتی۔

اُن کا باطن اُن کے ظاہر کی طرح میلا ہے۔ اُبلے چاول جسکو "بھتہ" کہتے ہیں رکھ دیتے ہیں اور سرد ہونے پر کھاتے ہیں۔ گرم غذا کھانے کی عادت نہیں۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ اکبرؔ کے زمانہ سے پہلے کشمیر میں پست قد کا گھوڑا ہوا کرتا تھا جس کو اُن کی زبان میں گونٹ کہتے تھے۔ قدآور اور تیز رفتار گھوڑوں کا رواج یہاں تب ہوا جب اِس نسل کے گھوڑے عراق اور تُرکی سے تحفے کے طور پر بھیجے گئے اور پھر اِن سے قدآور تیز رفتار گھوڑوں کی نسل معرضِ وجود میں آئی۔ جہانگیر اِس بات کو دہراتا ہے کہ مرزا حیدر دوغلات نے کشمیر کی صنعت و حرفت کو بڑی ترقی دی۔ اُس کا یہ بھی کہنا ہے کہ کشمیر میں اہلِ حرفہ اور سوداگر سُنی فرقہ کے لوگ ہیں اور شیعہ لوگ جو امامیہ اور نوربخشیہ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں سپہ گری کرتے ہیں۔ رشیوں کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ اِن میں علم اور معرفت نہیں۔ گوشت نہیں کھاتے، ازدواجی زندگی سے گُریز کرتے ہیں۔ زمین میں میوہ دار درخت لگاتے ہیں۔ اِس زمانے میں اُن کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے۔ کشمیر کے برہمن سنسکرت میں اپنی کتابیں تالیف کرتے ہیں جو بڑی معتبر سمجھی جاتی ہیں[1]

کشمیریوں کے رہن سہن کے بارے میں جہانگیر کے خیالات یک رُخہ اور خسروانہ ہیں کیونکہ صدیوں کی پسماندگی، جغرافیائی اور موسمی حالات، عُسرت و غربت اور محکومیت سے کسی قوم کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر بُرے اثرات پڑنا لازمی ہیں جو چشم زدن میں زائل نہیں ہوتے۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ اُس نے کشمیر میں سو پنکھڑیوں والا کنول کا پھول دیکھا۔ وہ اِس بات کا

---

[1] سدن ادب۔ تواریخ نویسی نمبر ۲۔ مضمون توزک۔ کے، ان، پنڈتا۔ صفحہ۔ ۹۱ — تزکِ جہانگیری۔ راجرس / بیوریج۔ جلد۔ ۲۔

بھی اظہار کرتا ہے کہ گوری مرگ (گلمرگ) کے حسنِ لازوال نے اُسے مسحور کیا۔

شہر سرینگر کی بات کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے کہ دریائے بہت (وتستا۔ دریائے جہلم) پر عبور و مرور کے لئے لکڑی کے چار مضبوط کدل (پُل) بنائے گئے ہیں۔ لکڑی اور غلے کے نقل و حمل کے لئے کشتیاں استعمال ہوتی ہیں۔ کشتیوں کی تعداد پانچ ہزار سات سو اور ملاحوں کی تعداد سات ہزار بتائی ہے۔ مکان تین تین چار چار منزلہ ہیں۔ چھت پر مٹی ڈالی جاتی ہے جس پر گلِ لالہ اُگتا ہے جس سے بہار میں دیکھنے کو عجیب منظر ملتا ہے پھول ان گنت قسم کے اُگتے ہیں۔ اُستاد منصور نے سو سے اوپر پھولوں کی تصویریں بنائی ہیں۔ اکبر کے زمانے میں پیوندی شاہ آلو یعنی آلو بخارا وجود میں لایا گیا۔ سمرقند نام کا کشمیری سیب بہت اچھا ہوتا ہے۔ توت کی بہتات ہے۔ دھان کی کاشت زیادہ ہوتی ہے۔ شال تبت سے لایا جاتا ہے۔ اکبر نے اسکا نام پرم نرم رکھا تھا۔

کشمیر کے خارجی و داخلی جغرافیہ کے بارے میں بھی جہانگیر نے تزک جہانگیری میں اطلاعات فراہم کی ہیں —— کشمیر کی وادی میں داخل ہونے کے دو راستے بتلائے گئے ہیں۔ ایک بھمبر کا، دوسرا پکھلی کا۔ بھمبر کا راستہ نوشہرہ، راجوری، بہرام گلہ[1] ۔ پوشیانہ، پیر پنچال، باڈی برآری، ہیرپورہ (ہُرپورہ) اور قلمپورہ (کلیان پورہ) سے ہو کر سرینگر سے ملتا ہے۔ پکھلی کا راستہ پنبہ درنگ، (مظفر آباد) کھٹائی اور بارہ مولہ سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچ جاتا ہے۔

یہاں کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ بہرام گلہ کے لوگ فارسی، ہندی اور کشمیری تینوں زبانیں بول سکتے ہیں۔ اُن کی عورتیں پوٹھ پہنتی ہیں اور ناک میں نتھنی ڈالتی ہیں۔ راجوری کے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بھی عورت کو خاوند کی موت واقع ہونے پر زندہ دفن کرتے اور لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے ہیں لیکن میں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔

کشمیر میں مروج سازوں کے نام بھی جہانگیر نے لئے ہیں یعنی کمانچہ، جنتر، قانون، دف، نے وغیرہ۔

---

[1] بہرام گلہ کا راستہ یونہی کھُلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ اُس وقت کے دو زمیندار مہدی نایک اور حسین نایک ہیرپورہ سے بہرام گلہ تک کے راستے کے پہرے داروں کی حیثیت سے کلیدی رول ادا کرتے تھے۔ مہدی نایک کا باپ بہرام نایک حکومت کشمیر کے عہد میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اغلب ہے کہ اسی نسبت سے اس کا نام بہرام گلہ پڑا ہو۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ کشمیری موسیقار ہندی مقامات میں کشمیری نغمے گاتے ہیں[1]

ہندوؤں کے نہایت ہی اہم تیوہار دسہرہ کے دھوم دھام اور عقیدت سے منانے کا ذکر بھی جہانگیر نے کیا ہے۔ یہ تیوہار ہر سال معمول کے مطابق منایا جاتا تھا[2] دریائے جہلم میں مچھلی پکڑنے کے ایک خاص طریقے کا ذکر بھی جہانگیر نے کیا ہے[3]۔ جہانگیر لوکہ بھون کے اندھے ناگ اور مٹن کے مچھی بھون ناگ بھی دیکھنے گیا تھا جسکا ذکر اُس نے اپنی توزک میں کیا ہے۔

وتستا کے جنم کے سلسلے میں اُن دنوں "ویتھ ترُواہ" کے موقعہ پر دریائے جہلم کے کنارے چراغاں کئے جانے کی قدیم رسم کے بارے میں جہانگیر لکھتا ہے کہ یہ ایک قدیم رسم ہے جو اِس روز (اگست کے اختتام یا یکم ستمبر پر) ادا کی جاتی ہے۔ جہانگیر بچشم خود، شکارے میں بیٹھ کر اِس دلربا چراغاں کا نظارہ کرتا ہے۔ شمسی سال کے اعتبار سے اُس کے وزن کئے جانے کا دن بھی اتفاق سے اُسی روز پڑتا تھا تو اُس نے اپنے وزن کے برابر سونے وغیرہ جیسی گرانقدر اشیا، مستحق لوگوں میں تقسیم کیں۔ "ویتھ ترُواہ" کے موقعہ پر چراغاں کرنے کی مستحسن رسم تو اب نہیں رہی لیکن لڑکیاں اپنے والدین کی طرف سے تحائف حاصل کرتی ہیں۔ شب برات کی مقدس تقریب پر غریب اور امیر سب مُسلمان بھی چراغان کرتے ہیں[4]۔ جہانگیر ایسے میں پرندوں کی فہرست بھی فراہم کرتا ہے جو اُس کے زمانے میں کشمیر میں نہیں پائے گئے۔ ان میں مور، سارس وغیرہ شامل ہیں — جہانگیر بڑے احترام سے زین العابدین بڈشاہ اور اُس کے کارناموں کا بھی اجمالاً ذکر کرتا ہے۔ وہ یہاں کشمیر میں طاعون سے لوگوں کے مرے جانے کے بارے میں بھی لکھتا ہے[5] اور دست بدعا ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندوں پر رحم کرے اور اُنہیں مصائب و آلام سے نجات بھی دے۔

---

[1] تزک جہانگیری۔ ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا۔ مطبوعہ سون ادب۔ تواریخ نویسی نمبر۔ کلچرل اکادمی سرینگر، تزکِ جہانگیری راجرز و بیوریج۔ جلد دوم۔ [2] تزکِ جہانگیری، راجرز اور بیوریج۔ جلد دوم۔ صفحہ = ۱۶۷
[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۶۵
[4] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 = ۱۶۷ - ۱۶۸
[5] 〃 〃 〃 〃 〃 اول 〃 = ۴۴۲ - ۴۴۳

جہانگیر نے اپنے دورِ حکومت میں کشمیر کے موسم بہار کی رنگینیوں، فیاضیوں اور قدرت کی جلوہ طرازیوں سے حتی المقدور بہرہ ور ہونے کی ہر سال کوشش کی۔ جام و جاناں کی محفلیں سجیں، جس کی شہادت یہاں کے جنت نظیر باغات کے دلربا اور روح پرور گوشے دے رہے ہیں۔ جہانگیر اپنی حیات بے ثبات کے آخری لمحات میں بھی مست خرام زندگی پر جان چھڑکتا رہا۔ بقول غالب ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

مغل بادشاہوں کے سکّوں سے اُن کے مذہبی عقیدہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہانگیر کے ڈھالے ہوئے سکّے گول بھی ہیں اور چکور بھی۔ اُس نے چاندی کے سکّے بھی ڈھلوائے اور سونے کے بھی؎۔ تانبا بہت کم برتا گیا ہے۔ جہانگیر ہی کے عہد میں سکّہ سازی زیب و زینت کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی۔ اُس کی حکومت کے پانچویں یا چھٹے سال میں جاری کئے گئے سکّے وزن اور نفاست کے لحاظ سے دُنیا کے کسی بھی ملک کے بہترین سکّوں کے مقابلہ میں رکھے جا سکتے ہیں۔ سکوں کے ڈھلوانے میں بھی شہنشاہ کا ذوقِ جمال کارفرما رہا ہے۔ سکّوں کے دونوں طرف کندہ عبارت خطّاطی کے اعلیٰ نمونوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح یہ سکّے نہ صرف تاریخ نما ہیں بلکہ اسلامی فنون کے آئینہ دار بھی۔ مغل بادشاہوں میں کشمیر کی ٹکسال سے سب سے زیادہ سکّے جہانگیر ہی نے جاری کئے۔ اُسکے جاری کردہ سکّوں کی تعداد چودہ ہے۔ سنہ ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) تک جہانگیری سکّے بھاری تھے لیکن اُس کے بعد الٰہی طرز کے سکّوں نے ان کی جگہ لے لی۔ شہنشاہ نے البروج طرز کے دو ہی سکّے اپنی حکومت کے پندرھویں سال میں کشمیر سے جاری کئے۔ ان سکّوں پر بُرجِ جوزا (میتھُن) کی شبیہ بھی نظر آتی ہے۔ نور جہاں کے نام سنہ ۱۶۲۴ء/سنہ ۱۰۳۴ھ ایک مُہر کا اجرا ہوا ہے جس پر سرطان (کرک) کی شبیہ اُبھاری گئی ہے۔ مملکت کے دوسرے ضراب خانوں کی طرح کشمیر کی ٹکسال کے لئے بھی ایک شعر مخصوص تھا، جو یوں تھا اور روئے و پشت ضرب پر اُبھارا جاتا تھا ؎

؎ کیٹلاگ آف کوائنز۔ لاہور میوزیم: آر۔ پی، وائٹ ہیڈ صفحات: ۲۱، ۴۶، ۴۷

روئے زر را ساخت نورانی برنگ ۔ مہر و ماہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

کشمیر کی ٹکسال سے جاری کئے گئے جہانگیری سکوں کی تفصیل یوں ہے ۔

دھات	تاریخ و سال اجراء	روئے	پشت	وزن اور سائز
١۔ چاندی	١٠١٩ھ	نگ مہر و ماہ ساخت نورا روئے زر رانے بر ١٠١٩ کشمیر	ابن اکبر باشاہ نگ نورالدین جہا شاہ	٢٠٩ گرین ٠٨٥"
٢۔ ایضاً	١٠٢٠ھ	ایضاً	ایضاً	ایضاً
٣۔ ایضاً	١٠٢١ھ	ایضاً	ایضاً	٢١٠ گرین
٤۔ ایضاً	١٠٢٢ ٨ اردی بہشت	نگیر شاہ اکبر شاہ جہا نورالدین	بہشت ماہ اُردی الٰہی کشمیر ١٠٢٢ شہر ٨ ضرب	١٧٠ ٥٠٨'
٥۔ ایضاً	١٠٢٢ ٨ شاہ رِوار	ایضاً	ایضاً شہریور	١٧٨ گرین
٦۔ ایضاً	١٠٢٢ ٨ مہر	ایضاً	مہر	١٧٤ گرین
٧۔	١٠٢٣ ٨ اسفندارمُز	ایضاً	١٠٢٣ ٨ اسفندارمُز	١٧٠ گرین

پیمانے پر ہی سہی باغات سنوارنے کا شوق موجود تھا۔ زائنہ ڈب (نوشہرہ)، زائنہ لانک (جھیل ڈل اور وُلر میں) زینہ پورہ اور زینہ کوٹ و دیگر مقامات کو دلربا قطعۂ ارضی میں تبدیل کرنے کا شوق زین العابدین بڈشاہ کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ چک دور میں بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ مُرورِ ایّام نے اکثر ایسے باغات کے نقوش مٹا دئے۔ اب صرف نام باقی ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مغل شہنشاہوں نے اپنی نظرِ انتخاب سے ایسے باغات تعمیر کئے جن سے نہ صرف انہوں نے اپنے ذوقِ جمال کی کسی حد تک تشفّی کی بلکہ تقریباً ساڑھے تین سو سال کا عرصہ گزُرنے کے باوجود جہانگیر کے مینو نظیر منتخب گوشے آج بھی ہمارے لئے راحت و سکون کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ جہانگیر کا کہنا تھا کہ کشمیر کی وادی کو ملک نہیں بلکہ ایک باغ ہی کہنا مناسب ہے۔ اُن کے باغات اُن کی ارضی محبت کی یادگار کے طور ہی نہیں بلکہ ذوقِ جمال کے اعلیٰ اقدار کی محافظ کی حیثیت سے بھی ہماری نظروں کو وسعت اور دلوں کو ایک بے نام فرحت عطا کرتے رہیں گے۔

جہانگیر نے شالیمار باغ کی بنیاد ؁۱۶۱۹ء میں باغِ فرح بخش (THE GARDEN OF DELIGHT) کے نام سے ڈالی۔ فیض بخش نام سے اِس کی توسیع شاہ جہاں کے دور میں ؁۱۶۳۰ء میں ہوئی لیکن اِسکا اپنا پُرانا نام یعنی شالیمار ہی مقبول رہا۔ آج کل یہاں روشنی اور آواز (SOUND AND LIGHT) پروگرام کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ جو جہانگیر کی زندگی اور تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔

باغ عیش آباد (۱۰۳۰ھ مطابق ۱۶۲۲ء) باغِ بحر آرا (۱۶۲۴ء)، نور باغ، باغ دولت آباد، باغ ارادت نمان (۱۰۳۰ھ) باغ صفا، صفاپورہ، باغ امرُود، ویری ناگ، اچھبل و دیگر مقامات اپنی منفرد تاریخی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ کا تو اب نام و نشان بھی باقی نہیں اور کئی ایک اپنی اصلی حالت برقرار رکھتے ہوئے ہمارے لئے فرحت و شادمانی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ ان باغات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ انسان کو جنت سے اسی لئے نکالا گیا کہ وہ اِس دُنیا کو بہشت ارضی میں تبدیل کر دے۔ شاید اسی لئے جہانگیر نے بھی اس ضمن میں اپنا حقیر سا عملی حصّہ ادا کر دیا۔ اور علامہ اقبال کو کہنا

۸۔	〃	۹ تیر	〃	۱۰۲۳ ۹ تیر	۱۷۵ گرین
۹۔		۱۰۲۴ ۱۰ آذر	〃	۱۰۲۴ ۱۰ آذر	۱۷۴ گرین
۱۰		۱۰۲۶ ۱۲ فروردین		۱۰۲۶ ۱۲ فروردین	۱۷۵ گرین
۱۱۔	〃	۱۰۲۷ ۱۳ آذر	〃	۱۰۲۷ ۱۳ آذر	۱۷۶ گرین
۱۲۔	〃	۱۰۳۱ ۱۷ فروردی	〃	۱۰۳۱ ۱۷ فروردی	۱۷۴ گرین
۱۳۔	مربع 〃	۱۰۲۳ ۱۰	جہانگیر شاہ ۱۰۲۳	ضرب کشمیر	۲۰ گرین ۰.۳۵ سائز

باغات لگانے اور حسن فطرت کو مزید آراستہ و پیراستہ کرنے کا شغل قدیم ہے۔ عام طور پر یہی مانا جاتا ہے کہ کشمیر میں مغل شہنشاہوں نے باغات تعمیر کئے۔ کشمیر میں شاہمیری دور سے پہلے بھی چھوٹے

ن CATALOGUE OF COINS IN THE LAHORE MUSEUM, LAHORE BY R.B WHITE HEAD

پڑاؤ

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

مصوّری اور شبیہہ سازی اسلام میں ممنوع ہے لیکن انسان کا باطنی تخلیقی جذبہ کوئی نہ کوئی راہ پا ہی لیتا ہے۔ چنانچہ خطاطی نے اسلامی مصوّری کی جگہ لے لی۔ یہ فنِ شریف صفحۂ قرطاس سے لیکر محلات، مساجد، مقابر اور میناروں کے صدا بہار نقوش کی زیبائی سجاتے ہوئے ہے۔ چونکہ مغل بادشاہ علوم و فنون کے دلدادہ تھے اس لئے اُنھوں نے خطاطی کے فن کی سرپرستی کرنا اپنی سعادت سمجھی۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا درباری خوشنویس محمد حسین زرّین قلم تھا جس نے ابوالفضل کے "آئین اکبری" کے ایک عمدہ نسخہ کو مصوّر بنایا۔ شہنشاہ اکبر نے اِس کے لئے تین لاکھ روپے صرف کئے۔ یہ نسخہ اب لندن میوزیم میں موجود ہے۔

عہدِ جہانگیری کا بہترین اور ممتاز کاتب محمد مُراد شیریں قلم کو مانا جاتا ہے۔ خوشنویسی کا کشمیری قلم اُسی سے منسوب ہے۔ شاہجہان نے اُس کی شہرت سُن کر اُسے اپنا درباری کاتب مقرر کیا[1]۔ شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نورجہان فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ جہانگیر کے دور میں کشمیری زبان و ادب پر سکوت طاری رہا۔ البتہ فارسی شعر و ادب کو فروغ حاصل ہوا جس کا بلاواسطہ مستحسن نتیجہ یہ نکلا کہ آگے چل کر فارسی زبان کے زیرِ اثر کشمیری زبان کے عمومی ڈھانچے میں دور رس تبدیلی آئی اور نہ صرف اِس کے ذخیرۂ الفاظ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا بلکہ اسکی اصنافِ سخن کا دامن بھی کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے بہت وسیع ہوا۔ حیدر ملک چاڈورہ جسے دربارِ جہانگیری سے بڑی قُربت حاصل تھی کی "تاریخِ کشمیر (فارسی)" جہانگیر کے عہد ہی کی دین ہے۔ اس خاموش تاریخی عمل میں درباری عنایات سے زیادہ کشمیر کے علمی خاندانوں سے وابستہ کشمیری شعراء و ادباء کا بہت بڑا دخل ہے جن کی تخلیقی کاوشوں کی صورت میں کشمیری زبان مایوس کُن حالات میں بھی محوِ سفر رہی ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

---

[1] شیریں قلم۔ جلد۔ ۱۔ شاخِ نبات۔ محمد یوسف ٹینگ، مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر ۱۹۷۸ء

اکبر حیدری

شالیمار باغ

قومی یک جہتی کی درخشاں علامت

مغلوں نے کشمیر پر اگرچہ اندرونی خلفشار کی وجہ سے ۱۵۸۶ء میں قبضہ کیا تھا تاہم انہوں نے یہاں کچھ خوبصورت اور دل آویز باغات تعمیر کئے جن کی نظیر ہندوستان میں کیا ایشیا میں نہیں مل سکتی ہے۔ شاہان مغلیہ فن تعمیر کے بڑے دلدادہ تھے۔ اگر ہندوستان میں اُن کی بنائی ہوئی تعمیرات کے بہترین نمونے نہ ہوتے تو ہندوستان میں بیرونی سیاح آکر مایوس لوٹ جاتے مغلوں نے کشمیر میں باغات کے اعلیٰ نمونے بنائے تھے۔ ان میں سے بیشتر باغات مٹ چکے ہیں اور ان کے اب نام ہی کتب تاریخ میں رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر باغ عیش، باغ بحر آرا، نور باغ، باغ صفا، باغ بیگم آباد، الٰہی باغ، چنار باغ، باغ پانپور، باغ ونتی پورہ، باغ بیجبہارہ، باغ آصف آباد، باغ شاہ آباد، باغ نسیم، باغ جہاں آرا، باغ عنایت، باغ علی آباد، باغ دلاور خان، باغ لشکر خان، باغ افضل آباد وغیرہ وغیرہ۔

اب جو باغات موجود ہیں ان میں باغ اچھابل، نشاط باغ اور شالیمار باغ لوگوں کے مرکز توجہ ہیں۔

ان باغات کی طرف عوامی حکومت نے اگرچہ خاطر خواہ توجہ نہیں کی تاہم یہ بات اطمینان بخش ہے کہ حال ہی میں حکومت نے شالیمار باغ کی خوبصورتی اور توسیع کے بارے میں کئی اقدامات کا اعلان کیا ہے۔

شالیمار باغ سرینگر سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر نشاط باغ اور ہاروَن کے درمیان واقع ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں اس کے نام شالی مالی، شالی مار، شالہ مار، شالامار، شالمار، شعلۂ ماہ، شالاباغ اور شہلاباغ نظر سے گزرے ہیں۔ پہلے ہم شالی مالی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں فوق لکھتے ہیں:

"ہارون میں دوسری صدی بکرمی میں ایک مشہور عابد مرتاض سوکرام سوامی رہتے تھے۔ انھوں نے یاد الٰہی کے لئے ایک رین بسیرا بنا رکھا تھا۔ راجہ پرورسین[1] اس زمانے میں کشمیر کا راجہ تھا اور وہ سوکرام سوامی کی زیارت کے لئے ہارون کے مقام پر اکثر جایا کرتا تھا۔ اس نے اپنے لئے وہاں ایک آرامگاہ بنوائی اور لوگوں نے بھی بقدر ضرورت وہاں مکان بنوائے۔ رفتہ رفتہ یہ مکانات ایک چھوٹا سا گاؤں بن گئے۔ پرورسین نے اپنی شاہی اقامت گاہ کا نام شالی مالی رکھا۔"[2]

فوق کے بیان کی تائید حسن سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے مزید یہ اضافہ کیا ہے:

"پرورسین برائے تمکنِ خود و آمد و رفتِ مردم در آن جا قصرے متین بہ تصاویر دیوی و دیوتا و منتظمانِ عالم بالا و تمثالِ راجہ ہائے پیشین مانند نگارخانۂ چین آراستہ"[3]

ایک مغربی خاتون لیڈی سٹوارٹ نے بھی اپنی کتاب میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے[4]۔ مشہور محقق و مورخ پنڈت شیو نرائن رینہ کشمیری تخلص شمیم اپنے مضمون میں شالی مالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اثنائے مطالعہ میں ایک پوران میں جس کا نام اگنی پوران ہے ہمیں ایک پھول کا نام نگاہ سے گزرا جس کا نام "شالی مالی" ہے۔ تخیل نے ہمیں بتایا کہ کسی گلستان کا نام اس پھول سے پڑ سکتا ہے جو کثرت سے اس میں موجود ہو۔ شاید راجہ پرورسین نے اس مقام کا نام اسی وجہ سے شالی مالی رکھا ہو کہ شالی مالی پھول جو دیوتاؤں کو چڑھائے جاتے ہیں اس علاقے میں اس زمانے میں زیادہ ہوتے ہوں یا خود راجہ ہی نے ان پھولوں کی افزونی پیداوار کا یہاں

---

[1] پرورسین۔ اس راجے نے سنہ ۱۲۵ بکرمی سے سنہ ۱۹۵ بکرمی یعنی ۶۰ سال تک حکومت کی۔ اسی نے سری نگر شہر آباد کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے ۳۶ لاکھ مکان بنائے تھے (تاریخ حسن جلد دوم ص ۷)

[2] شالامار باغ ص ۴۹ جدید ایڈیشن سنہ ۱۹۲۴ء [3] تاریخ حسن ص ۲۸۶ جلد اول، [4] مغل گارڈنز ص ۱۲۶

اس کے آخر میں سنہ ۱۰۳۰ہ ہجری (مطابق سنہ ۱۶۲۰ء) کی تاریخ بھی درج ہے۔ چند شعر یہ ہیں :-

شنیدم شاہ روشن دل جہانگیر   زعشرت شد چو رونق بخش کشمیر
چو شد دامانِ دریا جلوہ گاہش   بسوئے شالی مار افتاد راہش
فضائے دید چوں روئے عروساں   سزاوارِ عمارات و گلستاں
بہ طبعش روح، روح افزا اثر کرد   گراں خوابی دماغش را خبر کرد
بگفت ایں دشتِ رنگیں روے حور است   زما سر منزلے ایں جا ضرور است
در آن ایّام شاہِ ہفت اقلیم   کہ بر سر دارد از خورشید دیہیم
سرو سر کردۂ شاہزادگان بود   دران شاہزادگی شاہِ جہاں بود
پئے اتمام ایں منزل قد افراخت   برائے خویش کارے پیش انداخت
ازیں چندیں صفا در کارِ او شد   کہ شاہی ایں چنیں معمار او شد
زنہر و آبشار و حوض و فوّار   ز دیوار و عمارت نخل و گلزار
بہشتے در جہاں شد آفریدہ   چنیں باغے فلک ہرگز نہ دیدہ
کنوں آمد زفیضِ خاک و آبش   فرح بخش از شہہِ عالم خطابش

تاریخ

چو شد آراستہ باغ فرح بخش   بحکم حضرتِ ظلِّ الٰہی
شہنشاہِ شہاں شاہِ جہانگیر   کہ مشہور است از مہ تا بماہی
پئے تاریخ ایں گلزار ریاں
خرد فرمود فرحت گاہ شاہی”
۱۰۳۰ ہجری مطابق سنہ ۱۶۲۰ء

شالی مار کا گاؤں اور شالی مار باغ پرگنۂ پھاگ کے کوہستان کے زیر دامن واقع ہیں۔ جہانگیر نے اپنی کتاب میں شالی مار کو ایک پرگنہ کے نام سے یوں لکھا ہے :

انتظام کیا ہو"[1]

شمیمؔ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرورسین کے زمانے میں خالص سنسکرت کشمیریوں کی زبان تھی۔ پوران بھی سنسکرت زبان میں ہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شالی مالی بھی اسی زبان کا لفظ ہے۔[2]

شالی مالی بہ مرورِ زمانہ "شالی مار" میں تبدیل ہوگیا۔ راجہ پرورسین کے بعد یہ کہیں نہیں معلوم ہوسکا کہ کسی اور ہندو راجہ یا مسلمان بادشاہ نے اس باغ کی طرف کوئی توجہ کی تھی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اس کا نام شالی مار ہوگیا تھا۔ بقول فوقؔ جب اکبر جون سنہ ۱۵۸۶ء میں یہاں آئے تو حکم دیا کہ تالاب ہارون سے ایک نہر نکالی جائے اور جھیل ڈل کے کنارے پر اسی مقام شالی مار کے نام پر ایک باغ بنوایا جائے۔ چنانچہ تالاب کے وسط میں ایک نہر جس کو "جوئے کلاں" کہتے تھے جاری کی گئی اور پہاڑ کے دامن میں جہاں ڈل کا پانی ختم ہوتا تھا بلند جگہ پر شالی مار باغ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ برٹش میوزیم لندن میں تاریخ کشمیر کا ایک قلمی و غیر مطبوعہ نسخہ زیر نمبر ۹۵۷ (A) موجود ہے۔ اس کا نام لب التواریخ ہے اور اس کے مؤلف مولوی بہاء الدین نقشبندی ہیں۔ اس کا ایک نسخہ فوقؔ کے پاس بھی تھا۔ اس میں شالی مار باغ کے بارے میں درج ہے:

> "جوئے کلاں در وسطِ آں رواں کرد۔ عماراتِ عالیہ سنگین و مصفا و حوض سنگین قریب پنجاہ دریں جا پیش و پس عمارت با فوارہ کردہ۔ بہ یمین دیسار جوئے صفہائے خوشنما۔"

پھر باغ کے ثمر دار درختوں اور گل و گلزار کا ذکر مولف کتاب درج ذیل الفاظ میں کرتا ہے:

> "در زیرِ آں سبزۂ سہ برگہ کہ بغایت نرم و خوشبودارے باشد درمیان گلستان خیاباہا برائے گلگشتِ تماشائیاں بستہ۔ در ہر خیاباں از دو جانب نہرے رواں ساختہ۔ الحال بہ سببِ عدم پرداخت آں طراوت نہ ماند ولیکن نشانہا باقی است"

جہانگیر پہلی مرتبہ بادشاہ کی حیثیت سے ۱۰ مارچ سنہ ۱۶۲۰ء کو کشمیر آئے تھے۔ اُنھوں نے شالی مار میں عمارتیں تعمیر کرائیں اور شالی مار باغ کا نام "فرح بخش" تجویز کیا۔ اس موقعہ پر مرزا محمد سلیم دربار ی شاعر نے ایک مثنوی کہی۔

---

[1] "ہمایوں" ۔ (لاہور)، جلد ۔ ۱، نمبر ۔ ۱، جنوری سنہ ۱۹۲۲ء

[2] شالامار باغ ص ۵ (فوق)

"دوسہ روز اکثر اوقات بر کشتی نشستہ از سیر و تماشائے شگوفہ پھاگ و شالی مار محظوظ گشتم۔ پھاگ نام پرگنہ ایست کہ بر اطراف کوہ ڈل واقع است۔ و ہمچنیں شالی مار نیز متصل آن جوئے آب خوش دارد کہ از کوہ آمدہ بکول ڈل می ریزد و بہ فرزند خرم (شاہجہاں) فرمودم کہ بیش آن نشستند۔ آبشارے بہم رسیدہ کہ از سیر آن محظوظ توان شد و ایں مقام سیر گاہے مقرر کشمیر است"[١]

مرزا محمد عرف معتمد خان بخشی نے بھی اپنی کتاب میں جہانگیر کے سیر شالی مار کا بیان کیا ہے[٢] محمد صالح کنبو شاہجہاں کے مقتدر مورخ تھے۔ وہ بھی باغ کو شالی مار ہی کہتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"چوں آنحضرت خلافت مرتبت از سیر متنزہات کشمیر خاصہ گلزار فیض آثار فرح بخش معروف بہ شالی مار کام خاطر عاطر گرفتہ داد نشاط و شادمانی دادند"[٣]

اُردو کے مشہور ادیب و مصنّف عبداللہ چغتائیؒ اپنے مضمون "شالامار" میں "شالی مار" کے نام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر یہ تسلیم کریں کہ واقعی یہی نام ہے تو لغت کی طرف رجوع کرنے سے تشفّی ہوتی ہے کہ "شالی" بزبان فارسی و کشمیری دھان کو کہتے ہیں۔ کشمیر کی اکثر کتب تاریخ میں جہاں غلّہ و اناج کا ذکر آیا ہے وہاں چاول کو بلفظ شالی بیان کیا ہے۔ کشمیر میں دھان کی زیادہ پیداوار ہوتی ہے اور یہاں کے باشندوں کی خوراک بھی یہی ہے اور "مار" بزبان کشمیری ندی کو کہتے ہیں۔ پس معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ دھان جو ندی کے کنارے پیدا ہوتا ہو ممکن ہے کہ یہ باغ کشمیر میں ایسی جگہ تعمیر کیا ہے جہاں قدیم زمانے میں دھان بکثرت پیدا ہوتا ہو اور ساتھ ندی بھی ہو گی جیسا کہ ڈل قریب ہے جس کی وجہ سے یہ نام جائے وقوع عام ہو گیا۔ بلکہ لفظ شالی تو اس قدر عام ہے کہ بعضوں کو ان کے پیشہ کے لحاظ سے شالی کوب لکھا ہے جیسا کہ مشہور شاعر حمید الدین بن مسعود بن سعد

---

[١] تزکِ جہانگیری ص ٣٠٣ مطبوعہ علی گڑھ [٢] اقبال نامۂ جہانگیری (اردو ترجمہ) ص ١٢٧ [٣] عمل صالح ص ١٣٢ مطبوعہ کلکتہ

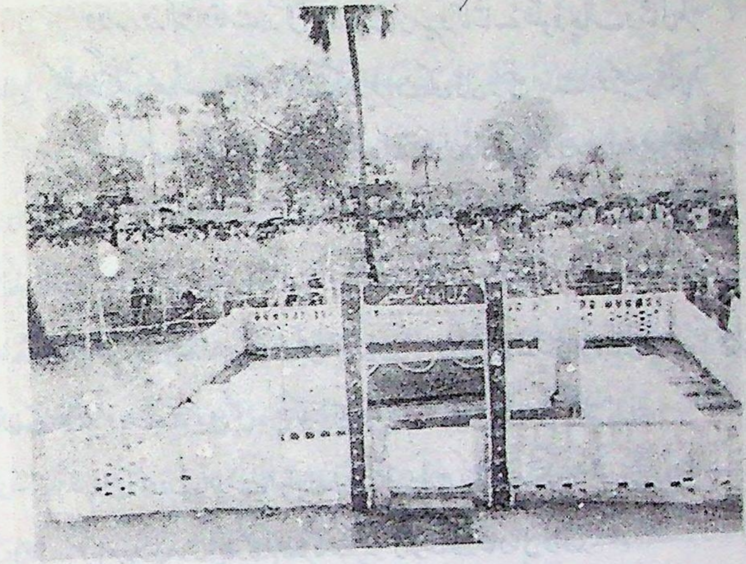

مزارِ یوسف شاہ چک۔ بسوک (بہار)

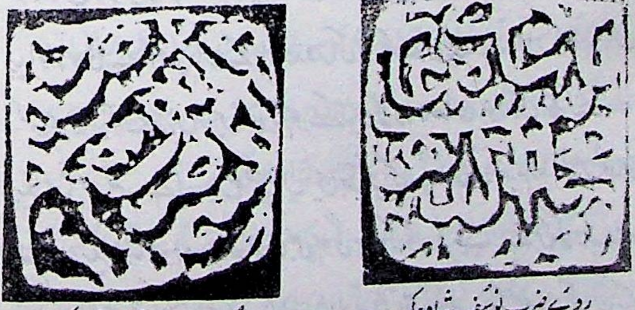

پُشت ضربِ یوسُف شاہ چک

روئے ضربِ یوسُف شاہِ چک.
۱۵۷۹ء

شالی کوب۔ تھے[1]

شاہجہاں کے زمانے سے شالی مار کو شالہ مار یا شالامار کہنے لگے ہیں۔ سب سے پہلے ابوالفضل نے شالہ مار کا ذکر ایک آبشار کے نام سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "درقریہ بازو آن آبشارے از کوتل شاہ کوٹ بشگرف شورشے فرود در آیند۔
> آن را شالہ مار گویند"[2]

ملا عبدالحمید لاہوری اپنی تاریخ شاہجہاں کے زمانے میں تصنیف کر چکے تھے۔ بقول ان کے جب کشمیر میں شاہجہاں بادشاہ بعد تعمیر باغ ہذا چودہ سال بعد ۱۰۴۴ سنہ ہجری میں تشریف لے گئے تو اس وقت لوگوں کی زبان پر اس کا نام شالامار تھا اور اس پر بادشاہ نے اس کا نام فرح بخش تجویز کیا۔ ملا موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

> "و از تاریخ بنا تا حال چہاردہ سال باشد بلطف تربیت کہ سال بسال طراوت و بصارتش افزودہ سابقاً ایں حدیقۂ رشیقہ بہ شالامار معروف بود۔ دریں ولا کہ بشرف قدوم نخل پیرائے ریاض خلافت زیب و زینت تازہ و فیض بیمنت بے اندازہ و ریاحین و اشجار و کمال تنومندی و سرسبزی و رنگینی و شادابی بنظر کیمیا اثر در آمد۔ بفرح بخش موسوم گردید"[3]

کشمیری مصنفین اسے "شالمار" کہتے ہیں۔ دیوان کرپارام[4] کے علاوہ حسن بھی "شالمار" ہی لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

> سنہ ۱۰۴۴ھ میں شاہجہاں شالمار باغ دیکھنے گئے۔ انہیں یہ باغ بہت ہی پسند آیا۔ تین مرتبہ آصف خان سے کہا "باغے خوب و نہایت مرغوب است"۔ آصف خان خاموش رہے۔ بادشاہ نے رنجیدہ ہو کر وہ نہر کاٹ دی جو شالمار سے جاری ہو کر نشاط باغ میں جاتی تھی۔ اس واقعہ سے آصف جاہ پریشان ہوئے۔ ایک دن اسی ادھیڑ بن میں حزن و اضطراب کے عالم میں سو گئے۔ باغبان ان کے حالِ زار

---

[1] شالامار سہیل ص ۶۹ بابت جنوری ۱۹۲۶ء [2] آئینہ اکبری ص ۵۶۷ مطبوعہ کلکتہ
[3] بادشاہ نامہ ص ۲۴ جلد اول مطبوعہ کلکتہ [4] گلزار کشمیر ص ۲۱۰ دیوان کرپارام مطبوعہ ۱۸۷۰ء

سے واقف تھا۔ اس نے شالمار سے نشاط کی طرف دوبارہ نہر جاری کر دی۔ جب یہ خبر شاہجہاں کو پہنچی تو انہوں نے غصہ کیا اور باغبان کو طلب کیا۔ اس نے حقیقت حال بیان کی۔ اس پر بادشاہ نے درگزر کیا اور ایک فرمان جاری کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کے زمانے میں باغ کا نام شالمار مشہور ہو چکا تھا۔ فرمان کی عبارت ذیل قابلِ غور ہے:-

"حقیقتِ آب جوئے کہ بہ جہت سیرابی باغ مذکور (نشاط باغ) از نہرے کہ پایان موضع داچھی گام من اعمال پرگنۂ پھاگ می گزرد و در فرح بخش کہ واقع است در آن موضع معروف بہ شالمار مابدولت واقبال در ایّام فرخندہ جام شاہزادگی احداث فرمودہ بودیم۔ دریں ولا بہ مبارکی و فیروزی در آن سرزمین فرح بخش نزول اجلال فرمودیم"[۱]

اصل واقعہ یہ ہے کہ جہانگیر نے شالی مار باغ کا نام فرح بخش رکھا تھا۔ شاہجہاں نے اس کو وسعت دی اور کشمیر کے صوبہ دار ظفر خان احسن کو حکم دیا کہ وہ فرح بخش کو آراستہ کرے اور اس کے ساتھ ایک اور طبقہ باغِ فیض بخش کے نام سے تعمیر کرے۔ ظفر خان اپنی غیر مطبوعہ قلمی مثنوی میں شالامار کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ظفرخان کردہ از تعلیم حضرت — زفرطِ دانش و ادراک و فطرت
دوگلشن از بہم زانگونہ پیوند — کہ نتواں شان جدا کردن بہ سوگند
درآوردہ چنیں رضواں سرشتے — بہشتے را در آغوشِ بہشتے
فرح بخش آن سرباغ دلستاں — فرح بخشِ دماغ حور و رضواں
بزیر پائش از دل می نہد سیم — بہ فرق از فیض بخشش زیب دیہیم
ہمیشہ تازہ است آن باغ دل خواہ — شگفتہ چوں گل بخت شہنشاہ

---

[۱] تاریخ حسن، جلد اوّل صـ۲۹۳ تا صـ۲۹۷

خصالی ایک اور شاعر تھے جو شاہجہاں کے دربار سے وابستہ تھے۔ انہوں نے باغ فیض بخش کی تعریف میں ایک مثنوی کہی۔ اس کے آخر میں تاریخ بھی نکلتی ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

چو باغِ فیض بخش از حکمِ شاہی — ابر، باغ ارم گشتہ مباہی
فرح بخش از کمالِ افتخارش — چو گل بر فرق خود دادہ قرارش
ازیں رو کاشمرِ فخرِ جہان است — کہ دروے گلشن شاہجہان است
پئے تاریخ سالش صُبح گاہی
خرد گفتا "مسرت گاہ شاہی"

۱۰۴۲ ہجری (مطابق ۱۶۳۲ء)

ظفر خان احسن باغ فیض بخش اور فرح بخش کی تعریف میں بے ساختہ کہتے ہیں ؎

ہست اگر در عالمِ عیش و طرب خلد بریں
فیض بخش است و فرح بخش است بروئے زمین

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ شالی مار شاہجہان کے زمانے میں شالہ مار اور شالامار کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ ظفر خان کہتے ہیں ؎

فلک زیں گونہ کردہ تیز رخشش
کہ تا آید بطوف فیض بخشش
برآوردہ پر از شوقِ نگارش
کہ تا بوسد کنارِ شالہ مارش

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

بوصفِ شالامار آن خلدِ ثانی — ملک ہر گوشہ در گوہر فشانی
فرح بخشش شہنشہ نام کردہ — فرخ زان باغ جنت وام کردہ

باغ کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

نسیم از رنگ گلہاش ارغوانی   نزاکت کردہ بر شاخش گرانی
بروئے سبزہ شبنم گشتہ سیّار   چو عکس گوشوارہ از خطِ یار
گلش دستِ صبا اشک کردہ   کہ بوُد ہر رنگ خارا تنگ کردہ
بزلفِ نہالِ او بہ منت   نگہ دارد دلِ مرغانِ جنّت

شاہی عمارتوں کے بارے میں شاعر کہتا ہے ؎

عمارتش بہ نوعے دل نشین است   کہ گوئی خاتمِ جم رانگین است
بہ سقفش نقش بستہ اسم اعظم   زخاتم بندیش چوں نقشِ خاتم
نہ دیدہ ہیچ کس در دل زبائے   عمارا تے بہ ایں محکم بنائے
عمارا تے بہ ایں خوبی کہ دیدہ   زسنگ و چوب محبوبی کہ دیدہ
زشوقِ دیدنِ آں سقف و دیوار   دراں ثابت کواکب گشتہ بسیار
ہوائے او چناں از نشہ سیراب   کہ ساقی نیست محُتاجِ مئے ناب
بہ کیفیت چناں سقف و بنائش   کہ پُرمے می شود جام از ہوائش
زخوبی ماہ تا ماہی در دہست   چو جنت ہر چہ مے خواہی در دہست

بہ ایں خوبی سپہرے بر زمیں نیست
شبستانے چنیں در ہند و چنیں نیست [1]

شاہجہاں نے بھی اپنے فرمان میں شالامار باغ کی خوب تعریفیں کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

" الحق باغے مرتب گشتہ کہ اعتدالِ ہوائش بہ غایت فرح افزا و صفا و لطافتش نہایت دل کشا و حوض کوثر میانش از عینِ صفا عکس پذیرفتہ آب آئینہ کردارش از صُور عیون و اشجار صحفۂ تصویر گشتہ " [2]

---

[1] مثنوی بنظیر قلمی وغیرہ مطبوعہ

[2] تاریخ حسن جلد اوّل ص ۲۹۶

شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب ۱۰۷۵ھ ہجری مطابق ۱۶۶۴ء میں کشمیر آئے۔ انہوں نے شالامار باغ میں بڑے عیش و مسرت سے جشن منایا۔ چراغاں کا اہتمام بھی کیا[۱]۔ ان کے بعد کوئی مغل بادشاہ اس باغ کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ "شالامار" کس لغت کا لفظ ہے اور اس کا شان نزول کیا ہے۔ سٹوارٹ لکھتی ہیں کہ شالامار کے معنی سنسکرت میں خانۂ عیش کے ہیں۔ یہی معنی فرہنگ آنند راج میں بھی درج ہیں۔ یعنی "شالامار (میم بالف کشیدہ و رائے مہملہ زدہ) نام باغیست در کشمیر و ہمچنیں در لاہور و دہلی و ایں لفظ ہندی الاصل ست و اصلش شالامار یالف مرکب از شالا یعنی خانہ و مار بمعنی شہوت و جماع۔ پس معنی ترکیبی آن خانۂ شہوت باشد و چوں تفریح و تماشائے باغات شہوت را بر می انگیزند بہ مجاز بمعنی باغ استعمال یافتہ ؎

زباغ زلف و رخ یار دادہ است فراغم
کہ سنبل شہوتش کم ز شالہ مار نہ باشد

مرات آفتاب نما کے مصنف نے بھی جہاں شالامار دہلی کا ذکر کیا ہے انہوں نے شالامار کے معانی کی اسی طرح پوری تشریح کر کے خانۂ عشرت اس کے معنی بیان کئے ہیں۔ بعض اس کے عدم سنسکرت ہونے پر بھی اعتراض کریں گے کہ اس کو بھی بر وزن پاٹ شالہ اور دھرم شالہ مار شالہ ہونا چاہئے تھا۔ جسے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ موجودہ ترکیب زیادہ تر مقامی اثرات سے پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ کشمیر میں اور بھی پرگنے ہیں مثلاً شالہ ٹگ، شالہ نار، شالہ ٹینگ، شالہ ہار، شالہ باغ وغیرہ جو آج بھی انہی ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔

حسن مشہور مورخِ کشمیر شالامار کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"شال بزبان شاستر خانہ، چنانچہ دھرم شال، مار لقب، کام دیو (خدائے محبت) و بہ معنی دیگر زیبا۔ معنی شالمار یا خانۂ کام دیو بہ حسب تصاویر یا خانۂ زیبا۔ از روئے تزئین مردوران قصر مذکور ویران و دہے آبادان گشت۔ بعد ازان آبادی دہ را مردمان "شالمار" می گفتند"[۲]

---

[۱] تاریخ حسن جلد دوم ص ۵۳۶ [۲] تاریخ حسن ص ۲۸۶ جلد دوم۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اسٹین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قدیم مورخین جیسے جون راج اور شری ور نے شالامار کے بارے میں کلیتاً سکوت اختیار کیا ہے اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ صوفی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بقول صاحب نگارستان کشمیر و صاحب لغت فرانسو "شالامار" ترکی لفظ ہے جس کے معنی مقام عیش و آرام ہیں[1]

مورخین نے اس باغ کا ذکر باغ فرح بخش المعروف بہ شالامار کیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ شاہی نام اس باغ کا فرح بخش اور عوام کا وضع کردہ جو کشمیر کی تقلید میں ہوا شالامار تھا۔ اس نام سے یہاں ایک عجیب و غریب لطیفہ بھی مشہور ہے کہ جب کشمیر میں شاہجہاں تعمیر باغ کے لئے کسی موزون جگہ کی تلاش میں نکلے تو اتفاق سے منتخب شدہ جگہ پر ایک گیدڑ کسی شکاری کتے کو پکڑے ہوئے تھا اور بادشاہ کے ہمرکاب چند کشمیری بھی تھے جو یک بیک آواز شالہ مار بول اٹھے۔ کیونکہ بزبان کشمیری "شال" گیدڑ کو کہتے ہیں اور "مار" کے معنی شکاری کتے کے بھی ہیں[2]

مرزا مہدی علی خان اپنی تاریخ میں لاہور اور دہلی کے شالامار باغ کا ذکر کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بجائے شالامار کے "شعلۂ ماہ" باغ کا نام فارسی میں بدل دیا[3]

مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۷۸۰ء تا ۱۸۳۷ء) کو شالامار باغ لاہور سے خاص الفت تھی۔ انہوں نے موسم گرما میں آرام کی خاطر ایک خاص کنواں تیار کروا کر اس کے ساتھ ایک سردخانہ تیار کیا تھا جس میں ولیم مورکرافٹ مشہور سیاح کشمیر و تبت ۱۸۲۳ء میں قیام پذیر ہوا تھا جس کی یاد میں اب تک ایک سنگ مرمر کا کتبہ اس سردخانے کی دیوار میں نصب ہے۔ مہاراجہ کی زبان چونکہ پنجابی تھی اس لئے انہیں اس کا نام شالامار نہ بھاتا تھا۔ انہوں نے ایک خاص مجلس اس کے نام کی تحقیق کے لئے قائم کی جس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ مختلف قسم کے اقوال نقل کر کے مختلف وجہ تسمیہ بیان کرتے تھے[4] یہی تمام واقعات ان ہی الفاظ میں ایک ہمعصر تاریخ "تاریخ رنجیت سنگھ" مصنفہ امرناتھ اکبری (جن کے والد دربار میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور مصنف نے خود دربار میں پرورش پائی) نے صفحہ ۹ اور ۱۰ میں بیان کئے ہیں۔ ایک اور کتاب چہار باغ پنجاب مصنفہ گنیش داس کے

---

[1] کشمیر جلد دوم ص ۵۲۹ [2] تحقیقات چشتی ص ۸۰۶، نور احمد چشتی مطبوعہ لاہور ۱۸۶۷ء

[3] تاریخ جہاں کشائے نادری ص ۲۴۶ تا ص ۲۵۶ [4] تاریخ پنجاب ص ۳۶۰، سید محمد لطیف مطبوعہ ۱۸۸۸ء،

تاریخ لاہور (انگریزی) مطبوعہ ۱۸۹۲ء۔

قلمی نسخہ صـ۲۵۳ میں شالامار کے بارے میں یوں درج ہے :

"باغ شالامار کہ ترتیب کردہ شاہجہاں است سرکار والاجناب نواب ذکریا خان بہ تجدید تازگی بخش شکست و رنجیت او شدہ شالاباغ نام نہادند و بعضے ایں باغ را شہلا باغ نامند و در نادرہ (جہاں کشائے نادری) نامش شعلۂ ماہ نوشتہ اند"

لیکن خود مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا کہ شالامار اس باغ کا نام اس لئے نہیں ہوسکتا کہ پنجابی زبان میں اس لفظ کے معنی خدا کی لعنت اور پھٹکار کے ہیں۔ جس مقام پر انسان زندگی کا حظ اُٹھائے اس کا نام ایسا کیوں رکھا جاسکتا ہے۔ بعضوں نے کہا کہ یہ لفظ ترکی زبان کا ہے جس کے معنی خوشی کی جگہ ہیں۔ مگر رنجیت سنگھ اس کی ترکی تعبیر سے بالکل متاثر نہ ہوئے بلکہ انہوں نے کہا کہ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو مرزا مہدی ایرانی نے اپنی تاریخ جہاں کشائے نادری میں شعلۂ ماہ بجائے شالامار کے کیوں وضع کیا۔ انہوں نے اس باغ کا خود اپنا ایک نام شہلا باغ وضع کیا اور حکم بھی صادر کیا کہ آئندہ اسی نام سے پکارا جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شہلا ہمیشہ آنکھ کی تعریف میں آتا ہے جس کے معنی سیاہی لئے بھوری آنکھ کے ہے جو نہایت حسین آنکھ کی تعریف ہے۔ ایک قسم کی نرگس کو بھی نرگسِ شہلا کہتے ہیں جس میں بجائے زردی کے سیاہی ہوتی ہے اور اکثر آنکھ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اس کی دو تاویلیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ باغ ہذا میں نرگس بکثرت پیدا ہوتی ہوگی یا مہاراجہ کو اعور ہونے کی حیثیت سے تعریف چشم مرغوب ہوگی جو اس کے خلیق ہونے کی دلیل ہے ؎

داد نسیم زرِ خود نرگسِ شہلا نعیم — پیشِ چشمِ تو کہ غارت گرِ ایں بستانست
ضعف رکھتے ہیں ازل سے تری آنکھوں کے مریض — خاک سے لے کے عصا نرگسِ شہلا نکلی

غرضیکہ شالامار باغ کا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دَور تک شہلا باغ رہا لیکن بعد میں پھر وہی نام عود کر آیا[1]۔ بقول فوق یہ نام ۱۹۰۱ء تک زبان زد عوام تھا۔

ڈوگرہ دور میں شالامار باغ کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ محمد خلیل مرجان پوری اپنی کتاب تاریخ کشمیر قلمی و غیر مطبوعہ میں لکھتے ہیں :

---

[1] شالامار صـ۶۹ سہیلؔ علی گڈھ بابت اپریل ۱۹۲۶ء

"نوداہہائے نخاس ازمیاں کشیدہ بردند۔ بجائے آں ناوُداہہائے سفالین چسپانیدند۔ نگین ہائے عقیق وغیرہ بمقدار دو خروار بقبضہ آوردند۔ ایں ہمہ بموجب خورد برد اہل کاران شد"

سر ٹامس مور کا مشہور و معروف افسانہ "لایٹ آف دی حرم" ہے۔ اس کا منظوم ترجمہ "لالہ رخ" کے نام سے اُردو کے ایک کہنہ مشق شاعر نادر علی خان نادر کاکوروی نے کیا جو مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔ نادر کتاب کے ص۲۳ میں حاشیے میں "شالامار" کے تحت لکھتے ہیں:

"شالامار ایک وسیع میدان میں لب جھیل یہ عظیم الشان باغ شاہجہان بادشاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اس وقت تک دنیا کے تمام پھل دار درختوں اور پھولوں کی جھاڑیوں سے یہ باغ اپنا آپ نظیر تھا۔ جھیل کا پانی ایک مشین کے زور سے چڑھا کر باغ کے بیچ سے بصورت ایک نہر کے بہایا گیا تھا جس سے باغ کی کیفیت اور بھی پر لطف ہو گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس باغ کی آراستگی اور خوبصورتی میں مغلیہ بادشاہوں خصوصاً جہانگیر نے نفاست کی سب سے اچھی تصویر کھینچی تھی۔ جہانگیر اور نور محل تو اس باغ پر ایسے فریفتہ تھے کہ بہار کا موسم کشمیر میں گزارتے تھے۔ نہر پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پُل قائم کر کے ان پر خوبصورت بارہ دریاں اور شہ نشینیں سنگ مرمر کی بنائی تھیں۔ ان شہ نشینوں میں حسین اور مہ جبین نازنینوں کا جمگھٹا بازار کی رونق کو اور بھی بڑھا رہا تھا جو دید کے قابل ہوتا تھا۔ وسط باغ میں عالی شان بارہ دری سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی خاص بادشاہ کے قیام کے لئے اور اس کے اوپر چار جانب نہروں پر چھوٹی چھوٹی شہ نشینیں محلات اور خدام شاہی کے لیے عجب خوبصورتی اور نفاست سے بنی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صدر دروازے پر جو کواڑ لگے تھے ان کے دلہے سنگ موسیٰ کے تھے اور ان دلہوں پر سنہری بیل بوٹے نہایت نفاست سے بنے تھے"۔

نادر کاکوروی (متوفی ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء) "دعوتِ گل کا دوسرا جلسہ" میں کہتے ہیں ؎

یہ سوچ کے وہ حزین و دلگیر　　یعنی شاہنشہ جہانگیر
بولا وہی جلسہ پھر سہی آج　　بہلے تو کسی طرح سے جی آج
اس مرتبہ شالامار میں ہو　　بُستانِ صدا بہار میں ہو
تھی حکم کی دیر دم زدن میں　　بُھنگانہ رہا اس انجمن میں
اُمرا کا اودھر ہوا جو ریلا　　سب اُٹھ گیا ہاتھوں ہاتھ میلا
اب چل کر شالامار دیکھیں　　میلے کی وہاں بہار دیکھیں
اس کی وہ عالی شان کوٹھی　　جو شاہی طور پر سجی تھی
اس وقت بنی ہے بُقعۂ نور　　اور جمع ہیں اس میں حُور ہی حُور
دُنیا کے چُنے ہوئے پری زاد　　جن سے کشمیر ہے اب آباد
جو نہر پہ جا کے ہر سحر روز　　پیتے ہیں آبِ حُسن افروز
دن بھر ہے عاشقوں کا تانتا　　ایک آتا ہے اور ایک جاتا
پہنے ہوئے سب لباسِ زرّیں　　یکجا ہیں مثال ماہ و پروین
اور وہیں بہ ہزار عشوہ و ناز　　شاعر کے چمن میں نغمہ پرداز

جسٹس شاہ دین ہمایوں (متوفی ۲ر جولائی ۱۹۱۸ء) نے "شالامار باغ کشمیر" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم کہی تھی جو مخزن لاہور بابت جون ۱۹۰۲ء میں ہماری نظر سے گزری۔ اس زمانے میں چودھری خوشی محمد ناظرؔ کشمیر میں ہی بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ ایک شعر میں جسٹس ہمایوں شیخ عبدالقادر مخزن کے ایڈیٹر اور اقبال کو اس طرح یاد کرتے ہیں ؎

ناظرؔ! بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ[1] ہو اور شالامار ہو

---

[1] شیخ سے مراد شیخ عبدالقادر ہے۔ وہ اقبال کے یارِ غار تھے۔ انہوں نے اپریل ۱۹۰۱ء میں رسالہ "مخزن" لاہور سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شالامار باغ قومی یک جہتی کی ایک درخشاں علامت ہے۔ ہر سال مختلف فرقوں کے لوگ دل بہلانے کے لئے جوق در جوق اس باغ میں آتے ہیں اور آپس میں بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل باغ کی کیاریوں، بارہ دریوں، آبشاروں، پھولوں کی انجمنوں اور پھل دار درختوں کے زیر سایہ خوب گھل مل جاتے ہیں۔ ایسا پر کیف اور روح پرور منظر برصغیر میں اور کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ باغ سکھوں کے تہوار کے موقع پر ہر سال پہلی بیساکھ کو عوام کے لئے کھولا جاتا ہے اور یہاں خوب بیساکھی کا میلہ لگتا ہے۔

آزادی سے پہلے شالامار باغ موسم بہار میں پورے جوبن پر رہتا تھا۔ یہاں کا چپہ چپہ صاف ستھرا اور مہکتا ہوا نظر آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پتّا پتّا اور بوٹا بوٹا عطر میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے دیکھنے کے لئے ہندوستان سے کم اور بیرونی ممالک سے زیادہ سیاح آتے تھے۔ انگریز ہمیشہ باغ کی صفائی اور نزاکت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آزادی سے پہلے ہندوستانی سیاح اجازت نامے حاصل کر کے آتے تھے۔ لوگوں کی تعداد کم ہوتی تھی اس لئے پورے باغ میں چہل پہل کے ساتھ ساتھ سکوت بھی رہتا تھا۔ آزادی کے بعد آنے جانے کی پابندی اٹھائی گئی۔ اب ہزاروں کی تعداد میں لوگ باغ میں آتے ہیں۔ لیکن اس سے باغ میں پہلے جیسی صفائی وغیرہ نہیں رہتی۔ عوام بے دریغ پھولوں اور سبزے کو پامال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہاں کھانا تک پکاتے ہیں اور فواروں میں برتن دھوتے ہیں۔ ہر طرف گندگی پھیلاتے ہیں جس سے باغ کی خوبصورتی، صفائی اور آراستگی متاثر ہوتی ہے۔

شائع کیا۔ اس رسالے نے اقبالؔ، اکبرؔ، اعجازؔ، نیرنگؔ، آغا حشرؔ، علمدارؔ واسطی، طالبؔ بنارسی، چودھری خوشی محمد ناظرؔ اور دوسرے بے شمار شعراء کی مقبولیت اور شہرت میں چار چاند لگا دئے۔ اقبالؔ نے شیخ پر بانگِ درا میں ایک نظم شائع کی ہے۔ موصوف شاعر نہیں تھے۔ اعلیٰ پایہ کے انشا پرداز تھے۔ کشمیر سے متعلق ایک شعر اُن کی موزونیٔ طبع کی دلیل ہے۔ شعر نہیں بلکہ مرقع کشمیر ہے جس پر دیوانوں کے دیوان قربان کئے جانے کے قابل ہیں۔ شعر کا عنوان ہی کشمیر رکھا گیا ہے۔ "یہ مرقع" لکھنو بابت جنوری ۱۹۲۶ء میں چھپا تھا۔

بہار اسکی نہ پوچھے گا خزاں ہو رشک بہار جس کی
کہ اس خزاں پر بھی آئے دن واں نئے شگوفے نکل رہے ہیں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کشمیر کے شالامار باغ کی تقلید میں اور جو باغ تعمیر کئے گئے تھے اور جن کا ذکر مختلف کتابوں میں ملتا ہے یہ ہیں شالامار باغ لاہور، شالامار باغ دہلی، شالامار باغ سوہدرہ وزیرآباد پنجاب، شالامار باغ جموں، شالامار باغ راجوری جموں، شالامار باغ کپورتھلہ، شالامار باغ پٹیالہ۔

◆

شیخ صاحب کا انتقال ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو ہوا۔ شیخ امین حزیں سیالکوٹی کا یہ قطعہ یاد رہے گا ؎

اقبال کی یادگار تھے شیخ   اقبال کے یارِ غار تھے شیخ
اک "بلبل خلد" جس پہ چہکا   لاریب وہ شاخسار تھے شیخ
ملت کا چمن تھا رشکِ فردوس   اقبال تھے گل بہار تھے شیخ
بارود کا میگزین اقبال   لاریب، مگر شرار تھے شیخ
اس عصر کی محفلِ ادب میں   شخصیتِ باوقار تھے شیخ
اس دوست سے جا ملے ہیں آخر   جسکے لئے سوگوار تھے شیخ

اے راہ روِ دیارِ رحمت
منزل گہہ تو جوارِ رحمت۔

("مخزن" بابت جنوری ۱۹۵۰ء ص ۵۹)

◆

ارجن دیو مجبور

مُغل انتظامیہ اور کشمیر

44 ہندوستان کی تاریخ میں مُغل دور ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۷ء تک رہا ہے۔ اس دور کے سبھی حکمرانوں سے متعلق فارسی زبان میں تواریخ ضبطِ تحریر میں آئی ہیں اس لئے اِس دور کے کسی بھی پہلو کا بڑی آسانی سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی نظام کے پھلنے پھولنے اور ڈھنگ سے جاری رہنے کے لئے ایک صحت مند انتظامیہ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا جب اور جہاں بھی کسی حکمران کے انتظامیہ میں بے ضابطگی پیدا ہوئی تو حکومت کا ڈھانچہ رو بہ زوال ہوا۔

سیاسی طور مغلوں کا زمانہ ہند میں جاگیر شاہی کے عروج کا زمانہ ہے۔ اِسے سامراج کا نام دینا میرے خیال میں ٹھیک نہیں۔ مُغلوں کے آنے سے قبل ہند میں ایک مضبوط حکومت کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس وقت ملک کے حصے بخرے ہو چکے تھے اور ملک بھر میں کئی چھوٹی بڑی ریاستیں قائم تھیں جن کا اثر مقامی تھا۔ ان میں جو اہم آزاد ریاستیں تھیں اُنکے نام یہ ہیں:

بنگال، بہار، جونپور، کشمیر، ملتان، سندھ، مالوہ، گجُرات، میوار اور دکن کی بہمنی اور وجے نگر کی ریاستیں۔ سارے ملک میں جاگیردارانہ نظام قائم تھا۔ کسانوں کی حالت ہر جگہ خراب تھی۔ مالیہ کی وصولی اکثر جنس کی صورت میں ہوتی تھی۔ ہاں حکمران نقدی کی صورت میں مالیات وصول کروانا پسند کرتے

تھے جسکی وجہ یہ تھی کہ غلے کی قیمتیں بہت کم تھیں اور اکثر اوقات آفاتِ سماوی سے فصلوں کو نقصان پہنچتا تھا۔

ملک کی افراتفری سے مرکز میں ایک مضبوط حکومت کے قیام کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس دور کی ابتدا سے ہی یورپ سے لوگ یہاں آنا شروع ہو گئے تھے۔ اِن میں سیر و سیاحت کی غرض سے آنے والے، تجارت کے خواہشمند اور ملک گیری کی ہوس رکھنے والے عناصر شامل تھے۔ سارے ملک میں سڑکوں کے ایک مربوط نظام کی اہمیت بھی زوروں سے محسُوس کی جا رہی تھی اور پیداوار کو بڑھا دینے کی غرض سے ایک بہتر بندوبستی طریقے سے ملک کی خوشحالی کے لئے مالیات میں اضافہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ مغل یا منگول نسل کا تعلق وسط ایشیا کے وسیع غیر آباد زمینی خطوں سے تھا۔ یہ جنگجو خانہ بدوش قسم کے بہادر لوگ تھے۔ چنگیز خان تیرہویں صدی میں شمالی ہندوستان پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جہاں تک ہند کی مغل سلطنت کا تعلق ہے اس کا سلسلۂ نسب مغل خاندان کی چغتائی شاخ سے وابستہ ہے۔

مغلوں نے کس طرح ہند پر قبضہ کیا یہ ایک لمبی داستان ہے تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے ہم سیدھے اِن کے انتظامیہ کے سلسلے میں بات کر کے نفسِ مضمون کی طرف آنے کی کوشش کریں گے۔ جہاں تک مغل انتظامیہ کا تعلق ہے اس کا محور خود بادشاہ تھا اور اُس کی منشا کے مطابق ہی حکومت کا کام چلتا تھا۔ اُس کی مرضی کے بغیر ترقی، تعمیر، تعلیم اور انصاف کے ادارے چل نہیں سکتے تھے۔ انتظامیہ کے سلسلے میں ہر اہم قدم اُس کی منشا کے مُطابق ہی اُٹھایا جاتا تھا۔ چونکہ حکمران مسلمان تھے، اس لئے حکومت اُن کی نگاہ میں دینی تھی اور حکومت کی رہنمائی کے لئے اسلامی قوانین پر ہی نظر رہتی تھیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ ملک کی ساری آزاد ریاستیں اپنی بساط کے مُطابق مغل شہنشاہی کو پسند نہیں کرتی تھیں اور ان میں سے کئی مغلوں سے برسرِ پیکار بھی رہیں۔ ایسی ریاستوں میں دکن کی مسلمان ریاستیں یعنی بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، بیدر اور برار کی ریاستیں شامل تھیں۔ خود کشمیر، جسکی بات ہم آگے تفصیل سے کریں گے، یوسف شاہ چک تک مُغلوں کو ناکوں چنے چبواتا رہا لیکن آخرکار اکبر نے اِسے اپنی سلطنت میں شامل کر ہی لیا۔

دکن کی مسلمان ریاستوں کو مغلوں کے خلاف کامیابی نہ ملنے کی وجہ اُنکی آپس کی پھُوٹ تھی۔ اِن میں سے بڑی بڑی ریاستیں سارے دکن کو ہڑپنا چاہتی تھیں۔ دراصل مغل جاگیر شاہی کے خلاف ہند کی تینوں

بڑی قومیں یعنی ہندو، مسلمان اور سکھ برسرِ پیکار رہے۔ ہندوؤں میں پنجاب کے سکھ، راجپوتانہ کے راجپوت اور مہاراشٹر کے بھونسلے لگاتار بہادری کے ساتھ شاہی استحصال اور سختیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ ان لڑائیوں کی رہنمائی کرنے والوں کو مقامی لوگوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی، جس کی وجہ تھی لوگوں کی مفلسی اور اُن پر ڈھائے جانیوالے کئی طرح کے ظلم و ستم۔ اس نکتہ نگاہ سے دراصل یہ سبھی لڑائیاں ایک مضبوط مرکزی جاگیردارانہ نظام کے خلاف کسانوں کی بھرپور بغاوتیں تھیں۔ اِن کا مقصد ایک غیر ملکی حکومت کو ختم کرنا تھا اور اس کی جگہ ملک میں ایک ایسا نظام رائج کرنا تھا۔ جو جبر و استبداد کا خاتمہ کر کے مکمل خوشحالی کے لئے راستہ ہموار کر سکے تاکہ محنت کش عوام اپنی زندگی سکون و اطمینان کے ساتھ گذار سکیں۔ بے حد مُفلسی کے باوجود جب ہم حکمرانوں کے بڑے بڑے محل خانوں، عیاشی کے ذرائع اور دولت کے ذخیروں کی سیر کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ لوگوں کی مفلسی اور لاچاری کے باوجود حکمران طبقے، سرکاری عہدے دار اور درمیانہ طبقے کے لوگ مزے سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اِس بات کی تائید اے، ایل، سری واستوا، مغل سلطنت کے اقتصادی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

"حکمران طبقے دولت اور عشرت میں کھیل رہے تھے۔ درمیانہ طبقے کے لوگ، جو زمینداروں، بیوپاریوں، سرکاری عہدہ داروں اور دیگر ملازموں پر مشتمل تھے اچھی طرح گذر بسر کر رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف عام لوگ اور معمولی دست کار غریب تھے۔ اور مُشکل سے دو جُون روٹی کما لیتے تھے۔ جب قحط سالی یا غلے کی کمی ہوتی تھی تو وہ بھوک کا شکار ہو جاتے تھے۔"

اِس پس منظر میں ہم اُس دور کے انتظامی ڈھانچے کا جائزہ لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس دور میں جیسا کہ بادشاہی نظام میں ہوتا ہے۔ حکمران کا عہدہ موروثی ہوتا تھا۔ ہاں جب بادشاہ کے وارث کا فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا تو اکثر تخت کے وارثوں کے درمیان تب تک جھگڑا چلتا رہتا تھا جب تک ایک زور آور وارث دوسرے کو دبا کر یا اُسکا کسی طرح خاتمہ کرا کے تخت نشین نہیں ہوتا تھا۔ نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا اعلان شاہی دربار میں کیا جاتا تھا جو اس غرض کے لئے خصوصی طور طلب کیا جاتا تھا اور جس میں حکومت کے اعلیٰ افسر قاضی، دیوان رؤسا اور اہم اشخاص مدعو کئے جاتے تھے۔ اسکے بعد آنے والے جمعہ کو شہر کی بڑی مسجد میں نماز کے بعد خطبہ پڑھا جاتا تھا جس میں نئے بادشاہ

کے حق میں دُعائیں کی جاتی تھیں۔ مغلوں کے دربار دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک دیوان خاص اور دُوسرا دیوان عام۔ دونوں طرح کے درباروں کی خوبصورت تعمیرات آج تک آگرہ کے لال قلعے، دہلی کے لال قلعے اور فتح پور سیکری میں موجود ہیں۔ خاص دربار میں بادشاہ کے خصوصی اہلکار اور قریبی صلاح کار وغیرہ حاضر ہوتے تھے اور عام درباروں میں اس سے نچلے درجے کے عہدے داروں کو بھی شرفِ شمولیت حاصل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مغل بادشاہ ایک مخصوص کھڑکی میں (جسے "جھروکا درشن" کہتے تھے) بیٹھ کر عوام کو اپنی صورت دِکھا کر مشکور کرتے تھے۔ وہ اُن کی شکایات سُنتے اور اُنہیں رفع کرتے تھے۔ کئی بادشاہوں کے عدل کی داستانیں آج تک چلی آرہی ہیں۔ ان میں سے اکثر بادشاہ معاملے کی تہہ تک پہنچ کر فیصلے صادر کرتے تھے لیکن آمد و رفت کا سلسلہ اتنا آسان نہیں تھا کہ دور دراز جگہوں سے عام لوگ آکر بادشاہ تک رسائی حاصل کر پاتے۔

مغل درباروں میں ہمیں حسبِ ذیل عہدہ دار اکثر انتظامیہ کو مؤثر طور پر چلانے کے لئے دیکھنے کو ملتے ہیں:

۱۔ میر تُزک:۔ بحیثیت چیف سیکرٹری کے کام انجام دیتا تھا۔

۲۔ شاہی خبر نویس:۔ دربار کی کاروائی اور دیگر اہم معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے شاہی خبر نویس مع دو نمایندوں (REPORTERS) کے ہمیشہ دربار میں حاضر رہتا۔

۳۔ ناظم شاہی ڈاک:۔ بادشاہ کے خطوط اور احکامات لانے اور لے جانے کے لئے شاہی پیغام رسانوں کے ہمراہ موجُود رہتا تھا۔

۴۔ شاہی کیمپ کا ناظم:۔ بادشاہ کے دورے پر رہنے کی صورت میں شاہی کیمپ کا انتظام کروانے کی ذمہ داری سنبھالنے کا کام کرتا تھا۔

۵۔ نگران شاہی محافظان:۔ بادشاہ کے محافظوں کے دستے کا حاکم ہمیشہ حضور میں حاضر رہتا۔

میر تزک کا عہدہ بعد میں دیوان یا بخشی کے عہدے میں تبدیل ہُوا اور یہ عہدہ کافی اہمیت کا حامل تھا۔

دربار کے روزمرہ کے کاموں میں سب سے پہلے گذشتہ روز جاری ہوئے احکامات دوبارہ پڑھے جاتے تھے اور یہ دیکھا جاتا تھا کہ ایسے احکامات پر کس طرح عملدرآمد ہو سکے۔ اس کے بعد دیوان یا بخشی، صوبائی گورنروں (صوبیداروں) ضلع افسروں اور مالیہ جمع کرنے والوں کے خطوط پڑھتا تھا۔ بادشاہ اِن سرکاری خطوط کو غور سے سُن کر حسبِ ضرورت احکامات صادر کرتا۔ کچھ اعلیٰ افسروں کے نام آئے ہوئے وہ خطوط جو مفصلات کے عہدہ داروں سے آئے ہوتے تھے کے اہم اقتباسات پڑھے جاتے تھے اور بادشاہ کچھ دیر غور کرنے کے بعد ان سے متعلق احکامات جاری کرواتا تھا۔

دربار سے منسلک ایک اور اہم عہدہ تھا خانساماں کا۔ خانساماں شاہی محل سے متعلق اخراجات کی فہرست پیش کرتا تھا۔ اس میں شاہی لنگر، مہمانوں کے نوش وطعام اور دعوتوں کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ اس عہدے پر کام کرنے والے کو شاہی دربار میں آنے جانے کی کھلی اجازت حاصل تھی۔ دربار میں ہی شاہی خبرنویس ملک کے مختلف علاقوں سے آئی ہوئی اہم خبروں کو پڑھتا تھا۔ جو شاہی قاصد باہر روانہ کئے گئے ہوتے تھے اُن کی اِرسال کردہ خاص رپورٹیں بھی شاہی دربار میں پڑھی جاتی تھیں۔ سب منصب داروں کی تقرری، ترقی، مُعطلی یا برخواستگی کے احکامات دربار میں ہی صادر کئے جاتے تھے اور جاگیریں یا انعامات دینے کا فیصلہ بھی یہیں پر ہوتا تھا۔ ان سب امور کے لئے شہنشاہ کی منظوری لازمی تھی۔ جن عہدہ داروں اور منصب داروں کو شاہی دربار میں کھُلے طور پر آنے کی اجازت تھی اُن میں صوبیدار، فوجدار اور سپاہ سالار شامل تھے۔ صوبوں کے مالیات جمع کرنے والے افسر شاہی دیوان کو اپنی رپورٹ بھیجنے کے پابند تھے اور اپنی سفارشات شامل کر کے دیوان اِن کاغذات کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔

شاہی سفیر، مہمانِ خصوصی، ہارے ہوئے باغی اور ایسے حکمران جن سے حکومت چھِن چکی ہوتی تھی دربار میں داخل ہونے کا اعزاز حاصل کر سکتے تھے۔ ان کے خصوصی نمائندوں کو بھی دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دی جاتی تھی۔ خطابات یا حوصلہ افزائی کے لئے دئے جانے والے تحائف کا فیصلہ بھی شاہی دربار میں ہی ہوتا تھا۔ کسی مہم پر بھیجے گئے سپاہ سالار جب کامیابی حاصل کر کے واپس لوٹتے تو کھُلے دربار میں اُن کا استقبال کیا جاتا تھا۔

جہاں تک دربارِ شاہی بلانے کا تعلق تھا، یہ دربار ہر روز ہی لگتا اور بادشاہ روز مرّہ کا کام پورا کر کے ہی دیگر کاموں کی طرف متوجہ ہوتا۔ مُغل بادشاہ انتظامیہ کا مرکزی کردار ہونے کی وجہ سے ہر دربار میں موجود رہتا، چاہے اُس کی صحت ناساز بھی کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انتظامیہ کا اہم فرد ہونے کی حیثیت سے ایسا کرنا اُس کے لیے لازمی تھا۔ ایسا کرنے سے وہ ملکی معاملات کو صحیح رُخ دینے میں اپنا حصہ ادا کرتا تھا۔

شاہی خزانے، عمارات، سڑکوں اور باغوں کی تعمیرات کا فیصلہ بھی اِن ہی درباروں میں ہوتا تھا۔ مغل دور نے بیربل جیسی ذہین شخصیت اور شاعر، ٹوڈرمل جیسے مالی منتظم، راجہ بھگوان داس جیسے کمانڈر اور شیخ مبارک اور ابوالفضل جیسے اعلیٰ درجہ کے صلاحکاروں کو پیدا کیا۔ ان میں سے ابوالفضل کو ہند کا بہت بڑا عالم مانا جاتا ہے۔

شاہی دور میں غسل خانوں کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ اہم اور خاص مشوروں کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بادشاہ کے اعلیٰ افسروں کو یہاں آنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اِن غسل خانوں میں اہم اور خفیہ مشورے ہوتے تھے۔ بادشاہ یہاں تعمیر شدہ تخت، خصوصی کُرسی یا ایک قیمتی قالین پر جلوہ افروز ہوتا اور حکام کو نیچے بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ لال قلعہ آگرہ میں ایک ایسا غسل خانہ اب بھی موجود ہے جو کافی بڑا ہے اور مُنبت کاری کے فن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں ایک دیاسلائی یا موم بتی روشن کرنے سے دیواروں پر ہزاروں روشنیاں جگمگ جگمگ کرنے لگتی ہیں۔ غسل خانے کے اپنے خاص آداب مقرر تھے۔ چنانچہ شاہجہان اُن افسروں کو جو کسی بے ادبی کا مرتکب ہوتے جُرمانہ حاصل کئے بغیر باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جہانگیر غسل خانے میں چل رہی کارروائی کو تھوڑی دیر کے لئے معطل کر کے اپنے معمول کے جام چڑھا لیتا تھا۔ اکبر یہاں مذہبی معاملات طے کرتا تھا۔

غُسل خانے کے علاوہ ایک اور جگہ تھی خلوت خانہ۔ یہاں بہت ہی اہم قسم کے خفیہ مشورے کئے جاتے تھے۔ دیوان یا بخشی یہاں ضرور حاضر رہتا تھا۔

مُغل دور میں بروز بدھ وار دیوانِ عام اور خاص، انصاف کے دربار میں تبدیل ہوتے تھے۔ دربار کا ناظم شکایت کرنے والوں کو ایک ایک کر کے بادشاہ کے حضور پیش کرتا۔ بادشاہ عرضی سُننے کے بعد انصاف پر مبنی فیصلہ صادر کرتا۔ اس میں اُس کا اپنا دخل ہوتا تھا اور بعض موقعوں پر وہ حسب ضرورت اپنے اہلکاروں سے مشورہ بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے پاس جو وقت بچتا وہ نماز، تعزیہ، حرم یا سیر و شکار میں صرف

ہوتا۔

ریاست کے اعلیٰ اہلکار

اکبر کے عہد میں وکیل کا عہدہ ختم ہُوا اور وکیل، کا کام دیوان کو ہی سپرد کیا گیا۔ اس طرح عام طور پر حسب ذیل افسر ریاست کا انتظامیہ چلانے پر معمور تھے:

(۱) دیوان (۲) میر بخشی (۳) خانساماں (۴) صدر (۵) صدر قاضی
(۶) صدر مُفتی (۷) مستعوفی (۸) ناظم اسلحہ جات (۹) صدر محُتسب

دیوان

بادشاہ کا وزیر خاص ہوتا تھا۔ وہ اپنے کام کے علاوہ دیگر وزراء کے کام کا معائنہ کرتا۔ وزراء کا مطلب اُس زمانے میں کسی خاص محکمے یا محکموں (صیغوں) کا نگران ہونا تھا۔ ذاتی حیثیت میں وہ کوئی قدم بادشاہ کی منظوری کے بغیر نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ دیوان بادشاہ کے جیبِ خاص کا ذمہ وار ہونے کی حیثیت سے ہر معاملے میں رائے دینے کا حق رکھتا تھا۔ آمدنی کے تمام محکمے اُس کے ماتحت ہوتے تھے۔ بخشی، خانساماں اور صدر کے ذریعے ہونے والے اخراجات دیوان کے وصُول کردہ مالیات سے پُورے کئے جاتے تھے۔ تمام شاہی احکامات، روانہ کرنے سے قبل، دیوان کے دفتر میں درج کئے جاتے تھے۔ وہ بادشاہ کی جانب سے احکامات صادر کرنے کا مجاز تھا۔ اِس طرح دیوان کے دفتر پر نظام سلطنت کو ٹھیک ڈھنگ سے جاری رکھنے کی اہم ذمہ داری عاید تھی۔ مغل بادشاہوں کے کئی اہم اور قابل دیوانوں میں راجہ ٹوڈر مل، راجہ رگھوناتھ، سعد اللہ خان اور جعفر خان خصوصی طور قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے عوامی خدمت کی ایسی روایتیں قائم کیں جو آنے والے ادوار کے لئے قابلِ رشک بن گئیں۔

میر بخشی

افواج کے لئے مغلوں نے کبھی بھی سالار اعظم کی تقرّری نہیں کی۔ مغلوں کی فوج میں خود مختار دستے موجود تھے جو منصب داروں کے ماتحت ہوتے تھے۔ میر بخشی بادشاہ کا خاص فوجی صلاحکار ہوتا تھا۔ سپاہیوں اور منصب داروں کو تنخواہ دینا اُس کا کام تھا۔ وہ فوج کے منصب داروں اور دیگر سپاہیوں کے کام کا سالانہ

جائزہ لیتا تھا۔ اُسے انتظامیہ کی شہ رگ کا درجہ حاصل تھا۔ راجدھانی سے باہر سبھی خبریں بھیجنے والے اُس کے ایجنٹ تھے۔ ہر صوبے کا ایک الگ بخشی ہوتا تھا جو میر بخشی کی نگرانی میں کام کرتا تھا اور صوبے کا سب سے بڑا خبر نویس ہوتا تھا۔ وہ صوبے کے سبھی منصب داروں کے کام کا جائزہ لیتا۔ راجدھانی سے باہر سول ملازمین کے کام وغیرہ کے بارے میں وہ فیصلہ صادر کرنے کا مجاز تھا۔

خانساماں

خانساماں کی حیثیت موجودہ دور کے وزیروں جیسی تھی۔ لیکن اُس کے کام اور محکمہ جات کچھ اسطرح تھے:۔ ۱۔ صنعت ۲۔ تجارت ۳۔ زراعت ۴۔ شاہی اہلِ خانہ کا منتظم۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک کافی اہم عہدہ تھا اور اس پر کام کرنے والے کی رسائی دربارِ شاہی تک ہوتی تھی اور اہم صیغوں پر نگرانی کا کام خانساماں کے سپرد تھا۔ یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ اب خانساماں مغلوں کے خانساماں سے کس درجے پر آچکا ہے۔

صدر

صدر، شاہی دربار سے باہر رہنے پر بھی کبھی کبھی شہنشاہ کے بہت قریب رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک صدر قاضی اور ایک مفتی ہوتا تھا۔ مفتی کے ماتحت مُحتسب خاص، شاہی جزیہ وصول کنندہ (جو راجدھانی میں مقیم رہتا تھا) ہوتا تھا۔ صوبوں میں الگ طور سے قاضی، مُحتسِب، جزیہ وصُول کرنے والے اور صدر مقرر تھے۔

صدر کے عہدے میں: ناظمِ انصاف کا کام، مذہبی امور، تعلیم اور شاہی خیرات کے عہدے شامل تھے۔ علم کی ترویج اور سرپرستی کے علاوہ خیرات اور وظائف دینے کا کام بھی صدر کے فرائض میں شامل تھا۔

محتسب

مُحتسب، اموراتِ مذہب اور سیکولر معاملات سے متعلق افسر ہوتا تھا۔ بحیثیت سیکولر اہلکار کے اُس کا کام ماپ تول کے اوزان کا معاینہ کرنا، بازار کے بھاو پر نگاہ رکھنا، قرضہ جات وصُول کرنا، بھاگے ہوئے غلاموں کا پتہ لگا کر اُن کو مالکوں کے حوالے کرنا اور عوامی سڑکوں اور بازاروں میں ناجائز تعمیرات کو روکنا تھا۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں منشیات (شراب، بھنگ اور تاڑی) کی عوامی فروخت کی مناہی، قحبہ خانوں کو شہروں میں کھُلے طور پہ چلنے نہ دینا، جُوا بازی کی روک تھام کرنا بھی مُحتسِب کے فرائض

میں شامل تھا۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں غیر مسلموں کے خلاف عاید کردہ قوانین پر پابندی کرانا اور مسلمانوں کو اسلامی طرزِ زندگی پر عمل کروانا بھی اُس کے ذمّے تھا۔

داروغہ ڈاک

اس اہل کار کے ذمّے شاہی ڈاک رسانی کا کام تھا۔ اس کام کے لئے مدد کرنے کی خاطر ہر جگہ کارندے مقرر تھے۔ ہر پڑاؤ پر پیغام رسانوں کے لئے گھوڑے تیار رہتے تھے۔ پیغام رساں، پیدل یا گھوڑے پر دریاؤں اور پہاڑوں کو پار کر کے ملک کے طول و عرض سے ڈاک لاتے تھے۔

مغلوں کے دور میں ملک صوبوں اور صوبے پرگنوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ آئینِ اکبری کے مطابق کشمیر میں اُس وقت ۳۸ پرگنے تھے جب اس تذکرے کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ پرگنہ ایک اہم انتظامی اکائی تھا۔

پرگنہ

ہر پرگنے میں ایک شقدر، ایک امین، ایک فوطیدار (خزانچی) اور دو منشیوں کے عہدے ہوتے تھے۔ شقدر پرگنے میں امن و امان قائم رکھنے کا ضامن تھا۔ وہ بوقتِ ضرورت مالیہ جمع کرنے میں امین کی فوجی مدد بھی کرتا تھا۔

امین زمینوں کی پیمائش اور اُن کے مالیے کا تخمینہ لگانے کے بعد مالیہ جمع کرتا۔ وہ رعایا اور ریاست کے درمیان غیر جانبداری سے کام کرنے کا پابند تھا۔ دو منشیوں میں سے ایک کے ذمّے ہندی میں اور دوسرے کے ذمّے فارسی میں پرگنے کے حسابات رکھنے کی ذمہ داری عاید تھی۔

ہمایوں کو ملک بدر کرنے کے بعد شیر شاہ سوری نے جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اُس نے ملک میں فوجی مہموں کے علاوہ چند اہم انتظامی تبدیلیاں لائیں۔ ان میں زمین کی پیمائش اور سرکاری مالیے کا تعین بھی شامل ہے۔ یہ مالیہ پیداوار کے $\frac{1}{4}$ سے $\frac{1}{3}$ حصے کے برابر متعیّن کیا گیا تھا۔ کاشت کاروں سے قبولیت نامے (DEED OF AGREEMENT) لکھوائے جاتے تھے جن پر کاشتکار کے زمینی حقوق اور ذمے داریاں درج ہوتی تھیں۔ سرکار کی طرف سے کاشتکار کو "تحریری پٹّہ" دیا جاتا تھا جس پر ضروری شرائط کا اندراج ہوتا تھا۔ شیر شاہ خود کاشتکاروں سے ملتا، اُنکی شکایتیں سُنتا اور اُنہیں

درمیانہ داروں کے چنگل سے بچاکر اپنے اثر ورسوخ میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ شیر شاہ نے سلطنت کی اہم جگہوں کو راجدھانی کے ساتھ سڑکوں سے ملایا۔ اس کی تعمیر کردہ سب سے لمبی سڑک ۱۵۰۰ کوس تھی۔ یہ سڑک ڈھاکہ کے متصل "سونار" گاؤں سے آگرہ کے راستے دہلی ہوکر بندھ تک جاتی تھی۔ دوسری بڑی سڑک آگرہ سے جودھپور اور چتوڑ کے قلعے تک جاتی تھی۔ تیسری ایسی سڑک آگرہ سے برہان پور اور چوتھی سڑک لاہور سے ملتان تک تعمیر کی گئی تھی۔ شیر شاہ نے الگ نظام پولیس قائم کیا اور جہاں تک انصاف کا تعلق ہے وہ اپنے خطاوار رشتہ داروں یا دوستوں کو بھی سزا دینے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس سے قبل ملک کا نظام زر بگڑ چکا تھا۔ اُس نے اس نظام میں بھی تبدیلی کی اور ۱۶۶.۴، ۱۶۷، ۱۶۸.۵ رتی وزن کے سونے کے سکّے، ۱۸۰ رتی کا چاندی کا سکّہ اور تانبے کا "دام" نام کا سکّہ جاری کیا۔ چاندی کا ایک روپیہ تانبے کے ۶۴ داموں کے برابر تھا۔ نظام زر میں اِن اصلاحات سے عوام اور بیوپاریوں کو درپیش مشکلات دُور ہوئیں۔ شیر شاہ کا اصلاح کردہ نظام زر باقی ماندہ مغل دور میں برابر چلتا رہا۔ اسی CURRENCY کو ۱۸۳۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے جاری رکھا اور بعد میں، ۱۹۴۷ء تک یہی برطانوی نظام زر کی بُنیاد بن گیا۔ زندگی کے کئی دیگر شعبوں میں بھی اُس نے کئی سُدھار کئے۔

کشمیر کا نظام حکومت چلانے کے لئے مرکزی حکومت ایک صوبہ دار کو مقرر کرتی تھی۔ صوبیدار کسی بھی لاپرواہی کے لئے مرکز کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔ اُسکو مرکزی کوڈ آف ایڈمنسٹریشن اور قوانین کیمطابق کام کرنا ہوتا تھا۔ کشمیر کے مراز اور کمراز خطے سرکاروں میں منقسم تھے۔ ہر سرکار ایک کوتوال کے ماتحت ہوتی تھی۔ کوتوال امن وقانون، عوامی بہبُود اور صحت وصفائی کا خیال رکھتا۔ ہر سرکار میں ایک منصب دار ہوا کرتا تھا جو انصاف دینے کے علاوہ مالیہ جمع کرتا تھا۔ ہاں یہ بات اہم ہے کہ اس زمانے میں فوجداری مقدمات بہت کم دایر ہوتے تھے۔ چنانچہ آئینِ اکبری کے مطابق کشمیریوں میں بہ مشکل کوئی چور یا گدا گر ملتا ہے۔ اگرچہ کشمیر گنجان آباد بھی ہے اور یہاں پیسے کی کمی کا مسئلہ موجُود ہے۔

ابوالفضل کے مطابق کشمیر کا صوبہ کشمیر، پکھلی، بھمبر، سوات، بجور، قندھار اور زُبلستان پر مشتمل تھا۔ اس کا دارالخلافہ کابُل تھا۔ یہ ذکر مغل دور سے قبل کا ہے۔ تیمور کے ہندوستان پر حملے کے وقت

کشمیر کا حکمران سلطان سکندر تھا۔ اُس نے تیمور کی باجگذاری اختیار کی اور اُس کو قیمتی تحالیف روانہ کئے جس کے صلے میں تیمور نے دو ہاتھی بطور تحفہ سلطان سکندر کو بھیجدیے۔ بابر کی آنکھیں بھی کشمیر پر لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت کشمیر میں شاہ میر کا فرزند حکمران تھا۔ اکبر کی حکومت کے دوران مرزا قاسم (۱۵۸۶۔ ۸۷) مرزا یوسف خان رضوی (۱۵۸۷ء سے ۱۵۹۰) محمود قُلیچ خان (۱۵۹۰ء سے ۱۶۰۱ء) اور مرزا علی اکبر (۱۶۰۱ء سے ۱۶۰۶) بحیثیت گورنر نظام حکومت چلاتے رہے۔ اکبر کے بارے میں "شُک" اپنی راج ترنگنی میں لکھتا ہے:

> "جب جلال الدین (اکبر) کشمیر کو جو زعفران، اخروٹ، میوہ جات اور پھولوں سے سجا ہوا تھا دیکھنے آیا تو شہری عورتیں بادشاہ کو دیکھنے کے لئے نکل پڑیں۔ جب کشمیریوں نے بادشاہ کو پہلی بار دیکھا تو اُس کے بعد گھر گھر میں کئی روز تک خوشیاں منائی گئیں۔"

اس کے باوجود جب مغل سپاہی شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے دکھائی دیتے تو لوگ انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب اِس بات کی اطلاع اکبر کو ملی تو اُس نے سپاہیوں کے لئے نگر ناگر تعمیر کرایا۔ بقول بامزئی ایک دفعہ یوسف خان کے بیٹے مرزا عسکر نے ایک سپاہی کے ذریعے کسی شخص کو ایذا رسانی کے بارے میں سُنا تو ملزم کو پکڑنے کے احکامات صادر کئے لیکن ملزم بھاگنے میں کامیاب ہُوا۔ کہیں ایسے واقعات دُوبارہ رونما نہ ہوں اس لئے مرزا عسکر نے جہلم کے بیچوں بیچ، یہ تاثر دینے کے لئے کہ ملزم کو زندہ جلا دیا گیا ہے، ایک بڑی کشتی میں جلانے کی لکڑی اکٹھا کرا کے اُسکو نذرِ آتش کیا۔ اکبر نے رہائشی کشتیوں کو عام کیا۔ عام لوگوں کو روزگار دلانے کی غرض سے ہاری پربت کے گرد ایک بھاری دیوار تعمیر کروانے کے احکامات صادر کئے اور شالبافی کو بھی فروغ دیا۔ چنانچہ مغل دور میں کشمیر کے شال یوروپ، فرانس اور برطانیہ کے بازاروں میں بکنے لگے۔ اکبر نے ٹوڈرمل کے ذریعے زمین کا بندوبست کروا کر مالیہ مقرر کروایا۔ ۱۶۰۵ء میں جب وادی میں قحط پڑا تو اکبر نے پکھلی، بھمبر اور مغربی پنجاب سے ہزاروں من غلہ برآمد کر کے کشمیر روانہ کیا۔ بامزئی کی تاریخ کے مطابق قریب ایک لاکھ لوگوں کو کچھ عرصہ تک عیدگاہ میں مفت کھانا دیا گیا۔ جب اکبر نے نئے شہر "نگر ناگر" کا افتتاح کیا تو اُس نے بڈشاہ کی طرح جہلم کے جنم دن کی تقریب میں شرکت کی۔ اِس روز جہلم کے دونوں کناروں پر چراغاں کیا گیا اور پرندے میں بادشاہ کا دریائی جلوس نکالا گیا۔

جہانگیر کشمیر کی خوبصورتی کا بے حد مدّاح تھا۔ اُس نے ملکہ نورجہاں کے ساتھ کئی بار کشمیر کا دورہ کیا۔ جہانگیر لوگوں کے مسائل کا خود مشاہدہ کرتا اور عوام کی شکایات سُن کر موقعہ پر ہی مناسب احکامات صادر کرتا۔ مرزا علی اکبر کے بعد کشمیر کے انتظامیہ کو حسب ذیل صوبیداروں نے چلایا:

(۱) ہاشم خان (۱۶۰۹ سے ۱۶۱۲ تک) (۲) سردار خان (۱۶۱۲ سے ۱۶۱۵ تک)
(۳) احمد بیگ (۱۶۱۵ سے ۱۶۱۸ تک) (۴) دلاور خان (۱۶۱۸ سے ۱۶۲۰ تک)
(۵) ارادت خان (۱۶۲۰ سے ۱۶۲۲ تک) (۶) اعتقاد خان (۱۶۲۲ سے ۱۶۲۳ تک)

ماسوائے اعتقاد خان کے باقی سبھی گورنروں نے کشمیر کا انتظامیہ قابلیت اور ہوشیاری سے چلایا۔ جہانگیر کے دور میں کشمیر کو جو یادگاری تحفے مِلے اُن میں شالامار اور نشاط باغ کی تعمیر کے علاوہ ویری ناگ کے ہشت پہلو چشتے اور اچھہ بل باغ کی تعمیر شامل ہیں۔ یہ مقامات آج بھی قریب قریب اُسی آن بان کے ساتھ کشمیر کے رہنے والوں اور باہر کے سیاحوں کو اپنی طرف کشش کرتے ہوئے مغلیہ دور کے تعمیری اور جمالیاتی ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔ سرینگر کے نشاط باغ اور شالامار کو لوگ ابھی تک مغل باغات کے نام سے جانتے ہیں۔ مغل دور کی ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں کشمیر میں ایک ہندو مسلمان لڑکی سے اور مسلمان ہندو لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ بعد میں جہانگیر نے مسلمان لڑکی کی شادی ہندو سے ممنوع قرار دی۔ جہانگیر کے دور میں مالیہ ۷۷،۶۴،۷۰،۰۰۰ دام تک پہنچ گیا۔ جہانگیر نے سرکاری ملازموں کو مفت میوے فراہم کرنے، گورنر اور اُس کے عملے کے لئے دیہاتیوں کو بیگار پر لگانے کے نامناسب اقدام بھی کئے۔ اُس نے شیعہ فرقے پر بھی ظُلم روا رکھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ جب مرتے وقت جہانگیر سے پُوچھا گیا کہ آپ کی آخری خواہش کیا ہے تو اُس نے کہا:

کشمیر کے سِوا کچھ بھی نہیں ۔

از شاہِ جہانگیر دَم نزُع چُو جستند
با حسرتِ دل گفت کہ کشمیر دِگر ہیچ

۱۶۵۸ء سے ۱۶۶۷ء تک شاہجہان کا دورِ حکومت رہا۔ اس عہد میں نو صوبیداروں نے کشمیر پر حکومت کی۔ ان گورنروں میں سے ظفر خان، علی مردان خان اور لشکر خان کے عہد حکومت کو

ہم عصر مورخوں نے بری عوام کے لئے اچھا کام کرنے پر سراہا ہے۔ اعتقاد خان نے عوام کی مشکلوں میں حسب ذیل اقدامات کا نفاذ کیا:

۱۔ پاپور کے ارد گرد کے دیہاتیوں کو سرکاری زعفران جمع کرانے کے لئے بلا معاوضہ کام پر لگانا۔

۲۔ جنسی مالیہ کے فی خروار چاول پر چار دام کا مزید محصول۔

۳۔ کسی بھی ایسے گاؤں، جس سے ۴۰۰ خروار چاول سے زاید مالیہ وصول ہوتا، سے دو موٹے بھیڑ یا مزید ۶۰ دام نقدی، مقامی افسروں کے لئے طلب کرنا۔

۴۔ میوہ باغات کی پیداوار سرکاری افسروں کے ذریعے فروخت کرانا جس کے نتیجے کے طور پر مالکانِ باغات نے مایوس ہو کر ثمر دار درختوں کو کاٹنا شروع کیا۔

۵۔ کشتی بانوں کے مالیہ میں اضافہ۔

لیکن شاہجہان نے ان سبھی اقدامات کو منسوخ کروالیا۔ اس عہد کے گورنر ظفر خان نے بوڑکدل، سرینگر میں "گلشن" نام سے اور ڈل کے کنارے حسن آباد نام کے باغات تعمیر کرائے۔ اُس نے فارس اور کابل سے اچھے پیوند منگوا کر کشمیر کے میوہ جات کی QUALITY میں اضافہ کیا۔ فراشی سیب اسی دور میں کشمیر آیا۔ چشمہ شاہی اور شالامار کے سب سے اوپری طبقے کی تعمیر بھی اسی دور میں ہوئی۔ جہاں تک پری محل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر دارا شکوہ نے کی تا کہ اس محل میں صوفی مدرسہ اور رصدگاہ (OBSERVATORY) کو قایم کیا جا سکے۔ مغل دور میں کشمیر سے کئی کاریگر مغل باغات کی ریاست سے باہر تعمیر کے واسطے لئے گئے۔ یہاں تک کہ تاج محل کی تعمیر میں بھی کشمیری کاریگروں نے حصہ لیا۔ جب ۱۶۴۲ء میں سرینگر اور اس کے آس پاس زبردست سیلاب سے فصلیں تباہ ہونے سے قحط پڑا تو شاہجہان نے پنجاب سے غلہ منگوا کر لوگوں میں تقسیم کرایا۔

اورنگ زیب کے دور میں جو ۴۹ سال تک جاری رہا، قریب چودہ صوبیداروں نے کشمیر پر حکومت کی۔ اسی عہد میں سیف خان نے صفاکدل تعمیر کرایا اور اُس کے صلاحکار چودھری مہیش نے اشٹبر کے قریب باغ تعمیر کروایا۔ مغل دور میں ڈل کے کنارے کنارے کوئی سات سو مغل باغات تعمیر کئے

گئے تھے۔ اس بات سے مغلوں کے اس شوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو قدرتی خوبصورتی کو بڑھاوا دینے کے لئے اُن کے دِلوں میں موجود تھا۔ چنانچہ افغان گورنر امیر خان جواں شیر نے اکبر کے پُرانے شہر کو اس لئے مسمار کیا کہ ڈل جھیل میں سونہ لنک کے جزیرے پر محل تعمیر کیا جا سکے۔ اُس کی تقلید اُس کے ہانجی رشتہ داروں نے اپنے مکانات تعمیر کرانے کیلئے ... مغل باغات کو تباہ کر کے کیا۔

اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں جن صوبیداروں کے تحت کشمیر میں امن و قانون قائم رہا اُن میں اعتماد خان، حفیظ اللہ خان اور فضل خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِسی دور کے بارے میں کشمیریوں کی ذہانت اور کاریگری کی تعریف برنیر یوں کرتا ہے:

> "کشمیری دانائی کے لئے مشہور ہیں اور ہندوستانیوں سے زیادہ عقلمند مانے جاتے ہیں۔ شاعری اور علوم میں وہ پرشینز (PERSIANS) سے کچھ کم نہیں۔ وہ کافی ہوشیار اور محنتی ہیں۔ پلنگوں، ڈولیوں، قلم دانوں، صندوقوں، چمچوں اور دیگر اشیا پر اُن کی کاریگری اور نفاست غیر معمولی ہے۔ اُن کی مصنوعات اور دیگر چیزیں ہندوستان میں ہر جگہ کام میں لائی جاتی ہیں۔ وہ روغن سازی کے کام میں ماہر ہیں۔ لکڑی کی خوبصورت رگوں سے وہ اتنے واقف ہیں کہ ان رگوں کی جگہ سُنہری تار وہ اِس خوبصورتی سے لگاتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا مکمل اور شُستہ کام اور کہیں نہیں دیکھا۔"

اس سے کئی باتوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً پلنگوں اور ڈولیوں کا بنانا۔ پلنگوں کی جگہ اب (BED) نے لی ہے اور ڈولیاں اب کم ہی نظر آتی ہیں لکڑی میں سنہری تار لگانے کا کام بھی اب شاذ ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ شالبافی کی بھی بے حد تعریف کرتا ہے جو اُس وقت کشمیر کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مغل دور میں کشمیر کی دست کاریوں اور صنعتوں کو بڑھاوا ملا۔ اس کے باوجود اِس دور میں طاعون جیسی وباؤں، خطرناک سیلابوں اور قحط نے یہاں کے عوام کو کئی دفعہ بے حد پریشان کیا اور وطن چھوڑنے پر بھی مجبور کیا۔ لیکن زندگی چلتی رہی اور لوگ دُکھ سُکھ جھیلتے رہے۔ بعض دفعہ دبی دبی صُورت میں مشکلوں کے خلاف لوگ لڑتے رہے اور آخر کار ایک وسیع ملک کے نظام حکومت میں کھو گئے۔ کشمیریوں سے مغل دور

میں لگاتار بیگار لیا جاتا رہا۔ اس کے باوجود کچھ اہم کام پورے ہوئے۔

مغلیہ دور کے بارے میں سرجدوناتھ سرکار کہتے ہیں کہ اس دور نے ملک کو ایک کیا اور مندرجہ ذیل اہم کام پورے ہوئے:

۱۔ ملک کے سبھی صوبوں میں ایک جیسا انتظامیہ۔

۲۔ ایک سرکاری زبان یعنی فارسی کا چلن۔

۳۔ سارے ملک میں ایک ہی سکّے کا نظام۔

۴۔ اعلیٰ سرکاری حکام کا آل انڈیا کاڈر (CADRE) جن کو ہر تین یا چار سال کے بعد ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تھا۔

۵۔ ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک افواج کا آنا جانا۔

۶۔ مرکز سے معاینہ کرنے والے اعلیٰ احکام کی تعیناتی۔

مغلیہ دور میں جو بغاوتیں راجپوتانہ، پنجاب، مہاراشٹر اور دکن میں مغل شاہی کے خلاف ہوئیں انھوں نے رانا پرتاپ، شواجی، گورو ارجن دیو، رانی درگا وتی اور عبداللہ قطب شاہ جیسے بہادروں کو جنم دیا۔ ان بہادروں نے مغل بادشاہوں کے سامنے کبھی ہار نہ مانی اور آخر کار ان ہی کوششوں سے اس جاگیر شاہی کا ڈھانچہ درہم برہم ہوا۔ ۱۶۷۷ء میں جب شواجی نے حیدرآباد کا دورہ کر کے قطب شاہ سے مغلوں کی مفاہمت کے بارے میں ایک معاہدہ طے کیا تو ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ شواجی نے چھ لاکھ "ہون" (تین روپے کے برابر سکّہ) سالانہ، شاہ کو خراج ادا کرنے کی رضامندی ظاہر کی اور اس معاہدے نے اس بات پر مہر تصدیق ثبت کی کہ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف (جو بعد میں حکمران بنے) ہندوستان کے سبھی لوگ خوش نہ تھے بلکہ وہ اس جاگیردارانہ بادشاہت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ یہی آواز یوسف شاہ چک نے بھی بلند کی جو اکبر کے بہکاوے میں آکر دھوکہ کھا گیا اور زندگی کے آخری ایام قید و بند کی صعوبتوں میں گزار کر بسوک (بہار) میں رحلت کر گیا۔ اُس کی غیر حاضری کے دوران حبہ خاتون کی زندگی میں بھی بے حد مشکلوں کا اضافہ ہوا۔ بہرحال ہر نظام ایک نئے نظام کے لئے جگہ دیکر تاریخ کے صفحوں میں گم ہو جاتا ہے

اور باقی رہتے ہیں کچھ نقوش اور کچھ تلخ و شیریں یادیں ۔۔ ۔

کتابیات

۱، دی مغل ایمپائر
(THE MUGHUL EMPIRE)
جنرل ایڈیٹر، آر سی ، ماجُم دار
(R.C. MAJUMDAR)
۲، اے ہسٹری آف کشمیر، مصنف پرتھوی ناتھ کول بامزئی
۳، آئین اکبری ، مصنف ابوالفضل

عبدالغنی شیخ

مغل اور لداخ

لداخ پر مغلوں کی عمل داری تقریباً ایک صدی تک رہی۔ تاہم یہ عمل داری عملی PHYSICAL نہیں تھی یعنی مغلوں کا کوئی نمائندہ لداخ میں نہیں رہتا تھا البتہ لداخی راجے مغلوں کے باج گزار تھے اور مغلیہ حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے تھے۔

مغل حکومت کی مداخلت کی شروعات جہاں گیر (۱۶۰۵ء - ۲۷) کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ شاہجہان (۱۶۲۷ء - ۱۶۵۸) کے زمانے میں مغلوں کا اثر و نفوذ بڑھا اور اورنگ زیب کے عہد میں اس کی گرفت مضبوط ہوئی جب لداخ نے مغلوں کے اقتدارِ اعلیٰ کو من و عن قبول کیا۔ محمد شاہ کے بعد مغلیہ حکومت کو زوال آیا اور اس کے ساتھ لداخ میں مغلوں کا اثر ختم ہوا۔

جہاں گیر سے بہادر شاہ تک لداخ میں چھ راجوں نے حکومت کی۔

سینگے نمگیل ۱۶۴۲ء - ۱۶۲۴ء

دیلدن نمگیل ۱۶۹۴ء - ۱۶۴۲ء

دیلگس نمگیل ۱۶۹۱ء - ۱۶۸۰ء

نیما نمگیل ۱۷۲۹ - ۱۶۹۴ء
دیسکونگ نمگیل ۱۷۳۹ - ۱۷۲۹ء
پنچگ نمگیل ۱۷۵۳ - ۱۷۳۹ء

"ویلدن نمگیل نے اپنی حیات کے دوران شاہزادہ ولیعہد دیلگیس کو ۱۶۸۰ء میں تخت کا وارث بنایا۔ ویلدن اپنے بیٹے کے تین سال بعد فوت ہوا۔"

جب لداخ کے ہمسایہ بلتستان اور اس کے علاقہ پُوریگ (کرگل) کے لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو مغلوں کو لداخ کی سیاسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ جہاں گیر کا دورِ حکومت تھا۔ بلتستان کے ایک راجہ کی بیٹی سے بھی جہاں گیر کا عقد ہوا۔ بلتیوں کو اس رشتے پر بڑا ناز تھا۔ جہاں گیر نے بلتستان میں ایک فوجی مہم بھی بھیجی جو کامیاب نہیں رہی۔

مغل لداخ کو تبتِ "بزرگ" کہتے تھے اور بلتستان کو تبت خورد کے نام سے پکارتے تھے۔ لداخیوں نے مغلوں کو "ہور" کہا ہے۔ تاریخِ لداخ "گیا برس" میں جا بجا ہور کا ذکر ہے۔ چینی ترکستان کے باشندوں کو بھی لداخی 'ہور' کہتے ہیں۔

جہاں گیر سے پہلے مغلیہ حکومت اور لداخ کے درمیان کسی رابطے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے تاہم اکبر اعظم کو کشمیر کے پشمینہ شال کی قدر و قیمت کا احساس تھا۔ مغل بیگمات اور درباری اس کے بڑے قدرداں تھے۔ یہ پشمینہ مغربی تبت اور لداخ کے راستے کشمیر برآمد ہوتا تھا۔

بابر کے زمانے میں مرزا حیدر گورگان کسی خون خرابہ کے بغیر جب دوسری مرتبہ لداخ پر قابض ہوا تو مرزا نے یہ قبضہ بابر کے نام پر کیا۔ بابر سے مرزا کا رشتہ بھی تھا۔ لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ مرزا کی پیٹھ مڑتے ہی اس کی عمل داری ختم ہوئی۔ مرزا نے پہلا حملہ ترکستان کے سلطان سعید خان کے ایماء پر قراقرم کے راستے کیا تھا اور تین ماہ تک لداخ پر قابض رہا تھا۔

کئی مورخوں نے مغلوں اور لداخیوں کے آپسی رابطوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں عبدالحمید لاہوری کا "بادشاہ نامہ"۔ محمد اعظم کی "تاریخ کشمیر"۔ ذکاء اللہ کی تاریخ ہند"۔ حشمت اللہ کی "تاریخ جموں کشمیر

لداخ و بلتستان، فرانکی کی " دی ہسٹری آف ویسٹرن تبت "۔ لوکینو پیٹک کی " دی کنگ ڈم آف لداخ "۔ برنیر کا 'سفر نامہ' اور دوسری تصنیفات جیسے عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری شامل ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ اور عبدالحمید لاہوری نے شاہجہان کی مہم لداخ کا ذکر کیا ہے۔ اوّل الذکر " تاریخ ہند" میں لکھتا ہے:

" شاہجہان کے حکم پر ظفر خاں حاکم کشمیر نے آٹھ ہزار سوار اور پیادے کی جمعیت سے حملہ کیا۔ یہ کرتسے کی راہ سے روانہ ہوا اور ایک ماہ کے عرصے میں اسکردو آیا۔ اُن دنوں بلتستان کا سلطان علی رائے پدرِ عبدال تھا۔ تبت کی دو راہیں ہیں۔ ایک کرتسے[۶] اور دوسری لار سے ہے۔ کرتسے کی راہ لار سے چار منزل زیادہ ہے۔ ایک سوار سے زیادہ نہیں چل سکتا مگر لار کی راہ تکلیف دہ ہے۔ اس راستے پر ایک برفانی پہاڑ ہے جسے عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہ کشمیر سے ایک کم تیس کوس دور ہے۔"

ملک تبت میں اکیس پرگنے ہیں اور ستیس قلعے۔ پورے سال کے اناج یا خراج کا حاصل ایک لاکھ روپے ہے۔ اس دیار میں ایک ندی[۷] ہے جس سے ہر سال دو ہزار تولہ سونا حاصل ہوتا ہے۔ دوسری جگہ وہ لکھتا ہے: "سرزمین لداخ میں اکثر ویرانہ اور لاحاصل دشت ہیں جو کاشت کاری کے قابل نہیں اور ان سے کچھ محصول حاصل نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بادشاہ نے وہاں خطبہ و سکہ جاری کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔"

'بادشاہ نامہ' میں عبدالحمید لاہوری نے اس حملے کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

"نے مغل شہنشاہ شاہ جہان (۱۶۲۷-۵۸ء) نے علی میر کے بیٹے عبدل اور آدم خان کے بیٹوں کی ناچاقی کا فائدہ اٹھا کر (۲۸ اگست ۱۶۳۸ء میں) ایک فوج بھیجی جو اسکردو میں

---

[۵] LUCIANO PETECH

[۶] کرتسے موجودہ لداخ کا ایک گاؤں ہے۔

[۷] غالباً دریائے سندھ سے مراد ہے۔

داخل ہوئی اور آدم خان کو مُغل شہنشاہ کے زیرِ نگین تخت کا وارث قرار دیا"۔

اسی اثنا میں لداخ کے نامور راجہ سینگے نمگیل نے پوریگ (علاقہ کرگل) پر حملہ کر کے اسے اپنے زیرِ نگین لایا۔ اسکردو کے راجہ آدم خان نے کشمیر کے مغل گورنر علی مراد خان کو اس سے آگاہ کیا اور مدد مانگی۔ علی مراد خان نے حسین بیگ کی سرکردگی میں پیدل اور سوار فوجی دستے روانہ کئے۔ ۱۶، جون ۱۶۳۹ء کو یہ لشکر زوجی لا سے ہوتا ہوا لداخ کی حدود میں داخل ہوا۔ آدم خان اپنی فوج کے ساتھ اس لشکر سے آملا۔ بودھ کھربو کے پاس لڑائی ہوئی۔ سینگے نمگیل کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور اُس نے کھربو کے قلعہ میں پناہ لی۔ راجہ نے صلح کے لئے حسین بیگ کے پاس ایک قاصد بھیجا اور یہ وعدہ کیا کہ اگر اسے صحیح وسلامت لیہہ واپس جانے دے گا تو شہنشاہ کو خراج ادا کرے گا۔

سینگے نمگیل کو زیر کرنے کے بعد حسین بیگ واپس کشمیر گیا۔

فرانسیسی سیاح برنیر نے بھی اس حملے کا ذکر کیا ہے۔ اس نے کشمیر میں اپنی سیاحت کے دوران ۱۶۶۳ء میں یہ معلومات حاصل کی تھیں۔

برنیر کے مطابق مُغل کمانڈر نے اگلی بہار میں مزید فوج کشی کا ارادہ کیا اور راستہ بند ہونے کے اندیشے کے تئیں واپس کشمیر چلا گیا۔ مفتوح قلعے میں فوج کا ایک دستہ رکھا لیکن غیر متوقع طور اس فوج نے دشمن کے خوف یا رسد کی قلت کی وجہ سے قلعے کو خالی کیا اور واپس چلی گئی۔ اس طرح لیہہ حملے سے بچ گیا۔

لداخ کی شاہی تاریخ "گیالربس" میں بھی اس حملے کا ذکر ہے۔ لداخی تاریخ میں شاہ جہان کو 'پادسا راجان' (بادشاہ شاہجہان) کہا گیا ہے اور متضاد حقائق دئے گئے ہیں۔ گیالربس کے مطابق "بلی راجہ آدم خان نے پادسا راجان کی فوج لائی۔ کھربو میں گھمسان کا رن پڑا۔ اور بہت سارے ہور (مغل) مارے گئے اور (سینگے نمگیل نے) دشمن پر مکمل فتح حاصل کی"

تاہم مورخین اس سے متفق نہیں ہیں۔ پیٹیک، فرانکی، حشمت اللہ اور سبھی لکھتے ہیں کہ سینگے نمگیل کو اس لڑائی میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد راجہ نے کبھی پوریگ کی طرف پیش قدمی نہیں کی۔ پیٹک لکھتا ہے کہ سینگے نمگیل نے مغلوں کو خراج ادا نہیں کیا۔ کشمیر سے لداخ میں کسی کا

داخلہ ممنوع قرار دیا۔ تب وسطی ایشیا سے کشمیر اور پنجاب وغیرہ کی تجارت اسکردو اور شگر کے راستے ہونے لگی۔ ہندوستان اور وسطی تبت کا تجارتی لین دین پٹنہ، نیپال اور لہاسہ منتقل ہوا۔ تجارتی شاہراہ بند ہونے سے لداخ کی تجارت کو دھکا لگا اور لداخیوں کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

پیٹک کا اندازہ ہے کہ ۱۶۳۹ء میں لیہہ، سری نگر شاہراہ بند ہونے کے بعد یہ دوبارہ پچیس چھبیس سال بعد کھلی جب ویلدن نمگیل نے اورنگ زیب کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کیا۔

سینگے نمگیل کا جانشین ویلدن نمگیل تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں جب اورنگ زیب کشمیر آیا تو راجہ نے شہنشاہ سے ملنے ایک وفد بھیجا (غالباً اورنگ زیب کی تحریک پر)۔ وفد نے اورنگ زیب سے وفاداری کا اظہار کیا اور مغل حکومت کو سالانہ خراج ادا کرنے اور لیہہ میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا وعدہ کیا۔ ان دنوں برنیئر سری نگر میں تھا۔ اس نے وفد سے بات چیت کی۔ برنیئر لکھتا ہے کہ ویلدن نمگیل نے محض حملے کے خوف سے مغل حکومت کے ساتھ دوستانہ جذبات کا اظہار کیا۔

جب اورنگ زیب کشمیر سے لوٹا تو ویلدن اپنے وعدے سے مُکر گیا لیکن اورنگ زیب نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس کو ٹالنا ویلدن کے بس کی بات نہیں تھی۔" اورنگ زیب نے کشمیر کے مغل گورنر سیف خان کو حکم دیا کہ کسی لائق اور معتمد اہل کار کے ذریعے ویلدن کے پاس نصیحت آمیز پیغام بھیجے کہ وہ راہ ضلالت سے باز آجائے، اطاعت قبول کرے اور شاہی سکہ اور خطبہ جاری کرے، مسجد تعمیر کرے اور راہِ راست پر آکر بادشاہی عنایت کا امیدوار ہو۔ اگر وہ یہ باتیں نہ مانیں تو اس پر چڑھائی کی جائے گی اور اس کے ملک کو پامال کر دیا جائے گا۔

ویلدن نمگیل کو بھی الگ سے ایسا ہی فرمان بھیجا جو سیف خان نے ایک اہل کار محمد شفیع کے ہاتھ تبت (لداخ) روانہ کیا۔ راجہ نے پہلے روگردانی کی لیکن بعد میں تعمیل حکم میں اپنی بہبودی جانی۔ پہلے ہی جمعہ کو اہلِ شہر کو شہر کے باہر جمع کیا۔ بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (غازی) کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور خطیب کے سر پر سونے چاندی کے پھول نچھاور کئے۔ خلعت فاخرہ پہنایا اور مسجد بنائی۔ دو ہزار اشرفیاں اور نو ہزار روپے عالمگیر کے نام تحفے میں بھیجے۔ عرضداشت معہ نذر فرمان کے جواب میں

کمال عبودیت ظاہر کر کے محمد شفیع کے ہاتھ روانہ کی اور اس کے ہمراہیوں کی خوب خدمت کی۔"[1]

پیٹک نے لکھا ہے۔ راجہ کو مغل سرکار نے "تبت بزرگ کا زمیندار" کے نام سے یاد کیا ہے راجہ کے عمّال نے لیہہ سے چھ میل دور محمد شفیع کا سواگت کیا۔"

'تاریخ کشمیر' کے مصنف محمد اعظم نے اس واقعہ کو مغلوں کے ہاتھوں "تبت بزرگ" کی فتح سے تعبیر کیا ہے۔ جو غلط ہے۔

۱۹ دسمبر ۱۶۶۵ء کو اورنگ زیب کو اس کا علم ہوا۔ بعد میں اورنگ زیب کا دوسرا فرمان آیا۔ اس کا مضمون یہ ہے۔

"سیف خان کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تم نے اطاعت قبول کی ہے اور ملک تبت میں خطبہ اور سکہ ہمارے نام کا جاری کرنا اور مسجد بنانا تسلیم کر لیا ہے، لہذا خطاب راجگی اور خلعت سے تم کو سرفراز کیا جاتا ہے۔"[2]

راجہ ویلدن نمگیل کی طرف سے بھی اورنگ زیب کو اطاعت کا خط ملا۔ اس کے جواب میں مغل شہنشاہ نے لکھا۔

"تمہاری عرضداشت پہنچی کہ تم نے خطبہ و سکہ ہمارے نام کا اپنے ملک میں جاری کر دیا ہے اور مسجد کی تعمیر بھی شروع کر دی ہے۔ سیف خان نے بھی اس کی تصدیق کی لہذا خلعت فاخرہ اور خنجر مرصع تمہاری سرفرازی کی غرض سے بھیجا جاتا ہے۔"[3] یہ ۶۷ - ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ جب لیہہ کی مسجد تعمیر ہوئی یا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

منشی حشمت اللہ نے اپنے قیام کے دوران، لیہہ میں یہ فرمان دیکھے تھے۔ انہوں نے

تاریخ ہند، جلد ہشتم، ذکاء اللہ

[2] تاریخ جموں و کشمیر، لداخ و بلتستان از حشمت اللہ

[3] "تاریخ جموں و کشمیر، لداخ و بلتستان" از حشمت اللہ

تاریخ کشمیر، جموں، لداخ و بلتستان میں لکھا ہے:

مجھے بادشاہ عالمگیر کے دو فرمان بنام ویلدن نمگیل لداخ میں دستیاب ہوئے۔ ایک تقریباً ۱۰۷۸ھ مطابق ۱۶۶۱ء ہے جب کہ دوسرے کا سنہ نہیں پڑھا گیا۔”

لوکنیو پیٹک رقم طراز ہے کہ ”اورنگ زیب نے ویلدن نمگیل کا نام بدل کر مسلم نام عاقبت محمود رکھا لیکن فرانکی اور حشمت اللہ نے یہ نام ویلدن کے بیٹے اور جانشین دیلیگس نمگیل سے منسوب کیا ہے۔ لیکن لداخ کی تاریخ میں اس نام کے رکھے جانے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ دہلی کی سرکاری خط و کتابت میں یہی نام ہے۔”

’عالمگیر نامہ‘ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اورنگ زیب نے اسکردو کے حکمران مراد خان کو بھی خلعت عطا کیا۔ اس کے دادا محمد مراد نے ۱۶۳۷ء میں لداخیوں کے خلاف مسلمانوں کی حمایت کی تھی۔

۱۶۶۶-۶۷ء میں شیخ محی الدین نے لیہہ کی موجودہ جامع مسجد کی تعمیر کی۔

۱۶۷۴ء میں لداخ نے پھر ایک مرتبہ بلتستان کے معاملات میں مداخلت کی۔ اسکردو کے حکمران نے کشمیر کے مغل گورنر کو اطلاع دی اور پوریگ تک فوج آئی، لیکن لداخیوں نے اس فوج کو روک لیا اور معاملہ ٹل گیا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ لداخ کے سرکردہ تاریخ دانوں اور تاریخ نویسوں میں مذکورہ راجوں کے دورِ حکومت کے سن و سال سے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سینگے نمگیل کے دور کو لیجئے۔ چار سرکردہ مورخوں نے مختلف تاریخیں دی ہیں۔

نام مصنف	راجہ سینگے نمگیل کا سن حکومت
ایس۔ ایس۔ گیرگن	۱۵۹۴ - ۱۵۶۹ء
حشمت اللہ	۱۶۴۵ - ۱۶۱۰ء
فرانکی	۱۶۲۰ - ۱۵۹۰ء
پیٹک	۱۶۴۲ - ۱۶۲۴ء

راقم نے اوپر پیٹک کی دی گئی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے۔ میری دانست میں پیٹک نے لداخ کی تاریخ پر سب سے زیادہ تحقیق کی ہے۔

ویلدن نمگیل کے بیٹے اور جانشیں دلیگیس نمگیل کے زمانے میں بھوٹان اور تبت کے درمیان بودھوں کے دو فرقوں کے نام پر جھگڑا ہوا۔ دے لیگیس نمگیل نے اس جھگڑے میں اپنی ٹانگ اڑائی اور بھوٹان کی حمایت کی جہاں لوگ سرخ فرقہ کے ڈوگپا عقیدہ کو مانتے ہیں۔ لہاسہ پر اس کا سخت ردّ عمل ہوا اور تبتی اور قلمق کی ایک مشترکہ فوج نے لداخ پر ہلہ بول دیا۔ لداخیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ راجہ کو لیہہ چھوڑ کر پچیس میل دور بزگو میں پناہ لینی پڑی جہاں فریقین کی فوجوں کے درمیان لمبی مدت تک جھڑپیں ہوتی رہیں۔

آخر کار دلیگس نمگیل نے کشمیر کے مغل گورنر ابراہیم خان سے مدد کی درخواست کی۔ اورنگزیب اُن دنوں دکن کی مُہم میں لگا تھا لیکن وہ سلطنت کے دوسرے معاملات سے غافل نہیں رہتا تھا۔ اس نے فوراً ہدایت دی کہ حملہ آوروں کی سرکوبی کی جائے۔ ابراہیم خان کے بیٹے فدائی خان کی سرکردگی میں مغل فوج لداخ روانہ ہوئی۔ نیمو اور بزگو کے درمیان چارگیال نام کے میدان میں فریقین کے درمیان لڑائی ہوئی۔ تبت اور قلمق کی مشترکہ فوج کو شکست فاش ہوئی اور یہ بہت سارا سامان چھوڑ کر فرار ہوگئی۔

دے لیگس نمگیل نے شہنشاہ ہند کے اقتدار اعلیٰ کو قبول کیا اور سالانہ خراج دینا قبول کیا۔ دوسری روایت کے مطابق ہر تیسرے سال خراج دینا مان لیا۔ اس کے تحت ابلق گھوڑے ۱۸، مشک نافہ ۱۸ اور یاک کی دم ۱۸ عدد مغل گورنر کو پیش کرنے کا معاہدہ ہوا۔ کشمیر کے گورنر نے راجہ کو سری نگر کے پاس نوشہرہ میں جاگیر عطا کی جس سے سالانہ پانچ سو بوریاں چاول آتی تھیں۔ جب تک کشمیر پر مغلوں کی عمل داری رہی، یہ جاگیر بھی قائم رہی۔

راجہ اور مغلوں کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا۔ کشمیر کو ایک گاؤں دیا گیا۔ اس گاؤں کی نشاندہی نہیں ہوئی ہے۔ شاید یہ سونہ مرگ کے پاس واقع گاؤں نیلاگراٹ ہے جہاں لوگ بلتی نسل کے ہیں اور زبان، کلچر وغیرہ بلتی اور لداخی ہیں۔ کشمیر کو پشمینہ اور اون کی تجارت پر اجارہ داری حاصل ہوئی۔ مآثر عالمگیری اور تاریخ کشمیر کے مطابق یہ معاہدہ لگ بھگ ۱۶۸۵ء میں عمل میں آیا۔ میر عزت اللہ ۱۸۱۲ء میں جب لداخ

آیا تو معاہدے پر عمل ہو رہا تھا۔ اس کے دس سال بعد جیب مور کرافٹ لیہہ پہنچا تو لداخ کا آخری راجہ تنڈوپ نمگیل اس معاہدے پر کاربند تھا۔

معاہدے کے بعد فدائی خان واپس کشمیر لوٹا اور اپنے ساتھ دیلیگس کے ایک بیٹے جگسپال اور چند معززین کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ بیٹک نے جگسپال کو ویلدن نمگیل کا بیٹا بتایا ہے۔ اس لڑائی کے دوران ویلدن زندہ تھا اور دیلیگس کے حق میں تخت سے دست بردار ہوا تھا۔

تبت کی راجدھانی لہاسہ میں لداخ اور مغلوں کے تعلقات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ چنانچہ لہاسہ کی حکومت نے ایک مذہبی آدمی لامامی پھم وانگپو کو لیہہ روانہ کیا۔ انہوں نے راجہ سے کہا،

'ہم ہم قوم اور ہم مذہب ہیں۔ اگر غیروں کو مداخلت کی اجازت دی گئی تو اس کا نتیجہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ آئندہ کے لئے ہم اقرار کرتے ہیں کہ لداخ پر کبھی حملہ نہیں کریں گے۔"

راجہ نے اتفاق کیا اور کہا کہ کشمیر کی طرف سے کبھی فوج کشی ہوئی تو وہ اس کی مدافعت کا ذمہ دار ہوگا۔

لداخی راجہ اور تبت کے مابین تنگ لوگنگ کا مشہور معاہدہ عمل میں آیا اور لداخ تبت کی سرحدوں کی حد بندی ہوئی۔ تب سے ان سرحدوں میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا ہے۔

تبت کے مذکورہ سیاسی مشن کا مغلوں اور لداخ کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ لداخی راجہ بدستور مغلوں کو خراج بھیجتا رہا۔

۹ جنوری ۱۶۹۶ء کو اورنگ زیب نے دیلیگس کے وارث اور جانشین نیما نمگیل کو مراسلہ بھیجا جس کا متن حسب ذیل تھا:

"آپ کے دادا راجہ عاقبت محمود خان کی موت کی خبر سنی۔ تم کو خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا جاتا ہے اور منصب یک ہزاری ذات و یک ہزار سوار دو اسپ امتیاز بخشا جاتا ہے۔ فرقہ قلمق کو اپنے ملک میں داخل ہونے نہ دو اور اپنے ملک کے لوگوں کو راضی اور شاکر رکھو اور شعائر اسلام کی ترویج میں کوشش کرتے رہو"[1]۔

---

[1] ماخوذ "تاریخ جموں و کشمیر لداخ و بلتستان" از حشمت اللہ

لداخی مورخ ایس، ایس گیرگن کے پاس اس خط کا فارسی متن موجود ہے۔

نیما نمگیل نے اپنے باپ کی طرح مغلوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے۔ اس کے بیٹے اور جانشین دلیکیونگ نمگیل کی بھی یہی پالیسی رہی۔

۶ رجب ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ء کو مغل فرمانروا محمد شاہ نے دلیکیونگ نمگیل کو خلعت سے نوازا اور وفادار رہنے کے لئے فرمان بھیجا۔ اس کا متن حشمت اللہ نے یوں دیا ہے:

”تمہاری عرضداشت ملی، جس میں تم نے لکھا ہے کہ تم مراتب عقیدت پر خلوص کے ساتھ قائم ہو۔ اس بنا پر خلعت فاخرہ سے تم کو افتخار کیا جاتا ہے۔ تم کو لازم ہے کہ شکرگذاری کے ساتھ فرمانبرداری وخدمت گزاری میں ثابت اور راسخ ہو۔“

لداخ کے راجہ پنچگ نمگیل (۱۷۳۹ - ۵۲) کے دور میں راجہ اور اس کے چچا اور پوریگ (کرگل) کے حکمران ٹشی نمگیل کے درمیان کسی بات پر سخت اختلاف ہوا۔ چچا اور بھتیجا دونوں نے مغل حکمران سے رجوع کیا اور کشمیر کے گورنر سے مدد کی درخواست کی۔ لیکن مغل حکومت زوال پذیر تھی۔ اب ہند میں احمد شاہ درانی کا بول بالا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں مغل فوج کو ایک زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لئے فریقین کی درخواست بے کار گئی۔

لداخ کی سماجی زندگی اور کلچر پر مغلوں کا معمولی اثر پڑا ہے۔ کیونکہ لداخیوں کے ساتھ مغلوں کا براہِ راست میل جول بہت کم رہا۔ مغل فوج آندھی کی طرح آئی اور بگولے کی طرح واپس گئی۔

تبت، چینی ترکستان اور کشمیر کی طرح مغلوں سے لداخ کے سماجی، تجارتی، ثقافتی یا مذہبی رابطے نہیں رہے، تاہم کچھ اثرات کا مورخوں نے ذکر کیا ہے۔ HIMALAYAN TIBET میں منجیت سنگھ نے ایک ہزار سالہ پرانے گنپہ الچی کی مصوری پر مغل آرٹ کے اثر کا ذکر کیا ہے۔ لیہہ کی جامع مسجد اور پوریگ (کرگل) کی مسجدوں کے فن تعمیر میں مغل اور اسلامی اثر نمایاں ہے۔ بلتی زبان میں متعدد فارسی الفاظ ہیں۔ بلتی غزل سارے لداخ میں بڑی مقبول ہے۔ یہ فارسی شاعری کی دین ہے تو مغلوں سے لداخیوں کو ورثہ میں ملی ہے۔ لداخ کے راجوں نے کشمیر کے مغل گورنر سے خط وکتابت کے لئے کشمیر سے ایک مسلمان کو لیہہ بلایا اور آباد کیا۔

یہ خاندان اب لداخ میں متعدد شاخوں میں بٹا ہوا ہے۔ کم سے کم ایک لداخی راجہ چھیتن نمگیل (۱۸۲۰ - ۱۸۰۰ء) کی اچھی فارسی دانی کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔ فارسی کے علاوہ وہ کشمیری زبان بھی بخوبی جانتا تھا۔

لداخی زبان میں دف، دمن (دمامہ)، سُورنا (سرنائی) جیسے کئی الفاظ فارسی سے آئے ہیں۔ شاید یہ الفاظ مغلوں کی دین ہوں۔

میری دانست میں مغلیہ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لداخ کو سیاسی طور برصغیر ہند کی چھتری تلے رکھا اور ہمسایہ ملکوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں، توسیع پسندی اور دستبرد سے محفوظ رکھا۔ مغلیہ حکومت اپنے زمانے میں ایشیا میں ایک بڑی طاقت تھی۔ اگر مغل حکمران لداخ کی علاقائی سلامتی سے دلچسپی نہ رکھتے تو غالباً آج لداخ کی تاریخ مختلف ہوتی۔

* * *

شیرازہ میں چھپنے والی نگارشات ،
کا
حق اشاعت اکیڈمی کے نام محفوظ ہوتا ہے
اگر کوئی رسالہ یا اخبار انہیں نقل کرنا چاہے تو
اس کے لئے خاص اجازت یا حوالہ ضروری ہے

* * *

مرغوب بانہالی

مُغل دور میں کشمیر کے فارسی شعراء

جس طرح کشمیر میں فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کا کام ہندوستان کے کئی علاقوں کی نسبت بہت دیر بعد شروع ہوا تھا اُسی طرح مُغلیہ سلطنت کا اثر و نفوذ بھی یہاں بابر اور ہمایوں کے بعد شروع ہوا ہے۔ یوں تو ہمایوں کے چچیرے بھائی میرزا حیدر دُغلت نے ایک عبوری دور میں کشمیر پر دس سال تک حکومت کی تھی لیکن حقیقت میں کشمیر اُس وقت مُغلیہ قلمرو میں شامل نہ تھا۔ پھر یہاں چک سلطنت کا قیام عمل میں آیا جس کے دوران اکبر بادشاہ کی فوجوں کو کشمیری فوجوں کے ہاتھوں کئی بار شکست کھانا پڑی البتہ جب سُلطانِ کشمیر یوسُف شاہ چک کو دھوکے سے یرغمال بنا کر جلاوطن کیا گیا اور اُس کے بہادر فرزند یعقوب چک کو کئی وجوہات کی بنا پر شکست کھانا پڑی تو پہلی بار ۱۵۸۶ء میں سرزمین کشمیر پر مُغلوں نے اپنے جھنڈے گاڑ دئے۔ اور یوں کشمیر کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لینے کے بعد جہاں مُغل بادشاہوں نے اس خطّے کی خارجی تزئین و آرائش میں کافی دلچسپی دکھائی وہیں داخلی طور پر کشمیریوں کی قومیت اور جسارت کے جنون کو ختم کرنے کی حکمتِ عملی بھی اختیار کی گئی۔ چنانچہ خارجی تزئین کے طور پر کشمیر کو مغل شاہزادوں اور شہزادیوں کیلئے ایک عشرت کدہ اور تفریح زار بنانے کیلئے چشموں اور باغوں کی تعمیر کا کام بڑے شدّ و مد سے شروع کیا گیا اور داخلی طور پر کشمیریوں کی قوتِ مُدافعت ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کی غرض سے یہاں بعض تعمیرات کے دوش بدوش مشاعروں اور مختلف جشنوں کا ایک دلفریب اور خوشنما سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ وُسعتِ دلی اور علم دوستی کا مظاہرہ کرنے والی مغلوں کی اس

حکمتِ عملی کے یہاں خاطر خواہ نتیجے برآمد ہونے لگے۔ چنانچہ کشمیری من حیث القوم مغلوں کی فتحِ کشمیر سے پہلے کچھ دیر کیلئے آپس میں شیعہ و سُنی تفرقوں میں مُبتلا رہنے کی سزا "دو مرغ جنگ کنند فایدہ تیر گر" کے مصداق پا چکے تھے اور وہ خود کردہ پریشانی ظاہر کرنے کے بجائے ابھی دم بخود ہی تھے کہ مختلف جشنوں نے اپنی رنگینی کا دانہ و دام پھیلانا شروع کردیا یہ رنگینی بہت سوں کیلئے جاذبِ نظر واقع ہوگئی۔ اِس طرح سے کشمیریوں کے بعض خواص نے مجموعی طور پر نئے حالات سے سمجھوتہ کرکے پھر سے اپنی ذہانت و فطانت کا مظاہرہ شروع کرلیا۔ اور یوں وہ اُن ثقافتی روایات کے احیاء اور تسلسل میں دوبارہ بھرپور حصہ لینے لگے جن کو مقامی بادشاہوں یعنی شہمیری اور چک سلاطین نے مغلوں کے پیشرووں کی حیثیت سے یہاں قایم کرلیا تھا۔ مغلوں کے اُن پیشرووں نے کشمیر میں فارسی کو دو حیثیتوں سے کافی ترقی دی تھی۔ ایک تو اسے ایران اور وسط ایشیا سے آئے ہوئے مبلغین اسلام اور کشمیری عوام کے درمیان، ابلاغ کی زبان بنانے کی حیثیت سے۔ دوُم کشمیریوں کو روزگاری وسائل سے ہمکنار کرنے والی سرکاری زبان کی حیثیت سے۔ مغلوں نے فارسی کی یہ دونوں حیثیتیں قایم رکھتے ہوئے فارسی شعر و ادب کو فروغ دینے کے لئے کئی نئے اقدام بھی کئے۔ آہستہ آہستہ مغلیہ جشنوں اور عیش کوشیوں میں شمولیت کو کشمیریت کی ہلاکت کے مترادف سمجھنے والے دانشوروں کی تعداد گھٹتی گئی۔ یہاں تک کہ مغلیہ دربار میں جانے سے کترانے والے شعرا بھی حزم و احتیاط کی چار دیواری سے نکل کر مغلیہ طاؤس و رباب کی رو میں بہتے نظر آنے لگے۔ اب کیا تھا؟ اب تو سب ہی لوگ اس بات کو اپنی ذہانت کا ثبوت دینے کے لئے سب سے بڑی کسوٹی اور چیلنج سمجھنے لگے کہ انہیں مغلوں کے ساتھ مغلوں جیسی فارسی بولنی آئے تو گویا سب مسئلوں کا حل انہیں مل جائے گا۔ چنانچہ چیلنج کا درجہ رکھنے والا کشیری محاورہ "مُغل وُچھتھ گرتھ فارسی پھورُن" کئی اور باتوں کے علاوہ کشمیریوں کے اُس معاصر رجحان کی طرف بھی زیرِ لب اشارہ کرتا ہے۔

اس پس منظر میں کشمیر کے تخلیقی ذہنوں کو اپنی مادری زبان میں شعر گوئی کرنا اگر فراموش ہوجاتا ہے یا بیکار وقت گنوانا سا لگتا ہے تو زیادہ تعجب خیز نہیں۔ کیونکہ اب ہر طرف فارسی کا طوطی بولنے لگا تھا پھر اُسی زمانے میں مُغلیہ دربار سے وابستہ ملک الشعراء اور ممتاز شعرا کی کشمیر نوردی اور کشمیر سرائی سونے پہ سہاگے کا کام کرتی ہے۔ گویا اُن کی شاعری یہاں ترغیبات مزید کا رول ادا کرتی ہے۔ خاص طور پر

فیضی، عرفی، طالب، کلیم، سلیم، صائب اور ظفر خان احسن جیسے مغلیہ دربار سے وابستہ شعراء کا کشمیر آنا کشمیری النسل شعراء کو بہت متاثر کرتا ہے۔ انہی لوگوں کے زیر اثر یہاں کے شاعر سبکِ ہندی کی مختلف روایات کو اپناتے ہیں۔ خاص طور پر خیال آفرینی، صنایع و بدایع کا اہتمام۔ دعویٰ و دلیل اور تشبیہہ و تمثیل سے متعلق اظہار کے اسالیب وغیرہ۔ مغل دور کے نام سے موسوم یہ ساری کاروائیاں (۱۶۶ سال پر محیط) جس زمانے میں عمل میں آتی ہیں اُس کو واضح نشاندہی کیلئے ہم ۱۵۸۶ء سے ۱۷۵۲ء تک کا زمانہ کہیں گے۔ ۱۵۸۶ء مغلوں کے کشمیر پر قبضہ کرنے کا سال ہے جب کہ ۱۷۵۲ء کشمیر میں مغلوں کی حکومت ختم ہو جانے کا سال۔ ۱۶۶ سال کے اس زمانے میں درجنوں کشمیریوں نے فارسی میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن فنّی اور فکری اعتبار سے پختہ کار قسم کے کشمیری النسل فارسی شعراء ایک ڈیڑھ درجن سے زیادہ نہ ہونگے جنہوں نے مغل دور میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہو۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مقالے میں ایسے ہی درجن بھر نمائندہ اور ممتاز قسم کے فارسی گو شعراء کا تعارف پیش کرنے پر اکتفا کریں۔

مُغل دور سے تعلق رکھنے والے کشمیر کے پہلے اہم فارسی شاعر حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ ہیں۔ انہیں لوگ اب تک ایشان صاحب یا حضرت ایشان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "اُستادِ محترم" کے مُترادف یہ نام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت صرفیؒ عربی اور فارسی کے ایک جیّد عالم اور صاحبِ طرز استاد تھے۔ چنانچہ آپ کے شاگردوں میں حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ جیسے لوگ بھی شامل رہے ہیں۔ آپ کی جامع الکمالات شخصیت شیخ الحدیث اور مفسر قرآن کی ممتاز حیثیتوں کے علاوہ اور بھی کئی حیثیات سے مُتصف رہی ہے۔ بحیثیت ایک صوفی بُزرگ آپ کا شمار سلسلۂ کُبرویہ کے مشائخین میں ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک شاعر آپ جامیِ ثانی کہلاتے ہیں۔ ایسا کہلانے میں اس بات کا براہِ راست دخل معلوم ہوتا ہے کہ آپ صوفی مسلک کے خاتم الشعراء مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے شاگردِ رشید مُلا محمد آنی کے شاگرد تھے اور اُنہوں نے ہی صرفی کی ذہانت و طرزِ کلام دیکھ کر انہیں صرفی تخلص کرنے کا مشورہ دینے کے علاوہ جامیِ ثانی کہا تھا۔ جامی ثانی کہلائے جانے میں اس بات کا بھی دخل رہا ہو گا کہ آپ ایسے پہلے کشمیری النسل شاعر ہیں جنہوں نے نظامی اور خسرو جیسے عظیم فارسی شاعروں کی

روایت کو آگے بڑھا کر خمسہ فارسی مولانا جامیؒ پر ہی رُکنے نہ دیا بلکہ خود بھی ایک خمسہ فارسی پانچ قابلِ قدر مثنویوں کی شکل میں تخلیق کیا۔ حضرت صرفیؒ کے خمسہ میں شامل پانچ فارسی مثنویوں کے نام یہ ہیں:۔
۱۔ مسلکُ الاخیار ۲۔ وامق و عذرا ۳۔ لیلیٰ و مجنون ۴۔ مغازی النبی اور ۵۔ مقاماتِ مُرشد صرفی کو جہاں جامیؒ پر رُکی ہوئی روایت کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعادت مندی حاصل ہونے کا احساس تھا وہاں انہیں امیر خسروؒ سے بھی کئی طرح کی مُناسبتیں ہونے کا احساس تھا۔ جس طرح امیر خسروؒ نے اپنے عرصۂ حیات میں دہلی کے تخت پر درجن بھر بادشاہوں کو بیٹھتے اور اُترتے دیکھا تھا اُسی طرح صرفیؒ نے بھی کشمیر کے تخت پر بہت سے بادشاہوں کو اُترتے اور چڑھتے دیکھا اور جس طرح حضرت شیخ سعدیؒ نے بہت جہاں گردی کی ہے اُسی طرح سے حضرت صرفیؒ نے بہت سے تہذیبی مرکزوں میں جاکر علمی لین دین کیا تھا۔ اُن میں اُس وقت کی مُہذب دُنیا کے یہ سب شہر شامل تھے۔ سبزوار، کابل، بلخ، بخارا، تاشقند، یارقند، قراکول، مشہد، طوس، قزوین، یمن، مکہ، مدینہ، شام، بغداد، آگرہ، دہلی اور سرہند وغیرہ۔ بہرحال اس فضیلت اور امتیاز کا انہیں خود بھی بھرپور احساس رہا ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

بعد خسرو بود جامی بلبلِ باغِ سخن
کیست جز صرفی کنوں آن مرغ خوشخوان العوض

حضرت صرفیؒ کو وامق و عذرا اور لیلیٰ و مجنون جیسے رومانوی عنوانوں کے تحت صوفیانہ مسلک کی مثنویاں لکھتے وقت بھی اپنے مُدعا و مقصد کا واضح احساس تھا۔ جس کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے ؎

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست
کہ از بہر حقیقت کار سازیست

خمسہ کی پانچ کتابوں کے علاوہ آپ کا ایک بڑا دیوان اشعار بھی موجود ہے۔ جو اُن کے رسالہ تحفۃ الشعراء[ف] میں درج عروضی مہارت کا آئینہ دار ہے۔ یہ دیوان تقریباً آٹھ سو پچاس غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہاں

[ف] "تحفۃ الشعراء" پر ڈاکٹر اکبر حیدری کا تفصیلی مضمون "شیرازہ" جلد ۲۶ شمارہ ۱۱ میں شائع ہو چکا ہے (ادارہ)

پر نمونۂ کلام کے طور پر صرفیؒ کے چند ایسے شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں انہوں نے معاصر کشمیریوں کی آپسی چپقلش دیکھ کر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اور جن میں امن وسکون درہم برہم ہو جانے کے نتیجے میں جنت نظیر کشمیر کے دوزخ بن جانے کے مناظر دکھائے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

جُدا از روے تو چوں دوزخے است صرفیؔ را
اگرچہ رشکِ بہشت است گلشن کشمیر

کئی ناعاقبت اندیشوں کے ہاتھوں سرمایۂ امن وسکون لُٹ جانے سے کشمیر کے جہنم زار بن جانے کے بعد صرفیؒ سب کشمیریوں کو اپنی اولاد کا درجہ دیکر یہ دہائیاں دیتے ہیں کہ تم آپس میں سوتیلے بھائیوں کی طرح سازشیں نہ کرو۔ دیکھو میں تمہارے غم میں حضرت یعقوب کی طرح تڑپ رہا ہوں۔ چنانچہ درج ذیل شعر میں یوسف شاہ چک کے دام فریب میں پھنسنے اور جلا وطن ہو جانے اور اُس کے بیٹے یعقوب چک کے بہادر ہونے کے باوجود تعصب کا شکار ہو کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارنے کی کئی باتیں یکجا ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ شعر ہے ؎

دل یعقوبِ کشمیر است چوں یعقوبِ کنعانی
اگرچہ یوسف من در جہاں یعقوب بیار است

ہر قسم کے تعصُب سے دل کو دور رکھنے کے صوفیانہ مضمون پر مبنی صرفیؒ کی ایک رُباعی بھی پیش کی جاتی ہے۔

خوش آنکہ دلش صاف ز ہر رنگ شود
بیروں ز ہمہ آشتی و جنگ شود
بادلبر من کہ رنگ او بیرنگی است
ہمرنگ کسے شود کہ بے رنگ شود

قاضی موسیٰ شہید کے قتل کا اِرتکاب صرفیؔ کی نظر میں ایک ناعاقبت نااندیشانہ قدم تھا جو سُنی برادری کی عملی حمایت سے محروم اور کئی بار پسپا ہوئے مغل سپاہیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا بلکہ صرفیؒ کو خود اُس وفد میں شامل ہونے کے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا جس نے اکبرؔ کو کشمیر پر قابض ہونے کی دعوت چند شرائط پر دی۔ یہ بات صرفیؔ جیسے جید عالم اور بُزرگ کے وفد میں شامل ہونے کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے کہ اکبرؔ نے کشمیر میں امن وامان پھر سے بحال کرنے کا وعدہ کرکے

صرفی کی قدر دانی کے طور پر اس طرح کی شرائط کو بھی منظور کر لیا :

۱۔ بادشاہ اور اُسکی سرکار کشمیریوں کے دینی معاملات میں دخل نہیں دے گی۔

۲۔ حاکم لوگ کشمیریوں کو غلام تصوّر نہ کریں گے۔

۳۔ کشمیریوں پر نہ تو مظالم توڑے جائیں گے اور نہ اُن پر بدعات مسلّط کی جائیں گی۔

۴۔ بوالیسی کشمیر کے امرا بھی حکومت کے معاملات میں بیجا مداخلت نہ کریں گے۔ لہ

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ شیخ یعقوب صرفیؒ کے ساتھ عربی اور فارسی کے کئی اور کُتب و رسایل منسوب کئے جاتے ہیں۔ جن کے نام اس طرح سے لئے جلتے ہیں ۱۔ مطلب الطالبین (تفسیر قرآن بعربی) ۲۔ شرح صحیح بخاری ۳۔ شرحِ اربعین ۴۔ کنز الجواہر ۵۔ رسالۃ الاذکار ۶۔ حاشیہ بر توضیح تلویح ۷۔ مناقب اولیأ ۸۔ مناسک الحج ۹۔ شرح ثلاثیاتِ بُخاری ۱۰۔ ید بیضا ۱۱۔ تقریظ بے نقط بر سواطع الالہام فیضیؔ ۱۲۔ اور شرحِ رباعیات وغیرہ اس بُزرگ شاعر کا سالِ ولادت ۹۲۸ ہجری، عمر ۷۵ سال اور تاریخِ وفات ۱۲ ذی قعدہ ۱۰۰۳؁ ہجری قرار دینے میں اکثر تذکرہ نویس متفق دکھائی دیتے ہیں۔

مغل دور میں دوسرے اہم کشمیری النسل شاعر خواجہ حبیب اللہ حُبیؔ نوشہری ہیں۔ آپ شیخ یعقوب صرفیؒ کے خلیفۂ خاص اور عربی و فارسی کے مُسلّم اُستاد گذرے ہیں۔ لیکن اپنے مُرشد کے مقابلے میں انکا معیارِ سُخن استادانہ نہیں ہے۔ البتہ کشمیری میں ان کا کلام حبہ خاتون کے بعد ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ حُبیؔ کا سالِ ولادت ۹۶۲ ہجری اور سالِ وفات ۱۰۲۷ ہجری تصور ہوتا ہے۔ آپ نے پانچ فارسی رسالے ایک عربی رسالہ اور ایک دیوانِ شعر بطور یادگار چھوڑا ہے۔ ان میں سے ایک رسالہ اپنے مرشد حضرت صرفیؒ کے کمالات کا ذکر کرنے کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ صرفی کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

به اوجِ رہبری چوں آفتاب است
به بُرجِ رہروی چوں ماہتاب است
عجب قطبی کہ بر روے زمین است
به قطب آسمان زینت ازین است
به بستانِ ولایت گُلشنے زوست
به چشمانِ سعادت روشنی زوست

لہ ڈاکٹر صابر آفاقی۔ ہُنزو مردم شمارہ ۱۱۲ ص ۵۷

جُبّیؔ نے صوفیانہ مضامین کو بڑی دردمندی اور عاشقانہ سوز و گداز سے اپنے شعر کا حصہ بنایا ہے مثال کے طور پر :

میخوار دمی فروشم البنست مشربِ من   شوقست مِلّت و دین ذوق است مذہبِ من

جبریل اگرچہ محرمِ اسرارِ عالم است   لیکن بجیرت است ازین آسمانِ دِل

یا منم اندر جہان و یا جہان اندر منست   خرمنے در دانہ و یا دانہ اندر خرمن است

غزلیات کے علاوہ رباعیات پر بھی جُبّیؔ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اپنے مُرشد شیخ یعقوب صرفیؒ اور اُن کے مُرشد شیخ حسین خوارزمی سے مُتعلق جُبّیؔ کی ایک ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے :

اے دل سنداز ثانیٔ یعقوب طلب   ایں نسبت ازان سالکِ مجذوب طلب
در بیت حزن مقام کُن واز غمِ عشق   آنگاہ زدل یوسفِ مطلوب طلب

ایں راہ حسین است نہ راہِ دگرے   دہ وہ چہ حسینے کہ شہِ بحر و برے
خوارزم بود مولدِ پاکش بجہان   مقصود من از صد کرمش یک نظرے

اُن کے دو مقبول کشمیری نغموں کی طرح سماع کی محفلوں میں درج ذیل مطلع والی غزل بھی بہت مقبول ہے اور بہت والہانہ ڈھنگ سے گائی جاتی ہے ؎

اے کہ بہشت بریں بے تو عذابم عذاب   آتش دوزخ ہمہ با تو گُلابم گلاب

مُغل دور کے تیسرے اہم شاعر مُلا محسن فانی ہیں۔ آپ بھی حضرت صرفیؒ کے شاگرد رشید ہیں، اور اُن کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرفیؔ سے اکتساب علم کرنے کے بعد لاہور اور دہلی میں بھی تحصیل علم و کمال کی کوشش کرتے رہے اور جلد ہی اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت سے شاہجہان کے منظورِ نظر ہو گئے۔ بلخ اور ایران میں بھی کشمیری ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ کچھ دیر کے لئے الہ آباد میں بحیثیت جج بھی فرائض

انجام دئے اور وہیں شاہ محب اللہ کے مُرید بن گئے۔ شہزادہ دارا شکوہ کے ہم مشرب ہونے کی حیثیت سے تمام مذاہب کے تئیں حُسنِ ظن رکھتے تھے۔ دبستان المذاہب جیسی عالمی شہرت کی کتاب محسن فانی سے منسوب ہے۔ بحیثیت شاعر آپ کا درجہ جُبّی سے بُلند تر ہے۔ آخری ایّام میں اپنے وطن سرینگر واپس آگئے اور پری محل کی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ یہیں ۱۰۸۲ ہجری میں وفات پائی۔ نمونۂ کلام کے طور پر اُن کے چند شعر پیش ہیں:

؎ گردوں نہ دوخت خرقۂ تجرید بر تنم — پیراہنِ بقای مرا تا فنا نساخت

؎ کسے کز یاد او در خود فرو رفت — بہ دریائے حقیقت آشنا شُد

؎ چشمے کہ بود کور چہ بیدار و چہ خواب؟ — بحرے کہ بود شور چہ آب و چہ سراب؟
راہے کہ بود غلط چہ نزدیک و چہ دور؟ — عمرے کہ رود ہرزہ چہ شیب و چہ شباب؟

کشمیر کو مُلا محسن فانیؔ کی لافانی دین اُن کا شاگرد رشید غنیؔ کشمیری ہے۔ تذکروں میں غنیؔ کشمیری کا اصلی نام مُلا محمد طاہر ملتا ہے۔ مغل دور بلکہ ہر دور کے کشمیری فارسی شاعروں میں غنیؔ کا مرتبہ بلند ترین ہے۔ اُنکے حالات زندگی سے متعلق تذکروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور کئی باتیں بحث طلب بن جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ آیا وہ اشیائی خاندان کے فرد تھے یا کہ مُلا خاندان کے وہ سُنی تھے یا کہ شیعہ؟ وہ کم عمری میں مرے یا کہ ساٹھ ستر سال کی عمر میں؟ میرزا صائبؔ اُن سے کرالہ پن کا مفہوم پوچھنے ایران سے کشمیر آئے یا کہ ان کے درمیان ملاقات کا اہتمام ظفر خان احسن نے کیا تھا۔ ان مباحث سے قطع نظر غنیؔ کے اشعار کی داخلی شہادت یہ محسوس کراتی ہے کہ اُن کی زندگی غموں اور پریشانیوں سے عبارت رہی ہے۔ اُنکی صحت بھی اکثر خراب رہتی تھی حالانکہ وہ خود حکمت اور علاج معالجے میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ غنیؔ کا سب سے بڑا غم کشمیریوں کی حالت زار اور ابتری سے متعلق تھا۔ وہ پہلے کشمیری شاعر ہیں جنہوں نے اپنے شعر میں بار بار انقلاب کی تمنا کی ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار میں

؎ انقلابے بہ غمِ آبادِ جہاں مے خواہم   شاید ایں طالعِ برگشتۂ من بر گردد
؎ غنیؔ در ملکِ مردہ انقلابے آرزو دارم   کہ خاک از گردشِ گردوں غبارِ آسیا گردد
؎ بہ بزمِ دردمنداں زار نالیدن ہوس دارم   چو نے خواہم کہ در فریاد باشم تا نفس دارم

کشمیر میں جاری استحصال اور کشمیریت کُش اقدام کو دیکھ کر غنیؔ کا دِل جل اٹھتا ہے اور وہ اپنی جگر سوزی کا مظاہرہ ایسے ایسے اشعار میں کرتے لگتے:

؎ جمع کردم مُشتِ خاشاکے کہ سوزم خویش را   گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں
؎ کدام باز ندانم در آشیاں بندی است   کہ ہست حکم پر کاہ بال مرغاں را
؎ غنیؔ روز سیاہے پیرِ کنعاں را تماشا کُن   کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را
؎ روزئ ما مے شود آخر نصیب دیگراں   طالع برگشتہ ہمچو آسیا داریم ما
؎ کسے بہ پرسشِ احوال من نمے آید   بغیر گریہ کہ آید بحالِ خویش مرا

غنیؔ کا سال وفات ۱۰۷۹ ہجری ہے اور اس کا مدفن راجوری کدل سرینگر میں واقع ہے۔ واقعہ مشہور ہے کہ استغنا کا مجسمہ ہونے کے علاوہ غنیؔ زبردست فنی شعور کی وجہ سے نقد و نظر کا بھی مجمہ تھے، اسلئے دیوان غنیؔ ترتیب دیتے وقت اُنہوں نے میرزا غالبؔ کی طرح زبردست کنز بیونت سے کام لیا یہاں تک ایک لاکھ شعر نذرِ آتش کر کے صرف اس دیوان کو باقی رہنے دیا۔ غنیؔ واحد کشمیری شاعر ہیں جن سے میرزا غالبؔ اور اقبالؔ جیسے عظیم شاعروں نے استفادہ کیا ہے۔ غنیؔ کبھی درباری اعزازوں کی طرف مائل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے دیندار بادشاہ نے انہیں حاکم کشمیر سیف خان کے ذریعے دربار میں آنے کی دعوت دی لیکن غنیؔ نے مختلف عُذر تراش کر اُس دعوت کو قبول نہ کیا۔

ملا محسن فانیؔ کے ایک اور کشمیری النسل شاگرد محمد اسلم سالمؔ گُذرے ہیں جو فارسی کے اچھے شاعر شمار ہوتے ہیں۔ سالمؔ کے حالاتِ زندگی غنیؔ سے زیادہ ناپید اور نامعلوم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے

کہ وہ ایک ہندو گھر میں پیدا ہوئے تھے اور ایک نومسلم تھے۔ فانی سے تحصیل علم کرنے کے بعد دہلی چلے گئے تھے اور وہاں اعظم شاہ کے منصب داروں میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کا سالِ وفات ۱۷۱۷ء ہے۔ اُن کا ایک دیوان شعر اور ایک قصیدہ بنام جنگِ فیل دستیاب ہو جاتا ہے۔ ایک نومسلم کی حیثیت سے دوستوں کو بانیٔ اسلام سے روحانی فیض پانے کا ذکر جس طرح کے اشعار میں کرتے تھے اُن کی بعض مثالیں یہ ہیں:

٥ مپرس از ساقیٔ بزمی کہ خورشید است جام آنجا   شود کاملِ ہلال از یک نگاہِ ناتمام آنجا
بپایِ خم نہ تنہا سایۂ خمخانہ مے رقصد   زمستی مے جہد مہتاب ہم از طرفِ بام آنجا
چو افلاطون نشیں در سایۂ خم تا شوی کامل   کہ کارِ عقلِ ناقص مے شود سالم تمام آنجا

نمونۂ کلام کے طور پر سالم کے چند اور شعر پیش کئے جاتے ہیں:

میخانہ ایست دہر کہ غفلت شرابِ اوست   دُنیا خرابہ ایست کہ عالم خرابِ اوست
آسودہ شد دلے کہ بہ حیرت پناہ بُرد   سیماب چوں بہ آئینہ پیوست آبِ اوست
دیوانگی رساند بمعراجِ ہوشِ ما!   عقل است شبنمی کہ جنون آفتابِ اوست
ہر دم رہِ فنائے تو کوتاہ تر شود!   عُمر است رشتۂ کہ نفس پیچ و تابِ اوست

غنی کشمیری کے بعد کشمیر کے جس فارسی شاعر نے شہرت کی اونچائیوں کو چھولیا وہ جُویا تھے۔ اُن کا پورا نام میرزا داراب بیگ جویا ہے۔ سالم کی طرح جویا کے حالاتِ زندگی تذکروں میں درج نہیں ملتے۔ صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ کشمیر میں تحصیل علم کے بعد وہ کئی بار کشمیر سے باہر گئے لیکن مقامی امرا کی قدر دانی انہیں بار بار وطن کی طرف کھینچتی رہی۔ اُنکی وفات اپنے وطنِ مالوف میں سال ۱۷۰۶ء عیسوی کے دوران ہوئی ہے۔ جویا کا ایک دیوان شعر موجود ہے۔ اور اسکی اشاعت سنہ ۱۹۶۰ء میں کُلیاتِ جویا کے نام سے تہران میں ہوئی ہے۔

جُویا کے باپ کا نام مُلا ساری اور اُن کے سرپرست کا نام عہدِ عالمگیر میں گذرے گورنر

کشمیر ابراہیم خان ظاہر کیا گیا ہے۔ جویا کو اپنے وطن کشمیر سے جو والہانہ محبت تھی اُس کا اظہار کبھی یہاں کے فطری مناظر کے پردے میں، کبھی یہاں کے معاشرے کی تعریفیں کرنے کے پردے میں اور کبھی اس خطّے کے حصے میں آئی ہوئی فطرت کی رنگینیوں کی توصیف کے پردے میں کیا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر اسی قبیل کی چند نظموں سے یہاں چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

بیا ساقی بہار آمد بصد رنگ   سوئے کشمیر باید کرد آہنگ
بدہ مے تا دمے از خود بر آیم   نخستیں کو سہارش را ستایم
تعالی اللہ زہے کہسارِ کشمیر   کہ شد در سایۂ او آسمان پیر
خصوصاً پیر پنچالِ فلک شان   بود ماہش چراغِ زیرِ دامان

مگو اے ساقی از دشواریٔ راہ   بکشمیر آمدیم اَلحَمدُ لِلّٰہ
تعالی اللہ زہے گلزار کشمیر   کہ در وے غنچۂ ہم نیست دلگیر
درین گلشن کہ باد آباد جاوید   لطافت را مجسّم میتوان دید

جُویا نعت گوئی اور منقبت گوئی میں بھی اپنے معاصرین میں ایک گونہ امتیاز رکھتے تھے۔ چند شعر مُلاحظہ ہوں:

افتخارِ دورۂ آدم حبیب ذوالجلال   سرورِ دُنیا و عُقبیٰ، شافعِ روزِ جزا
آنکہ جبریلِ امینس میکشیدے غاشیہ   آنکہ بُد فرمانبرش شاہنشہی چوں مرتضیٰ

اے فِدائے مرقدِ پاک تو سرتاپائے من   یا علی مولائے من، مولائے من، مولائے من
مظہرِ کُل، فاتحِ خیبر، امیر المومنین   بندگیٔ قنبرش فخرِ من و آبائے من

غنی کشمیری کے ہم عصر شعراء میں سے مُلّا طیب نام کے ایک کم معروف مگر قابلِ توجہ شاعر کا کلام بھی

دستیاب ہوگیا ہے۔ سرینگر کی ریسرچ لائبریری میں ستّر اوراق پر مشتمل اُن کا دیوان موجود ہے۔ ڈاکٹر گردھاری لال تکو نے ملا طیّب کو اسلام پورہ میں مدفون اور بابا نصیر الدین کشمیری کا مرید قرار دیا ہے جو تحقیق طلب معلوم ہوتا ہے۔ ملّا طیّب واقعاً ایک صوفی منش شاعر گذرے ہیں اور اُن کے کلام سے بھی صوفیانہ سوز و گداز مترشح ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر چند شعر ملاحظہ کیجئے :

این جلوئے چہ جالیست کہ در رقص و سماعیم
وین نائے چہ نالیست کہ زو عین فنائیم
این جام چہ جامست کہ زو جامہ دریدم
این دام چہ دامست کزاں دانہ رُبائیم

ہر دم بکف آریم دُرے زین تُنک دریا
آنروز مبادا کہ ازین بحر برآئیم !
درخرقہ زدم آتش عریانِ خراباتم
میخوارم و سرمستم میہمانِ خراباتم
من طیبِ پُرزہرم اندیشہ کُن از قہرم
گردن مکش از امرم سلطانِ خراباتم

مغل دور سے تعلق رکھتے والے کشمیر کے ایک صوفی بزرگ اور فارسی شاعر میرزا محمد اکمل الدین بدخشی ہیں بعض تذکروں میں اُن کا نام اکمل الدّین میرزا محمد کامل بھی درج ہوا ہے۔ ان کے نام میں شامل نسبت کا تعلق اُن کے دادا ملک محمد خان کے تاشقند اور بدخشان میں کچھ دیر قیام کرنے سے ہے۔ وہاں سے ہی آپ، اکبر بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے تھے اور محمد قلی خان کا خطاب پا کر ۱۵۹۰ء میں کشمیر کے گورنر مقرر کئے گئے تھے۔ محمد قلی خان کے فرزند عادل بیگ میرزا اکمل الدّین کے والد تھے۔ میرزا اکمل شہزادہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے ہمدرس بھی رہ چکے تھے۔ اور کچھ دیر کیلئے شاہجہاں کے دربار دہلی سے بھی وابستہ رہے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ آپ نے کشمیر ہی گذارا۔ شاعری میں آپ مولانا رومی سے بہت متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کی مشہور مثنوی بحر العرفان چار جلدوں پر مشتمل ہے اور انہی صوفیانہ رموز کی عکاس ہے جن کو مولانا رومی نے اپنا موضوعِ شعر بنایا ہے۔ بحر العرفان کے علاوہ آپ کا قصیدہ بحر الاسرار بھی بہت غور طلب ہے خاص طور پر اس میں شامل وہ مباحث جن کا تعلق عالم لاہوت اور جبروت سے ہے۔ مثال کے طور پر

بالترتیب عالم لاہوت اور عالم جبروت سے متعلق درج ذیل ایک ایک شعر ہے

نہ مرا سایہ و نے سایہ باشیائے دگر   نہ شب و روز کہ باشد عددِ آن یادم
کفر و دین ہر دو عدم ماند در آں خلوتِ راز   صلح کل یاد بہ ہفتاد و دو ملت دادم

بحر العرفان میں سے نمونۂ کلام کے طور پر حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین کشمیری سے متعلق چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہر کہ دارد دراں چہ گویم گوش   میکند جام بحر عرفان نوش
شیخ دین گفتہ است بسے اشعار   زآنچہ دید از سلوک در ادوار

شعر شان در زبان کشمیری ست   بشنو اکنوں کہ معنیٔ آں چیست
ترجمہ کردہ ام من آن ابیات   نالود شعر قصہ را ابیات

مغل دور کا ایک اور قابل توجہ شاعر شاہ صادق ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں کشمیر میں پیدا ہوا اور لڑکپن میں ہی نماز کے دوران رقت طاری ہو جانے کے بعد صوفیانہ تعلیمات میں محو رہنے لگا۔ بڑی ریاضت کرتا رہا۔ کشمیر سے باہر جاکر دہلی اور لاہور میں بھی کچھ وقت گزارا اور سات آٹھ سال بعد واپس آکر کشمیر میں گوشہ نشین ہو کر دردمندانہ کلام تخلیق کرتا رہا۔ اُن کا سال وفات ۱۱۰۰ ہجری قرار دیا جاتا ہے۔ اُن کے دیوان شعر میں غزلیات کے علاوہ مثنوی اور ترجیع بند بھی شامل ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر اُن کے ایک ترجیع بند سے چند ایسے شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں صادق کے چند تلخ تجربوں کا عکس بھی نمایاں ہے:

جانا نخورم بیات سوگند   کاین زلف دراز تست دلبند
عمریست بہ ہجر مبتلایم   این جور و جفا بگو کہ تا چند
چوں تو بجہاں کسے ندیدم   گشتم بہ مُلک و مَلک ہر چند

دل گشت ز قیدِ عالم آزاد　　زانگہ کہ شدم بعشق پابند
جاں را نبوُد قرار و آرام　　رحمے بکن و چنینش مپسند
یک جرُعۂ مے ز جامِ زریں　　خوردیم و شدیم مست و خرسند
از زہدِ ریا کنوں گذشتم
تا رفتہ بپائے خم ہفتم

مغل دور کے ایک اہم شاعر محمد رضا مُشتاق ہیں۔ مشتاق کے دیوان اشعار میں معاصر کشمیر کے سیاسی اور مذہبی حالات کی جانب بلیغ اشارے رکھنے والے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ وہ مناظر فطرت کے بہت دلدادہ تھے اور اپنے وطن کی فطری خوبصورتی سے والہانہ عشق رکھتے تھے نمونۂ کلام کے طور پر ایسے ہی چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں مشتاق مناظر وطن کا ذکر کرتے ہیں:

شوخ از بس بہارِ کشمیر است　　مژہٗ حور خارِ کشمیر است
چشمِ لیلیٰ کہ دل ز مجنون برُد　　داغے از لالہ زارِ کشمیر است
نخلِ طوبیٰ بہ آں سر افرازی　　زیرِ دستِ چنارِ کشمیر است
غنچۂ عمرِ جاودانۂ خضر　　کبکے از کوہسارِ کشمیر است
سرِ عیش و نشاط و ناز و طرب　　روز و شب در کنارِ کشمیر است
آبروئے بہار و ہر چہ در وست　　خاکِ پائے دیارِ کشمیر است
طبعِ مشتاق ماز رنگینی　　جلوۂ نو بہارِ کشمیر است !

مُشتاق نے ۱۱۴۳ ہجری میں کشمیر میں ہی وفات پائی ہے۔

محمد رضا مُشتاق کے ایک ہم عصر فارسی شاعر آذر نام سے جانے جاتے ہیں جو مغل دور میں کشمیر کے پہلے ہندو فارسی گو شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ بارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھنے والے اس شاعر کا سالِ ولادت اور سالِ وفات کہیں پر درج نہیں ملتا۔ اُن کا ایک دیوان سرینگر کی ریسرچ لائبریری

میں موجود ہے۔ جو ردیف "ت" سے شروع ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر چند شعر پیش ہیں ؎

بیار بادہ کہ آثارِ غم نخواہد ماند　　پیالہ نوش کہ درد و الم نخواہد ماند
نگاہ کن سوئے دارا و قیصر و جم و کے　　کہ تاج و تخت و کلاہ و حشم نخواہد ماند

بارہویں صدی ہجری کے نصف دوّم سے تعلق رکھنے والے ایک اور کم معروف شاعر محمد خان آزاد ہیں۔ آپ اپنے وقت کے سر برآوردہ اہلِ علم و فضل میں شامل رہے ہیں۔ اور اہلِ اقتدار کے ساتھ بھی ان کے اچھے مراسم رہے ہیں۔ آپ نے ۱۱۹۷ ہجری میں وفات پائی ہے۔ آزاد کشمیری کے دیوان شعر کا ایک مخطوطہ سرینگر کی ریسرچ لائبریری میں موجود ہے۔ آزاد کے کلام میں معاصر کشمیر کے حالات کا عکس بھی نمایاں ہے۔ مشتاق کی طرح آپ بھی کشمیر کی رعنائیوں پر شیدا تھے۔ نمونۂ کلام کے طور پر چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ہزار داغ بدل لالہ زارِ کشمیر است　　پس از وفات مرا یادگارِ کشمیر است
ز داغِ لالۂ او شام در چمن پیدا است　　سحر بروے زمین از غبارِ کشمیر است
کسے نگشت و نگردد ز دامِ او آزادؔ　　چو خطِ سبز بتاں سبزہ زارِ کشمیر است

مغل دور کے آخری برسوں سے تعلق رکھنے والے ایک سیماب صفت شاعر پنڈت زندہ رام موید کشمیری ہیں۔ آپ کے نغمے غنی کشمیری کی طرح وطن اور ہم وطنوں کی محبت سے لبریز ہیں۔ غنیؔ کی طرح ہی کشمیر سے باہر کسی بھی جگہ کو قید کے مترادف سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر کبھی اپنے قیام دہلی کے دوران یوں کہہ اٹھتے کہ ؎

بلبل کشمیر و قیدِ دھلی یم　　نالہ ہر دم دارم از حبِّ وطن

یا یوں کہہ اٹھتے کہ ؎

یارب برساں تو بد یارا تو بکشمیر　　تا یادِ جوانیش دہد عالم پیری
وطنم ہست گلشن کشمیر　　چہ شود گر بمن وطن بخشی

کبھی اپنے دل سے مخاطب ہوتے ہیں ؎　تا بہ کے اے دل من دور از کشمیر خویش
خانۂ خود را بکن آباد از تعمیر خویش

مولوی محمد ابراہیم

مغل دور کے کشمیری خطاط

فارسی زبان و ادب کی طرح کشمیر میں خطاطی اور نقاشی مغل دور سے قبل بھی جاری و ساری تھی۔ اس کا اندازہ اُن قالینوں، پیپرماشی اور شال دوشالوں کے نمونوں سے ہوتا ہے جن کی تصاویر حکومتِ جموں و کشمیر کی طرف سے شایع کردہ انگریزی رسالے کرافٹ میں موجود ہیں۔ اس کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں نقاشی مُغل دور سے بہت قبل کشمیر کے ہندو دور میں موجود تھی۔ کشمیر کے مسلمان سلاطین نے نہ صرف اسے برقرار رکھا بلکہ آگے بھی بڑھایا۔ چنانچہ سلطان زین العابدین کے دور کے مشہور خطاط اور خوشنویس مُلا جمیل، احمد، حیدر، ابراہیم، کمال اور یعقوب کے نام ملتے ہیں۔ کشمیر کے چک دورِ حکومت میں مُلا رُکی گنائی اور مُلا حاجی گنائی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے خانقاہ نوربخشیہ جڈی بل، سرینگر کی اندرونی دیوار پر [illegible] مثنوی "سلسلۃ الذہب" نہایت عمدہ دستخط کے ساتھ خطِ ثلث میں تحریر کی تھی۔

کشمیر میں مُغل دور سنہ ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں چکوں پر اکبری افواج کی فتوحات کے بعد شروع ہوا۔ جلال الدین محمد اکبر کے فتحِ کشمیر کے وقت کشمیر میں زبان فارسی اور فن نقاشی و خطاطی نہ صرف عروج پر تھے بلکہ خود سلاطین چک بھی ان میں غیر معمولی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کشمیر کے آخری چک بادشاہ یوسف شاہ سے متعلق روایت ہے کہ وہ نہ صرف ایک اچھا موسیقار اور فارسی دان تھا بلکہ بقول

بابا داؤد خاکیؒ خطاطی اور نقاشی سے بھی غیر معمولی شغف رکھتا تھا۔ جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفیؒ کشمیری، المعروف بہ حضرت الیشان صاحبؒ، جن کا بیشتر وقت کشمیر کے سلاطینِ چک کے دوران بسر ہوا، فنِ خوشنویسی میں مولانا رضی کے شاگرد تھے۔ مغازی النبی میں رقم طراز ہیں:

رضی آن بسے شان فضلش شگرف   مرا فقہ آموخت و نحو و صرف
ہمی گفت درسِ جمیعِ علوم   چہ طرزِ خصوص وچہ طرزِ عموم
بہر فن خبردیش ہم صد نمط   زشعر و معمّا و انشاؤ خط

اِسی طرح جامع الکمالات کے پھوپھی زاد بھائی عبد العزیز خوش خطِ وقت تھے۔ ملاحظہ ہو مغازی النبی (مقدمہ):

دو فرزند از عمّہ ام مانده بود   کہ ہر یک بفنّی ترقّی نمود
یکی احمد حمدی آن نامور   بشعر و جمیعِ علوم دگر
دوم خوش خطِ وقت عبدالعزیز   بحُسن خط اندر زمانہ عزیز

مُغل دور میں خوش نویسی اور خطاطی کی روایت کشمیر میں نہ صرف زندہ رہی بلکہ ان حکمرانوں نے پُورے شد و مد کے ساتھ اِس فن کو آگے بڑھایا۔ غالباً اِس کا سبب قرونِ وسطیٰ اور اُس کے بعد والے ادوار میں اہلِ کشمیر اور مغل طبایع کی ادبی میلان میں یکسانیت تھی۔ کشمیر میں فارسی اور اُس کے متعلقات کا رواج شہمیری اور چک عہود میں تھا اور یہی کیفیت ہندوستان کے مغل بادشاہوں کی تھی۔ ہندوستان میں آنے والے منگول (مُغل) زبان کے اعتبار سے اگرچہ تُرک تھے اور اس لحاظ سے اُن کی مادری زبان بھی تُرکی تھی، کیونکہ ہندوستان میں مُغل سلاطین کا مُورثِ اعلےٰ محمد ظہیر الدین بابر تھا اور تُرکستان کے شہر فرغانہ سے تعلق رکھنے کے باعث جو نواحِ سمرقند سے ہے، اُس کی زبان تُرکی تھی۔ چنانچہ بابر کی وقیع ڈائری "توزکِ بابری" جو چُغتائی تُرکی میں ہے اس حقیقت کی غماز ہے۔ مگر چونکہ بابر ہندوستان پر کابل و افغانستان کے راستہ حملہ آور ہوا تھا اور اس کے

ساتھ ہی فارسی کا عالم بھی تھا، اِس لئے اِس تعلق سے بجائے تُرکی کے ہندوستان میں فارسی زبان کا مروّج ہوا۔ ہندوستان میں فارسی کی برقراری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مغلوں کے حملۂ ہند سے بہت قبل ہندوستان میں فارسی نے اپنے قدم کافی زیادہ مضبوط کر لئے تھے۔ خود مغل بھی فارسی کو مسلمانوں کی علمی و ادبی زبان سمجھتے تھے۔ یہ تمام وجوہات مل کر ہندوستان میں فارسی کی تقویت اور مضبوطی کا باعث ہوئیں۔ اِن حالات میں جب مغل کشمیر پر حملہ آور ہوئے تو انہوں نے اپنی آمد سے قبل کشمیر میں نہ صرف فارسی زبان و ادب کو زندہ رکھا، بلکہ اُس کے فنون نقّاشی و خطاطی بھی برقرار رکھے اور سرپرستی اور ہمّت افزائی سے اِسے آگے بڑھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ذیل میں نام بنام مُغل دور کے کشمیری خطّاطوں اور خوش نویسوں کا تذکرہ سپردِ قلم کیا جاتا ہے:

یوسف شاہ چک کشمیری قوم کے آخری تاجدار یعقوب شاہ چک متوفی ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۳ء) کا والد تھا۔ علاوہ صاحبِ سلطنت ہونے کے اعلیٰ درجہ کا خوشنویس اور خطاط بھی تھا۔ کشمیر کے نامور عالم و شاعر بابا داؤد خاکیؒ متوفی ۲ صفر ۹۹۴ھ (بدھ، ۱۳؍جنوری ۱۵۸۶ء) نے یوسف شاہ کے اوصاف و محامد میں ایک قصیدہ بعنوانِ قصیدۂ غلیہ یوسف شاہ منظوم کیا ہے۔ اس میں اس بادشاہ کے حُسنِ خط کی نسبت یہ شعر ملتا ہے ؎

برلغت ہا واقف است و در ہنر ہا ذو فنون
حُسنِ خطی نیز دارد این شہ فرخندہ فال

اِس قصیدہ کی رُو سے یوسف شاہ چک نے شہر کشمیر (سرنگر) میں اپنے عہد میں متعدّد مدارس بھی کھولے تھے جو علوم دینیہ سے متعلق تھے، چنانچہ:

ہمدرین شہرش مدرسہ ہا است در ہر گوشہ
از پئ تعلیم در محظور و مکروہ و حلال

(شہر کے ہر گوشے میں ممنوع، مکروہ اور حلال (جائز) کی تعلیم کے سلسلے میں مدارس ہیں)۔

یعقوب میر سُلطانُ العارفینؒ حضرت شیخ مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمۃ متوفی ۲۴ صفر ۹۸۴ھ (۲۲؍مئی، روز منگل ۱۵۷۶ء) کے مریدوں میں سے تھے۔ شیعہ سُنّی تنازعہ میں جب

بایاں ہاتھ اور داہنا پاؤں کٹ گیا تب بقیہ تمام عمر ریاضت و کتابت میں گذار دی۔

محمد حسین زرّین قلم

محمد حسین زرّین قلم کشمیری عہدِ جلال الدین محمد اکبر کا انتہائی نامور خوش نویس تھا۔ خطاطی اور نقاشی میں اپنے عہد کا میر عماد اور سلطان علی مشہدی خیال کیا جاتا تھا۔ محمد حسین فنِ خوشنویسی میں مولانا عبدالعزیز جو شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، کا شاگرد تھا۔ محمد حسین کو "زرّین رقم" کا خطاب شہنشاہ اکبر نے عطا کیا تھا۔ ہندوستان کے نستعلیق نویسوں میں محمد حسین کا مرتبہ انتہائی بلند ہے۔ اِس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہفت بند کاشی کا ایک مخطوطہ لٹن لائبریری علی گڈھ کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ مُطلّا ہے اور گلکاری سے آراستہ ہے۔ اسی محمد حسین کشمیری زرّین قلم نے اکبر کی فرمائش پر ابو الفضل کی تصنیف "آئینِ اکبری" کی خطِ نستعلیق میں ایک مکمّل نقل کی تھی، جبکہ تصاویر دیگر نقاشوں نے بنائی تھیں۔ اس کی خطاطی کا ایک نمونہ رضا لائبریری رامپور میں بھی محفوظ ہے۔ ؁۱۰۲۰ھ مطابق ؁۱۶۱۴ء بعہدِ جہانگیر فوت ہو گیا۔ ہندوستان کا نامور خوش نویس ہدایت اللہ زرّین قلم اُستاد شہزادہ کام بخش خطاطی میں اسی محمد حسین کشمیری کا براہِ راست شاگرد تھا۔

مُلّا محمد مُراد زرّین قلم

اصل میں سوداگر زادہ تھا لیکن ذوقِ خوشنویسی فطری اور خداداد تھا۔ مُلّا محمد مُراد نے اِس فن کی مشق مُلّا میر حسن سے لی تھی جو خوشنویسی میں یگانۂ روزگار تھے۔ مُلّا محمد مراد کو زرّین رقم کا خطاب شاہ جہان نے عطا کیا تھا جبکہ اِس کا تعلق دربار جہانگیری سے بھی تھا اور اُس دور کے بہترین کاتبوں میں محسوب ہوتا تھا۔ محمد صالح کنبوہ لاہوری عملِ صالح المعروف بہ شاہ جہان نامہ میں محمد مراد کشمیری کے فن کے متعلق رقمطراز ہے:

"محمد مُراد کشمیری مخاطب بہ شیریں رقم سحر طراز جادو نگار ہے۔ مشکین رقم اُس کے قلم کی تازہ نگاری سے مطیع ہیں۔ محمد مُراد نے قلم و خط کو نیزۂ خطی سے تسخیر کر لیا ہے اور قلمِ واسطی سے صفحۂ ایام پر ایک عظیم نقش چھوڑ دیا ہے۔ دوائرِ حروف سے خوش نویسوں کے کانوں میں حلقۂ بندگی ڈال دیا ہے۔ خط شناسوں کے نزدیک محمد مراد کشمیری کا سب سے بڑا کمال خطِ خفی و جلی میں اُستادی ہے۔ یہ شخص پختگی اور حُسنِ خط میں ثانیٔ میر علی اور سلطان علی مشہدی ہے۔"

جامع مسجد سرینگر، کشمیر کے جنوبی دروازہ پر کندہ فارسی کا طویل کتبہ اسی مُلّا محمد مراد کا تحریر کردہ ہے۔ علاوہ ازیں کشمیر کی عمارات اور شاہی باغات کے کتبے بھی اسی مُلّا مراد کے عمل کا نتیجہ ہیں۔ محمد مراد فن خوشنویسی میں یگانۂ روزگار تھا۔ آقائے رشید ایرانی کے بالمقابل جس کا خط بطرز بادامی یعنی طویل تھا، محمد مراد تشلغمی یعنی گول حروف لکھا کرتا تھا۔ شاہ جہان نے مُلّا مراد کی شہرت سے متاثر ہو کر اُسے اپنے کُتّابہ نویسوں (وہ لوگ جو شاہی عمارات و باغات پر کتبات لکھا کرتے تھے) میں داخل کرلیا تھا اور اسی لئے کشمیر کے تمام باغات و شاہی عمارات کے کتبے اسی مُلّا مراد کشمیری کے قلم کی تحریر ہیں۔ محمد مراد علاوہ خوش نویسی و خطّاطی کے فارسی زبان کا شاعر بھی تھا تاہم نمونۂ کلام باوجود تلاشِ بسیار دستیاب نہ ہو سکا۔ اسی طرح مُلّا محمد مراد کی تاریخ وفات بھی پردۂ راز میں ہے۔

مرشد الکاتب

سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں کشمیر کا ایک باکمال مصوّر اور نقاش تھا۔ اس کے عمل کی دو عدد تصویریں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں زیر پلیٹ نمبر ۱۴، ۱۵ محفوظ ہیں۔ ان میں ایک تصویر شاہ کمورث کے دربار کی اور دوسری شاہ لہراسپ کی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ تصاویر علی مردان خان اپنے ہمراہ کشمیر سے لایا تھا۔ اس لئے اغلب ہے کہ مرشد الکاتب ایک کشمیری فنکار تھا جو مصوّری اور خطّاطی میں یدِطُولیٰ رکھتا تھا۔

میر حسن

کشمیر سے مغل دور کا چوٹی کا خوشنویس تھا۔ علاوہ علوم رسمیہ متداولہ کے خطِ نستعلیق کی مشق مولانا میر علی ایرانی کے پاس بہم پہنچائی تھی۔ قلیل عرصہ میں خطّاطی اور خوشنویسی میں لاثانی ہو گیا تھا۔ میر حسن کشمیری کی نگارشات ایران اور توران کو بطور تحفہ لے جائی جاتی تھیں۔ لوگ اُس کے قلم سے کتبہ جات لکھوایا کرتے تھے۔ مُلّا محمد مراد "زرین قلم" میر حسن کے شاگردوں میں سے تھا۔ تاریخ وفات اور دیگر مشخصّات معلوم نہ ہو سکے۔

مُلّا محسن شیریں قلم

مُلّا محمد مراد "زرّین قلم" کا چھوٹا بھائی تھا۔ حُسن خط میں دونوں بھائی یکسان تھے۔ مُلّا محسن نے ان عمارات کے کتبہ جات کی تکمیل کی جو بھائی مُلّا مراد کے فوت ہونے کے بعد بچ گئے تھے۔ مُلّا محسن اور محمد مراد کے کتبے چونکہ یکساں طرزِ تحریر کے حامل ہیں اس لئے

بعض اوقات امتیاز مُشکل ہو جاتا ہے۔ مُلاّ حُسن کو شیریں قلم کا خطاب شاہ جہان بادشاہ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ روحانیت میں یہ شیخ داؤدؒ بتہ مالو سے مستفید تھا۔ تاریخِ وفات دستیاب نہ ہو سکی۔ حسن نے مُلاّ محسن شیریں قلم، میر حسن اور مُلاّ مراد کا تذکرہ کشمیر کے فارسی شعراء کے ذیل میں کیا ہے لیکن ثبوت میں کوئی شعر پیش نہ کر سکا ہے۔

احمد بن ابراہیم

عہدِ شاہ جہانی میں کشمیر کا مشہور خوشنویس تھا۔ محلہ خندہ بھون، سرینگر کشمیر میں رہائش تھی۔ اصنافِ خط میں خطِ نسخ عمدگی سے لکھتا تھا۔ احمد بن ابراہیم کی خوش خطی کا ایک نمونہ بشکل صوفیانہ مثنوی کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ یہ مثنوی ۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۴۸ھ بوقت پیشن مطابق بدھ، ۱۱ جولائی سنہ ۱۶۳۸ء کی تحریر ہے۔

میر افضل اندرابی

میر محمد طاہر کے فرزندِ ارجمند تھے۔ دو تین واسطوں سے آپ کا نسب نامہ سید میر مبرک اندرابیؒ سے جا ملتا ہے جن کے اجداد شمالی افغانستان کے مشہور صوبہ اندراب سے آکر کشمیر میں آباد ہو گئے تھے۔ ایسا سلطان سکندر بُت شکن کے عہد میں ہوا تھا۔ تصوُّف میں میر افضل اندرابی شاہ ابوالحسن قادری کے دستِ حق پرست پر بیعت تھے۔ خطِ نسخ میں مہارت ہونے کے باعث کتابتِ قُرآنِ مجید مشغلہ تھا۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآنِ مجید کا ایک نسخہ شاہ ابوالحسن قادری کو بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔ میر افضل اندرابی سنہ ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) میں فوت ہو کر آبائی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

مرزا اکمل الدین بیگ خان بدخشیؒ

خواجہ احمد یسوی کی اولاد سے تھے۔ آپ کا نام اکمل الدین شاہ جہان کا رکھا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے مرزا اکمل الدین بیگ خاں بدخشیؒ نے سنہ ۱۰۴۱ھ سے سنہ ۱۰۵۰ھ کے مابین وِلادت پائی تھی۔ فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جس کا مظاہرہ اُن کی ضخیم مثنوی (چار جلدوں میں) بحر العرفان سے ہوتا ہے، مرزا موصوف خطاطی اور خوشنویسی سے بھی بہرہ ور تھے۔ خطِ نسخ اور نستعلیق دونوں میں یکساں طور پر مہارت تھی۔ مثنوی مولانائے روم لکھا کرتے تھے جو ذریعۂ معاش تھا۔ آپ نے اپنی مثنوی بحر العرفان کی ایک نقل اپنے مُرید مُلا نور الدّین کو عطا کی تھی جو خود اپنے ہاتھ سے کی تھی۔ آپ کے قلم کا تحریر کردہ اوراد فتحیہ کا ایک قلمی نسخہ کلچرل اکادمی، لال منڈی، سرینگر کشمیر میں زیر اندراج ۲۸۶ محفوظ ہے۔ یہ مخطوط انتہائی اعلیٰ و عمدہ خطِ نسخ میں ہے۔ مرزا اکمل الدین بیگ

خان بدخشیؒ اتوار، ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۱۳ھ (یکم نومبر ۱۷۹۹ء) کو بعہد ناصر الدین محمد بادشاہ غازی فوت ہو کر محلہ حول سری نگر میں سپردِ خاک ہوئے۔ "زعالم پیر کامل رفت" تاریخ وفات ہے۔
۱۲۱۳ھ

شاہ محمد صفا

اواخرِ مغل دور کے بزرگ تھے۔ سیّد جمال الدین متوفی ۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) سے ارادت (اعتقاد) تھی۔ اکلِ حلال کے عادی تھے۔ کتابت ذریعۂ معاش تھا۔ تین دِن کے لئے اور کبھی ہفتہ یا پندرہ روز کے لئے بیک وقت روٹی خرید کر رکھ لیا کرتے تھے اور بقدر روزینہ بتدریج کھایا کرتے تھے۔ ایسا اُجرتِ کتابت کی کمی کی بدولت تھا۔ اواخرِ عمر میں محبوبِ سبحانی غوثِ صمدانی حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ کے مزار پُرانوار کی برکات و فیوض سے مستفید ہوئے تھے۔ وفات اور دیگر احوال و کوائف دستیاب نہ ہو سکے۔

بابا صالح

عہدِ شاہ جہانی کے متوکّل کاتب اور خوشنویس تھے۔ خطِ نسخ میں عمدہ مہارت ہونے کے باعث مصاحف قلمبند کیا کرتے تھے۔ موضع گواگوہ پرگنہ اچھہ میں رہائش تھی۔ ابوالفقراء بابا نصیب الدین غازیؒ کے حلقۂ مریداں میں داخل تھے۔ روایت کے مطابق بابا صالح شاہی شکار گاہ کے متصل ایک غار میں رہا کرتے تھے کہ اتفاق سے شاہ جہان بادشاہ کے بڑے فرزند دارا شکوہ کا اِدھر سے گذر ہوا۔ بابا صالح نے اس موقعہ پر اپنے قلم کا لکھا ہوا ایک حمایل شریف بطور ہدیہ شہزادہ کو پیش کیا۔ اس پر دارا شکوہ نے بیس روپے بطور نذرانہ بابا صالح کو عطا کئے۔ وفات اور دیگر احوال دستیاب نہ ہو سکے۔

مُلّا حبیب اللہ گنائی

عہدِ جہانگیری کے نامور خوش نویس اور کاتب تھے۔ خطِ نستعلیق اور املا و انشا میں یگانۂ روزگار تھے۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے مُلّا حبیب اللہ گنائی کے قلم کی تحریر "مرصاد العباد" کا ایک نسخہ جو تصوّف میں ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُن کے خیال میں یہ مخطوطہ "عجیب نمکین، شیریں اور پختہ نستعلیق میں تھا۔ شروع سے لیکر اخیر تک دس ہزار ابیات ایک ہی قلم سے تحریر تھے۔" مُلّا حبیب اللہ گنائیؒ کو جہانگیر بادشاہ کے دربار میں ایک خصوصی تقرّب حاصل تھا۔ فنِ مناظرہ میں لاثانی تھے۔ ایک موقعہ پر مُلّا محمد رضا اور دیگر علماء کے ہمراہ دہلی جا کر ایک مذہبی مباحثہ میں علمائے اثنا عشریہ پر فوقیت حاصل کی تھی۔

مُلّا عبدُاللہ

مؤرخِ کشمیر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کے اُستاد تھے۔ محلہ بلدیمر، سرینگر میں سکونت تھی۔ مُلّا عبدُاللہ علاوہ علوم معقولہ اور ریاضی میں مہارت کے خطّ و انشا سے بھی حظّ وافر رکھتے تھے۔ فرخ سیر کے حکم سے فتاویٰ عالمگیری کے فارسی ترجمہ پر مامور ہوئے تھے کہ بادشاہ کی بے وقت وفات سے یہ کام اُدھورا رہ گیا۔ وفات اور دیگر احوال و کوائف دستیاب نہیں ہیں۔

عبدالوہاب خوشنویس

آخون مُلّا عبدالسلام وکیل بادشاہ کے ارادت مند تھے۔ باغبانپورہ، سرینگر کشمیر میں سکونت تھی۔ عبدالوہاب نے اپنی خوش نویسی کا واقعہ یوں بیان کیا ہے:

> "یہ بندۂ حقیر عبدالوہاب چودہ برس کی عمر سے حضرت آخون کی خدمت میں آمد و رفت رکھتا تھا۔ پہلے برس عید الضحیٰ تھی۔ تیسرے دن بندہ سلام اور مُلاقات کے لئے گیا۔ گھر میں تشریف فرما تھے۔ سُنتے ہی باہر نکل آئے۔ دائیں ہاتھ میں قلم اور بائیں میں گوشت کا ٹکڑا تھا۔ دونوں چیزیں میرے حوالے کر دیں۔ اُسی دن سے اپنے خوشنویس ہونے کا یقین ہو گیا۔ کرامت ظاہر ہوئی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔"

علی نسب سیّد

میر رضی سپرانٹنڈنٹ بیوتاتِ کشمیر کے فرزند اور میر احمد داماد شاہ نواز خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ خوشنویسی کی مشق نہایت عمدہ تھی۔ اہلِ ایران کے طرز پر لکھا کرتے تھے۔ شاعری میں سیّد تخلّص تھا، چنانچہ یہ دو ابیات اِن سے یادگار ہیں:

از بادہ برفروختہ حُسنِ فرنگ را　　خطش بہ شیشہ کردہ بزیر او زنگ را

در بحرِ وجودش دو جہان نقش بر آبست　　با ہستیٔ او ہستیٔ ما نقش بر آبست

عنایتُ اللہ

سرینگر، کشمیر کے پنڈت قبیلہ سے متعلق تھے۔ شیخ عبدالوہاب نوری گنائی متوفی سنہ ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) سے اعتقاد تھا۔ خطِ نستعلیق نہایت عمدہ اور صاف لکھتے تھے۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا "فتحاتِ کبرویہ" کا ایک مخطوط محکمۂ تحقیق و اشاعت، سرینگر، کشمیر میں محفوظ ہے۔ عنایت اللہ پنڈت نے یہ نسخہ مرشد سے اظہارِ عقیدت کے طور پر سنہ ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں یعنی مصنف کی وفات

کے پانچ سال بعد تحریر کیا ہے، اس لئے قابلِ اعتماد ہے۔

میر کمال الدین اندرابی

میر کمال الدین اندرابی کشمیر کے نجیب زادوں (شرفاء) میں سے تھے۔ شاعری میں رُسوا تخلّص تھا۔ عنفوانِ جوانی میں مشقِ سخن بہم پہنچائی تھی۔ علاوہ ازیں خطِ نستعلیق شکستہ میں بھی عجیب مہارت تھی۔ عرصۂ دراز تک شاہزادہ میرزا اکبر فرزند اورنگ زیب عالمگیر کے مصاحب تھے۔ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں بعہد فرخ سیر انتقال کر گئے۔ میر کمال الدین اندرابی، خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کے مرشدین میں سے تھے۔ اردو کے ریختہ نگاروں میں اُن کا نمبر سب سے پہلا ہے، اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کی ابتدا، ولی دکنی کے بالمقابل میر کمال الدین اندرابی رُسوا سے ہوئی ہے اور یہ شرف کشمیر کو حاصل ہے۔

خواجہ محمد نقشبندی

جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ اس عہد کے نامور خطاط اور خوشنویس تھے۔ نسخ، تعلیق، ثُلث، شکستہ اور خطِ کوفی استادانہ لکھتے تھے۔ محکمۂ تحقیق و اشاعت میں آپ کے خطوط کے نمونے محفوظ ہیں۔ دیگر کوائف و حالات دستیاب نہیں ہیں۔

محمد اسلم ٹوپیگرو

خواجہ محمد اعظم ٹوپی گرو کے فرزند تھے۔ ذوقِ خدا طلبی کے ساتھ ذوقِ خوشنویسی بھی تھا۔ فنِ خطاطی اور قطعہ نویسی میں بے مثال تھے۔ ۱۹ رجب ۱۱۸۱ھ مطابق سنیچر ۱۲ دسمبر ۱۷۶۷ء کو پرگنہ شاہ آباد، کشمیر میں فوت ہو کر میرہ میدان میں باپ کی قبر کے متّصل دفن ہوئے۔ اسلم

(بہ تخفیف دہ) رحمت حق شد

۱۱۸۱ھ

محمد اسماعیل

عہدِ شاہ جہانی کے ایک خوشنویس تھے۔ خطِ نسخ میں عمدہ و اعلیٰ مہارت تھی۔ آپ کے قلم کا کنز العباد مصنفہ علی ابن احمد الغوری، کا ایک نسخہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ تاریخ کتابت ۳، رجب ۱۰۶۴ھ (بدھ، ۱۰ مئی ۱۶۵۴ء) ہے۔

میر محمد اشرف

صوبیدار کشمیر اسلام خاں مشہدی کا بڑا بیٹا تھا۔ یہ میر محمد اشرف نسخ، تعلیق، شکستہ اور نستعلیق میں یدِ طُولیٰ رکھتا تھا۔ لوگ اُس کی شکستہ نویسی کی نقول لیا کرتے تھے۔ مثنوی مولانائے روم کا از خود انتخاب کیا تھا اور اُسی کو بلا ناغہ پڑھا کرتا تھا۔ میر محمد اشرف

کا اصلی نام محمد اصغر تھا، مگر عوام میں اشرف خاں مشہور تھا۔ اشرف خاں اگرچہ خوش خطی کی ہفت اقسام میں ماہر تھا تاہم نستعلیق نگاری کی شان نہایت اعلیٰ وارفع تھی۔ اشرف خاں کے خط کے نمونے بیاض بختاور خاں کے صفحہ ۲۲ پر موجود تھے۔ بختاور خاں عہد عالمگیری میں فوت ہوا تھا۔ اُس نے زندگی میں ایک بیاض مرتّب کی تھی جس میں اپنے زمانے کے مشہور خوشنویسوں کی وصلیاں اور نمونے جمع کئے تھے۔ بیاضِ بختاور خاں کے ایک فارسی قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیاض اُس نے ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں مرتّب کی تھی۔

محمد اعظم مانٹجی

محمد عارف کبروی کا فرزند تھا۔ علاؤالدّین پورہ، سرینگر، کشمیر میں رہا کرتا تھا۔ محمد اعظم نے خوش نویسی کا فن محمد مراد بدخشانی سے اخذ کیا تھا۔ محمد مراد بدخشانی اٹھارویں صدی عیسوی کے اہلِ دل بزرگ اور خوشنویس تھے۔ محمد اعظم کی خطّاطی کے دو نمونے محکمۂ تحقیق واشاعت، سرینگر کشمیر کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ سالِ کتابت بالترتیب ۱۱۵۴ھ اور ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۱ء اور ۱۷۵۰ء) ہے۔

میر سیّد محمد اعظم

میر سید عبدالکریم ریشی فرزند میر سیّد ابراہیم بانیٔ خاندانِ ساداتِ بھید تھے۔ میر سید محمد اعظم نہایت خوش قلم اور خوش خط تھے۔ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف سرینگر میں موجود ہے۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۱۶۲ھ (۲۹ مارچ، روز منگل، ۱۷۴۹ء) کو انتقال فرما گئے۔

مُلّا محمد امین دانا

اپنے وقت کے اعلیٰ اور کامیاب ترین خوشنویس تھے۔ نسخ، تعلیق، نستعلیق اور ثُلث میں کامل دستگاہ تھی۔ فرُخ سیر کے عہد میں دہلی گئے اور امیر الامراء سیّد حسین علی خاں بہادر مدار المہام (وزیرِ اعظم) کے منشیوں میں داخل ہو گئے۔ شاعری میں رعایتِ لفظی کا پہلو غالب تھا جو غنیؔ کشمیری کی شاعری کا اثر تھا۔ کشمیری تذکرہ نگاروں نے داناؔ کا شمار زمرۂ شعرا میں کیا ہے۔ فارسی میں یہ اشعار داناؔ سے یادگار ہیں:

اضطراب اندر سخن عیب است داناؔ چون ہلال
مصرعۂ برجستہ باید گویس از ماہے بود

زشوقِ روئے تو خورشید خانہ بردوش است فلک بذوقِ وصالت تمام آغوش است
لباس فقر براندامِ من بود زیبا مرا ہمیشہ چو طاؤس خانہ بردوش است

میر محمد باقر طغرا نویس

میر محمد باقر کشمیری طغرا نویس عہدِ جہانگیری اور شاہ جہانی کی زینت تھا۔ نسخ، نستعلیق اور شکستہ میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی۔ مرزا کامگار بیگ مؤلف توزک جہانگیری نے اس کے فن کو بیحد سراہا ہے۔ میر محمد باقر شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص کاتب تھا۔ شہنشاہ نے اکثر رقعہ جات میں اُس کا نام بڑے احترام سے لیا ہے۔ چونکہ مُلّا محمد باقر کو خطِ طغرا میں جو فرامین کے آغاز میں بطور عنوان لکھا جاتا ہے، کامل مہارت تھی، اس لئے زمرۂ خوش نویساں میں مُلّا باقر طغرا نویس کے نام سے مشہور ہوا۔ وفات اور دیگر کوائف نہ ہو سکے۔

محمد رضا مُشتاق

ناجی قبیلے سے تھا جو محلہ نوشہرہ، سرینگر میں رہائش پذیر تھا اور جن کے افراد کا اکثر و بیشتر مشغلہ کتابت اور خطّاطی تھا۔ اس مناسبت سے محمد رضا مشتاق بھی کتابت کیا کرتا تھا۔ مثنوی مولوی معنوی کی کتابت اور نقل نویسی محبوب مشغلہ ہونے کے ساتھ ساتھ ذریعۂ معاش بھی تھا۔ زندگی بھر مجرّد اور آزاد رہا۔ محمد رضا مشتاق بحیثیت فارسی شاعر کے کشمیری شعراء میں ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں بعہدِ محمد شاہ فوت ہو گیا۔

"شاہ مشتاق از سرِ دُنیا گذشت" بطور تعمیہ[1] تاریخِ وفات ہے۔

میر محمد معروف

قاضی محسن اندرواری جو قاضی موسیٰ شہید متوفی ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) کی اولاد سے تھے، کے فرزند تھے۔ میر محمد معروف فنونِ ہنروری سے آراستہ اور حسنِ خط سے پیراستہ تھے۔ میاں محمد امین دار سے اعتقاد تھا۔ شاعری سے بھی شغف تھا اور قدیم طرز کے متبع تھے۔ بارہویں صدی ہجری کے پہلے نصف میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

میرزا بیگ

اصل میں بخارا کے تھے، مگر کشمیر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ میاں محمد امین دار متوفی ۱۱ رمضان المبارک ۱۰۹۹ھ (سنیچر، ۳۰ جون ۱۶۸۸ء) کے خاص معتقد تھے۔

---

[1] اس کی صورت یہ ہے کہ جب شاہ مشتاق اور "د" کے اعداد جمع کئے جائیں گے تو ان کا مجموعہ ۱۱۵۱ ہوگا، اور یہی محمد رضا مشتاق کا سالِ وفات ہے۔

سخنوری میں فاضل اور خوش نویسی میں مردِ کامل تھے۔

ھدایتُ اللہ

بارہویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کے ایک اچھے خوشنویس تھے۔ ہدایت اللہ کا زمانہ کشمیر میں مغل دور کے اخیر کا تھا۔ خطِ نسخ و نستعلیق میں عمدہ مہارت تھی۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ محکمۂ تحقیق و اشاعت سرینگر میں محفوظ ہے۔ سالِ تحریر ۱۱۳۹ھ = ۱۷۲۶ء ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی ہجری میں خوش خطی کی مشق "تعلیم" کہلاتی تھی۔

○

شیرازہ

کو

اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرائیے اور اسے زیادہ سے زیادہ ادب نوازوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیجئے۔

○

برج پریمی

اورنگ زیب کا سفرِ کشمیر

برنیر کی زبانی

> "—— لیکن جب بادل بکھر گئے ہوں، کہر اٹھ
> گیا ہو اور کشمیر کی بہار یا خزاں نے اپنے اسرار کھول دیے
> ہوں تب ایک سخت سے سخت جان سیاح کا دل بھی
> پگھل جاتا ہے اور وہ برنیر بن جاتا ہے ——"
>
> فرانسس ینگ ہسبنڈ

یہ کیسی مٹی ہے کہ جو اس قدر مشکبار ہے؟ یہ کیسی جگہ ہے کہ جس کے نیلے امبر میں من موہنے کا طلسم ہے؟ یہ کیسی سرزمین ہے کہ جس کی صبحوں اور شاموں میں روحانی اسرار ہیں؟ یہ کیسی وادی ہے کہ جس کے جنگلوں کے سناٹوں میں اپسراؤں کے نغموں کی گنگناہٹ ہے؟ یہ کیسی فضائیں ہیں کہ جن کی ہواؤں میں سورگ کا آنند ہے اور جس کے پربتوں میں حسن کی شراب برستی ہے۔

ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ تہذیب نے انگڑائی لی تو لوگ دور دور سے کارواں در کارواں

یہاں آنے لگے۔ موسموں کے سرد و گرم سے بے پروا، بھیانک راستوں کی صعوبتوں سے بے نیاز۔ شاہ و گدا، صوفی اور سنت، سیّاح اور لٹیرے، مورخ اور عالم، بوالہوس اور اہلِ دل۔ ماضی کو ایک پل پلٹ کر دیکھیں تو مشعلیں جلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک سے ایک اہلِ دل اور اہلِ دماغ، سیلانی اور آوارہ گرد، تحیّر اور استعجاب سے آنکھیں ملتے ہوئے یہ لوگ یہاں کی شادابیوں سے مسحور ہوئے اور دل کے چراغ جلا کر واپس چلے گئے۔ ان میں کچھ اہلِ ہوس اور رہزن بھی تھے کہ اس مٹی کو اپنی ریاکاریوں سے تہہ و تیغ کیا۔ شاعر بھی تھے کہ امرت برسایا، مورخ بھی تھے کہ تاریخ کا نیا باب لکھا۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے ـــــــ ایسے ہی ان گنت نامور اور بے نام لوگوں میں ایک فرانسیسی معالج بھی تھا۔ فرانسس برنیر، جو یہیں اسی مٹی کی مہک اور اس وادی کے رنگ و بو سے مسحور ہو کر "برنیر" بن گیا اور سرمستی کے عالم میں اُس کی زبان سے نکلا:۔

> "میں کاشمر سے مسحور ہو چکا ہوں۔
> حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت حسن و جمال کی ان تمام
> جلوہ سامانیوں سے بہت بلند اور بہت بالا ہے
> جس کا میں نے کبھی تصور بھی کیا ہو" [ف]

فرانسس برنیر جون نام کے ایک فرانسیسی گاؤں میں ۱۶۲۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین متوسط طبقہ کے کسان تھے۔ برنیر کی ابتدائی زندگی پردۂ اخفا میں لپٹی ہوئی ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پرورش کس طرح ہوئی۔ اس نے پروفیسر پیری گاسنڈی نام کے مشہور فرانسیسی فلسفی کے قدموں میں PHYSIOLOGY (عضویات) کی درسیات حاصل کیں۔ ۱۶۵۲ء میں اس نے مونٹ پلیسیر کی یونیورسٹی سے ریڈیکولیشن کا امتحان پاس اور پھر اسی سال ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری بھی حاصل کی۔

برنیر کو غیر ممالک کی سیاحت کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اس زمانے میں اہلِ یورپ نے

[ف] FRANCOIS BERNIER :- TRAVELS IN THE . MOGUL EMPIRE, PAGE 400

دُنیا کے مختلف ممالک میں دریافتوں کا سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ پسماندہ ممالک کو دریافت کر کے ان پر کسی طرح سے قبضہ جمالیا جائے۔ نوآبادیاتی راج کا تصوّر پیدا ہو چکا تھا، اس لئے سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو نئی حیرت زا کہانیاں سنا سنا کر بہلایا جا رہا تھا۔ برنیر نے ایسی کئی کہانیاں سنی تھیں۔ دوسروں کے تجربات کی کہانیوں نے اسے بھی دور دراز ممالک کی سیاحت پر اُکسایا۔ چنانچہ ابھی جب وہ زیرِ تعلیم ہی تھا کہ اس نے شمالی جرمنی، پولینڈ اور سوئیزرلینڈ کی سیاحت کی۔ ۱۶۵۴ء میں وہ فلسطین اور شام کی سیاحت سے لوٹا تاکہ اپنے رہنما اور استاد پروفیسر گاسنڈی سے مل سکے جس کی زندگی کا سورج ڈوب رہا تھا۔ پروفیسر گاسنڈی نے ۱۶۵۵ء میں اپنے لائق اور ہونہار شاگرد کے بازوؤں میں جان دیدی۔ ۱۹۵۶ء میں فرانس نے پھر رختِ سفر باندھا۔ وہ مختلف مقامات میں سے گھومتے ہوئے ہندوستان کے ساحل پر پہنچا اور سورت کے مقام پر اُترا۔

برنیر ہندوستان میں اس وقت پہنچا جب سیاسی لحاظ سے ہندوستان میں زبردست اتھل پتھل تھی۔ مغل تاجدار شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ سارے ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا دارا شکوہ اورنگ زیب کے ہاتھوں اجمیر کے قریب دیورا کی جنگ میں شکست کھا کر احمد آباد کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات برنیر سے ہوئی۔ اس بدنصیب شہزادے کی بیگم کو اسی دوران سُرخ باد کا روگ لگا تھا۔ برنیر اس کا باقاعدہ علاج معالجہ کرنے لگا۔ شاہ جہاں قید ہو کر موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اورنگ زیب حکومت سنبھال چکا تھا۔ احمد آباد کے صوبے دار نے اسی زمانہ میں اورنگ زیب سے وفاداری کا اعلان کیا۔ اس سے دارا اور بھی گھبرا گیا۔ اُس کے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ اسلئے وہ سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ برنیر اس کا ہمرکاب تھا لیکن جُھلسانی والی گرمی کے باعث بیل گاڑی جو برنیر کی سواری کے طور پر استعمال کی گئی ٹوٹ گئی۔ دارا برنیر کی سواری کا کوئی معقول انتظام نہ کر سکا اسلئے اسے ساتھ نہ لے جا سکا اور خود رات کی تاریکی میں چھپتا ہوا سندھ کی طرف بھاگ گیا۔ برنیر پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن ہر بار اُسے اپنے جودتِ ذہن نے بچا لیا۔ کسی طرح سے وہ ایک امیر کی وساطت سے ۱۶۶۳ء میں دلی پہنچا جہاں شاہ جہاں آباد کے صوبے دار دانشمند خان کی وساطت سے اُسے

مغل دربار میں باریابی حاصل ہوئی لیکن اس کے اندر کا سیاح ہمیشہ اس کی رہنمائی کرتا رہا اور تھوڑے ہی عرصے میں دہلی اور آگرہ کی درباری زندگی سے واقف ہوگیا۔ اس نے دربار میں اس قدر رسائی حاصل کی کہ شاید ہی کسی غیر ملکی کو مغل دربار کی اندرونی سازشوں اور مکروہ سیاست کا اتنا علم حاصل ہوا ہو جس قدر برنیر کو علم تھا۔ برنیر اپنے قیام کے بیشتر اوقات میں مغل دربار کے ساتھ وابستہ رہا۔ برنیر کی اہمیت اس لئے نہیں کہ وہ مشہور شاہی معالج تھا بلکہ اس لئے ہے کہ وہ مغل دربار میں رہا اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ ہندوستان کے کئی علاقوں میں گھوما اور اپنی سیاحت کے تاثرات پورے خلوص کے ساتھ قلمبند کرتا رہا۔ ہمارے لئے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ برنیر کشمیر آیا اور کشمیر کے بیشتر علاقوں میں بامقصد سیاحت کرتا رہا اور بہت سی ایسی تفاصیل فراہم کیں جن کی آج بڑی اہمیت ہے۔ برنیر آج سے تین سو سال پہلے ہمارے یہاں آیا تھا۔ اس کا سفرنامہ ہمیں تین سو سال قبل کے کشمیر میں واپس لے جاتا ہے اور ہم اس عینی گواہ کے تاثرات اور تاریخی حقائق پڑھ کر اس دور کی زندگی اور معاشرے کے بارے میں واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

اورنگ زیب کشمیر کی سیاحت کے لئے دہلی سے ۶ دسمبر ۱۶۶۴ء کو روانہ ہوا۔ برنیر اس شاہی قافلے کے ہمراہ تھا۔ یہ قافلہ ۲۵ فروری ۱۶۶۵ء کو لاہور پہنچا اور یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کا قیام اس قافلے کے ساتھ چند ماہ رہا وہ ۱۶۶۸ء کو فرانس واپس لوٹا جہاں اپنی کتاب ۱۶۶۹ء میں مکمل کرلی۔ فرانس میں ہی اس کا انتقال ۱۶۸۸ء کو ہوا۔

برنیر کا یہ سفرنامہ اس لئے بھی اہم ہے کہ یہ کسی شاہی حکم کے تحت نہیں لکھا گیا۔ اس سفرنامے کا مقصد ذاتی شہرت حاصل کرنا تھا نہ مغل شہنشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ یہ برنیر کے اپنے اندر کے سچے سیاح کی لگن تھی جو وہ مختلف مقامات کی سیر کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرتا تھا۔ ان بیانات کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ سفرنامہ ایک غیر ملکی نے لکھا ہے۔ اس لئے اس کا اپنا انداز ہے۔ اس کے سوچنے کا ڈھنگ مغربی ہے۔ وہ مغرب کے معیار سے یہاں کی روایات اور یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ بعض مقامات پر ہمارے اعتقادات کا تمسخر اڑاتا ہے

اور کشمیریوں کی سادگی کو ہدفِ ملامت بناتا ہے۔ ہمیں ضعیف الاعتقاد کہتا ہے اور کئی جگہوں پر ایسی باتیں بیان کرتا ہے۔ جن سے گمان گذرتا ہے کہ اس نے ہم سے زیادتی کی ہے لیکن اس بات کے باوجود اس مختصر سے سفرنامے کی افادیت کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کشمیر آنے کے راستوں اور گذرگاہوں کا ذکر کرتا ہے اور اس عہد کے کشمیر کی اقتصادی اور سماجی زندگی پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ یہاں کے حُسن لازوال کی حشر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر بنتا ہے اور یہاں کی صناعی، ہنرمندی، فنکارانہ باریکی کو خلوص کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

اورنگ زیب اپنے شاہی کاروں کے ساتھ دہلی سے لاہور، لاہور سے بھمبر اور بھمبر سے کشمیر آیا جسے مغل ہندوستان کی جنت (PARADISE OF INDIA) کہتے تھے۔ برنیر نے یہ سفرنامہ مکاتیبی فارم میں لکھا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو مکاتیب لکھتا ہے جس میں اس حیرت زا سفر کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے۔ اپنا پہلا خط وہ دہلی سے میوسیو ڈیمر ویلین کو ۱۴ دسمبر ۱۶۶۴ء کو لکھتا ہے۔ سفرنامے کی یہ روداد

برنیر نے اپنے منفرد اور دلچسپ انداز میں اپنے گہرے شاہدے اور تجربے کی بنا پر اپنی مشہور کتاب میں قلم بند کی ہے جس کا عنوان "ٹریولرز ان ہندوستان" یا "دی ہسٹری آف دی لیٹ ریولیوشن آف ڈومی نینس آف گریٹ مغل" - ۱۶۵۵ء - تا - ۱۶۶۱ء ہے - اس کتاب کا ترجمہ پہلی بار ہنری اولڈن برگ (HENERY OULDIN BURG) نے ۱۶۸۴ء کیا۔ دوسری بار اس کا ترجمہ ۱۸۹۱ء میں "ٹریولرز ان مغل ایمپائر (۱۶۵۶ء — تا — ۱۶۶۸ء)" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہ ترجمہ آرچ بالڈ کانسٹیبل (ARCHIBALD CONSTABLE) نے کیا تھا۔ اس مجموعے کے علاوہ دوسرے مباحث اور مضامین کے کل بارہ خطوط شامل ہیں جن میں نو مکاتیب موسیو ڈیمر ویلین کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان نو خطوط کا تعلق کشمیر کی سیاحت سے ہے۔ برنیر کے مطابق اورنگ زیب ۶ر دسمبر ۱۶۶۴ء کو دہلی سے کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ اپنی علالت کے بعد اورنگ زیب تبدیلیٔ آب و ہوا کیلئے

صحت یاب ہونے پر لاہور اور کشمیر جانا چاہتا تھا۔ جوتشیوں نے شبھ مہورت دیکھ لیا تھا۔ یہ بیان اورنگ زیب کی افتادِ طبع کے پیشِ نظر مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اورنگ زیب جیسے شہنشاہ نے جوتشیوں کو اس قدر درخورِ اعتنا سمجھا تھا کہ وہ سفر کے وقت بادشاہ کا مہورت دیکھتے تھے۔ شہنشاہ اپنے ساتھ ۳۵ ہزار رسالدار ذاتی محافظین کی حیثیت سے لے آیا تھا۔ اس کے علاوہ دس ہزار سے زاید پیادہ فوج اور توپ خانہ بھی تھا۔ یہ مغلیہ جاہ و حشمت تھی۔ شہنشاہ کے ساتھ دو کیمپ ہوا کرتے تھے جن میں ایک کیمپ "پیش خیمہ" کہلاتا تھا۔ یہ کیمپ شہنشاہ کے پڑاؤ پر پہنچنے سے قبل شہنشاہ کے شایانِ شان استقبال کے لئے تیار رہتا تھا۔ ایسے کیمپوں کا سلسلہ اکبر کے زمانے سے جاری تھا۔ آئین اکبری کے مطابق ایسے کیمپوں کیلئے ۱۰۰ ہاتھی، ۵۰۰ اونٹ اور ۴۰۰ بیل گاڑیاں اور ۱۰۰ بار برداروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ برنیر کے زمانے میں یہ تعداد کچھ کم ہو گئی تھی اور صرف ۶۰ ہاتھی ۲۰۰ اونٹ اور ایک سو خچر اور ۱۰۰ بار بردار استعمال ہوتے تھے۔ یہ معمولی فرق ہے۔ اس سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر زیادہ جاہ حشم کا قائل تھا۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ اعداد و شمار اس بات پر دال ہیں کہ اس زمانے میں بھی شاہی جاہ و جلال اور حشمت و وقار کو قائم رکھنے کے لئے عوام کے خون پسینے کا استحصال کیسے ہوتا تھا۔ عوام کی غربت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور سرکاری خزانے کا بیشتر پیسہ ظاہری نام و نمود پر ایسے ہی خرچ ہوتا تھا۔ اس کا ایک سرسری اندازہ نیچے درج کئے گئے ایک خط کے اقتباس سے ہوگا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ لاہور پہنچنے پر بہرحال یہ شاہی قافلہ لگ بھگ دو ماہ رہا اور بڑے صبر اور اطمینان سے کشمیر کے پہاڑوں پر برف کے پگھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

برنیر نے اپنے ساتویں خط بتاریخ ۱۰ مارچ ۱۶۶۵ء کو لاہور سے آخر کار کشمیر آنے کا ذکر کیا ہے۔ اس کا انداز اگرچہ مکاتیبی ہے لیکن اس کا اسلوب شاعرانہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

> "سورج طلوع ہو رہا ہے لیکن گرمی ناقابلِ برداشت ہے۔
> آسمان پر بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا بھی نہیں۔ نہ ہی ہوا کی کوئی
> آہٹ سنائی دے رہی ہے ...... میرے گھوڑے

> تکان سے چور ہیں ...... لاہور سے چلنے کے بعد ان کو سرسبز گھاس کا ایک تنکا بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ کل ہمارا ایک باربردار جس کے پاس خیمہ نہیں تھا رات بھر کھلے آسمان کے نیچے رات گذارنے کے لئے پڑا رہا۔ ایک پیڑ کے نیچے اس کی لاش ملی۔ میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ میں بھی خود رات ڈھلنے سے پہلے ہی کہیں مر نہ جاؤں۔۔
>
> ....۔ میری تمام اُمیدیں اس محلول کے ساتھ وابستہ ہیں جس میں لیمونیڈ خشک دہی اور گھلی ہوئی شکر ملی ہوئی ہے۔ جو میں ابھی پی چکا ہوں اور مزید پینے جا رہا ہوں۔
>
> روشنائی بھرے قلم کے نب میں سوکھتی جا رہی ہے اور قلم خودبخود ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے" ؎

یہ سب اپنی جگہ لیکن برنیر کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مغل بادشاہوں کے مقابلے میں اورنگ زیب لوگوں کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ جس جاہ و حشمت کے سامان کے ساتھ وہ لاہور آیا تھا اس کا خاصا حصہ کشمیر میں داخل ہونے سے قبل واپس کر دیا تاکہ کشمیر میں اناج کی قلت پیدا نہ ہو۔ فوج کے ساتھ بیشتر امرأ و عمائدین اور ان کے عملے کو واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ صرف اپنی بہتی بیٹی روشن آراء اور اس کی چند ہم جلیس خواتین رکھ لی گئیں۔ ایک اعلیٰ افسر پہاڑی درّے کے پاس تعینات کیا گیا تاکہ امراء اور منصبداروں کو وادی میں داخل ہونے سے روک دیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ برنیر کا خیال ہے کہ تقریباً ۱۵ ہزار قلی پہلے سے ہی کشمیر میں جمع تھے جو صوبہ دار کشمیر کی مدد کے لئے پڑوس کے بادشاہوں نے بھیج دیے ہوں گے یا از خود معاش کی

؎ FRANCOIS BERNIER :- GRAVELS IN THE MOGUL EMPIRE, PAGE 389

تلاش میں آئے ہوں گے۔ ایک شاہی حکم کے مطابق ہر ۱۰۰ پونڈ وزن کے لئے ۱۰ کراؤن مقرر تھے اور گمان غالب ہے کہ اس طرح سے ۳۰ ہزار لوگوں کو روزگار مہیا ہوا ہوگا۔

کشمیر میں برنیر کا قیام تقریباً تین ماہ سے زیادہ رہا۔ یہاں پہنچ کر وہ صرف معالج کی حیثیت سے شاہی مریضوں کا علاج معالجہ نہیں کرتا بلکہ وہ کھلی آنکھ سے قدرت کے جلووں کو دیکھتا ہے اور شاعر بنتا ہے۔ وہ ان راستوں اور گذرگاہوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے جہاں سے شاہی کارواں گذرا۔ وہ کشمیریوں کے رہن سہن، ان کے اخلاق ان کے آداب، زندگی کی تصویر کھینچتا ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ زیادہ گہرا بھی نہیں اور نہ بالکل سطحی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے نقطہ نظر سے خلوص ہی برتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کی سوچ اور اس کا تفکر مغربی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے نقطہ نظر سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ ایک بات کو البتہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اپنے مختصر سے قیام کے دوران اس نے نہ صرف لوگوں کے بارے میں اپنی رائے مرتب کی۔ بلکہ یہاں کی تاریخ اور یہاں کے جغرافیہ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں اور اپنے مکاتیب میں اس کا اظہار کیا۔ وہ حیدر ملک کی تاریخ کا ذکر کرتا ہے، جو شاہجہاں کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ وہ اُسے فارسی سے فرانسیسی زبان میں منتقل کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ ستی سر کے پانی کی نکاسی کو کشپ ریشی کا معجزاتی کارنامہ تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اسے انسانی کارنامہ بھی قرار نہیں دیتا۔ اس کا اظہارِ خیال یوں کرتا ہے:

> "میرا اس کے برعکس یہ خیال ہے کہ یہ پہاڑ زمین کے نیچے کسی غار میں
> ڈوب گیا اور بعد میں ایک زبردست بھونچال سے جو ایسے ممالک
> میں غیر ممکن نہیں ہے، ظاہر ہوا"[۲۱]

کشمیر کے حدودِ اربعہ کو وہ تقریباً تیس لیگ لمبا اور دس سے بارہ لیگ[۲۲] چوڑا بتاتا ہے۔

---

[21] FRANCOIS BERNIER: TRAVELS IN THE MOGUL EMPIRE, PAGE 394

[۲۲] لیگ مسافت کا پیمانہ ہے جو تین میل کے برابر ہے۔ اسے فرسخ بھی کہا جاتا ہے۔

یہ ہندوستان کی سرحد پر لاہور کے شمال میں واقع ہے اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ گھیرا ڈالے ہوئے ان پہاڑوں پر گھنے جنگل اور وسیع مرگ ہیں جہاں لاتعداد بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی گھاس چرتے ہیں۔ یہاں جانوروں کی بھی خاصی تعداد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر۔ وہ تیتر، خرگوش، ہرن اور مشک بار جانوروں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن شیر، چیتے، ریچھ، زہریلے سانپ اور اسطرح کے موذی جانور عنقا پاتا ہے۔ وہ یہاں پہاڑوں پر دودھ اور شہد کی ندیاں بہنے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہاڑ بلند و بالا ہیں۔ جن پر برف کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ چوٹیاں دُھند اور بادل سے بہت اونچی اور نظروں سے اوجھل ہیں۔ برنیر جب اس بے پناہ حسن کے جلوؤں کو دیکھتا ہے تو بھر بھر کر اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے۔ وہ اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ اُس کا جذبہ و احساس پگھل کر شاعرانہ لہجہ اختیار کرتا ہے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:

> " ان تمام پہاڑوں کے اطراف سے ان گنت چشمے اور ندیاں پھوٹتی ہیں جو بے شمار پہاڑیوں پر ندیوں اور جھرنوں کی شکل میں سفر کرتی ہیں اور پھر وادی میں پہنچ کر دھان کے وسیع کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ہزاروں جھرنوں اور نالوں کی شکل اختیار کر کے یہ صاف و شفاف پانی ہزاروں آبشاروں بناتا ہوا چلا جاتا ہے اور ایک بڑے دریا کی شکل اختیار کرتا ہے جس میں کشتی رانی ہوتی ہے۔" نہ

برنیر کی نظر بہت تیز ہے اور مشاہدہ عمیق۔ وہ یہاں کے پھلوں کو دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور سیب، آلوچے اور اخروٹ اور ناشپاتی کا ذکر بے محابا کرتا ہے۔ پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ دیکھ کر وہ مچل اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ پھل اور یہ پھول یورپی ہیں لیکن ان پھلوں کی مٹھاس اور لطافت اُسے پسند نہیں۔ وہ انہیں اپنے ملک کے پھلوں.

نہ FRANCOIS BERNIER : TRAVELS IN THE MOGUL EMPIRE, PAGE 396

سے کم تر درجہ دیتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ پھلوں کی جتنی قسمیں یورپ میں اُگتی ہیں اُس کے مقابلے یہاں کے پھل بہت کم تعداد میں اُگتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہاں کی زرخیز مٹی کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ اس کمی کو یہاں کے مالیوں اور باغبانوں کی جہالت اور ان کی کم علمی پر محمول کرتا ہے۔ یہ خیال اُسے پلک جھپکتے میں فرانس کے میوہ زاروں میں لے جاتا ہے۔ جہاں کے مالیوں اور باغبانوں اور اس صنعت سے تعلق رکھنے والوں کی تعریف میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔

برنیر کشمیر کی راجدھانی کو بھی کاشمر کہتا ہے[1] وہ ہندوستان کو اندوستان کہتا ہے۔ اسے یہاں دنیا کے بعض ممالک کی طرح فصیلوں سے گھرا ہوا شہر بھی نظر نہیں آتا۔[2] اس کے مطابق شہر کی لمبائی ایک لیگ کے تین چوتھائی کے برابر ہے اور چوڑائی میں آدھا لیگ ہے۔ اس کے اطراف میں نصف دائیرے کی شکل میں پہاڑوں نے گھیرا ڈالا ہے۔ یہ پہاڑ شہر سے صرف دو لیگ کی دوری پر ہیں۔ برنیر شہر کو ایک جھیل کے کنارے آباد بتاتا ہے۔ جس کا محیط چار سے پانچ لیگ کے آس پاس ہے۔ برنیر نے وتستا پر صرف دو پل کھڑے دیکھے تھے۔ مکان دو یا تین منزلہ تھے جو پتھروں کے بنے تھے۔ اُس نے عمارتوں کی بھاری تعداد کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں بھی مندروں کے کھنڈرات خاصی تعداد میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

برنیر کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شہر کا ہر کونہ دیکھا تھا۔ وہ ہاری پربت اور شنکر آچاریہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطابق شہر کے ایک سرے پر ایک پہاڑی ہے جس پر خوبصورت مکانات تعمیر ہیں۔ مکانوں کے ساتھ باغیچے ملحق ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک مسجد اور ایک مندر ہے۔ اس پہاڑی پر درختوں کی خاصی تعداد ہے۔ برنیر کے مطابق مقامی لوگ اسی ہری پربت[3] کہتے ہیں۔ برنیر اس دوسری پہاڑی کا ذکر بھی کرتا ہے جو اس پہاڑی کے سامنے واقع ہے۔ اس پہاڑی پر بھی ایک پرانی عمارت ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ مندر ہوگا۔ برنیر لکھتا ہے:۔

---

[1] شری نگری کشمیر کی راجدھانی کا قدیم نام ہے جو مہاراجا اشوک نے اسے دیا تھا۔ اسلامی عہد میں یہ نام تبدیل ہو کر پھر کاشمر ہو گیا۔ سکھ عہد میں اسے پھر سری نگر کہا گیا۔ [2] حیرت ہے کہ برنیر کا ذہن ناگر نگر کی طرف کیوں نہیں جاتا جو ہاری پربت کے ایک طرف فیصل کے اندر آباد تھا۔ [3] برنیر ہاری پربت کو ہری پربت HARYPERBET یا شاداب پہاڑ کہتا ہے۔ ہاری پربت سے متعلق وہ کسی دیومالائی تصور کا ذکر نہیں کرتا۔

اس پہاڑی کے سامنے دوسری پہاڑی نظر آتی ہے جس پر ایک
چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجد سے ملحق ایک باغیچہ ہے اس کے ساتھ ہی ایک
بہت ہی قدیم عمارت بھی کھڑی ہے جسے اگرچہ تختِ سلیمان کہتے ہیں
مگر آثار بتا رہے ہیں کہ یہ ایک مندر رہا ہوگا۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ
یہ اس مشہور بادشاہ نے بنوائی تھی جب وہ کشمیر تشریف لائے تھے۔
لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ بھی یہ ثابت کر سکیں گے کہ یہ سرزمین ان کی موجودگی
سے کبھی سرفراز ہو چکی ہے[1]

برنیر قدرت کے نظاروں کا عاشق تھا۔ پھل، پھول، پہاڑ، جھرنے ندیاں، جھیلیں، باغ سبزہ زار اسے حد سے زیادہ پسند تھے۔ وہ مغل باغوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ باغوں کے بیان میں وہ سب سے زیادہ تعریف شالیمار کی کرتا ہے جسے وہ "چاہ لمار" کا نام دیتا ہے۔ برنیر کے مطابق یہ باغ بادشاہ کی ملکیت ہے۔ ڈل جھیل سے داخلے کی نہر کے دونوں اطراف میں شاداب سبزہ ہے اور پھر سفیدے کے درخت قطار اندر قطار۔ برنیر اس باغ کے ایک ایک قدم کو ناپتا ہوا گذر جاتا ہے۔ اس کی بارہ دریوں، اس کے شاداب سبزے، اس کے پھولوں اور پھلوں، آبشاروں اور فواروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ انجانی دنیاؤں میں پہنچ جاتا ہے۔ اتنی باریکی سے شاید ہی کسی سیاح نے شالہ مار کو دیکھا ہو۔

برنیر کا ذوقِ جمال دیکھئے کہ وہ بارہ دریوں، اس کی گیلریوں، اس کے بام و در کے ایک ایک حصّے کو بیان کرتا ہے۔ وہ اس بات پر تصدیق کی مہر ثبت کرتا ہے کہ مغلوں نے یوں ہی جذباتی انداز میں کشمیر کو "جنتِ ارضی" ہیں کہا تھا۔ اکبر نے اسے دائمی طور اپنے قبضے میں رکھنا چاہا۔ اور جہانگیر اس کے حسن پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اس نے اسے اپنی سب سے محبوب آرام گاہ بنایا۔ اس نے کہا تھا

---

[1] BERNIER: TRAVELS IN THE MOGUL EMPIRE, PAGE 399

کہ کاشمر کو اپنے پاس رکھنے کے لئے وہ اپنی عظیم سلطنت کے کسی بھی صوبے کو قربان کر سکتا ہے[1]

برنیر نے جس جذبے اور مشاہدے اور جس گہرائی سے اس سرزمین کو دیکھا تھا اس کا ثبوت اس کے مختلف مطالعوں اور بیانات میں ملتا ہے۔ وہ کشمیری ذہن کی تعریف کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کشمیر کے کاریگر اور فن کار ہندوستان کے کاریگروں میں سب سے زیادہ خوش مذاق، ہنرمند اور اختراع پسند ہیں اسکے مطابق کشمیری کاریگروں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزیں ہندوستان کے ہر حصے میں مقبول ہیں۔ وہ پیپر ماشی کے بارے میں کچھ نہیں کہتا مگر لکڑی پر کھدائی کے کام کو نظرِ تحسین سے دیکھتا ہے۔ وہ کشمیری شال بافی کی تعریف کرتا ہے وہ شالوں کی لمبائی ۱½ ایل (ELL) اور چوڑائی ½ ایل (ELL)[2] بتاتا ہے۔ شالوں پر کشیدہ کاری کے کام کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ برنیر اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ شال نہ صرف مغلوں بلکہ بیشتر ہندوستانیوں کے زیر استعمال رہتے ہیں۔ وہ یہاں کے شالوں کو اسپینی شالوں سے زیادہ مہین پاتا ہے۔ وہ خاص طور پر توس شال کی بے پناہ تعریف کرتا ہے۔

برنیر نے کشمیر کے قیام کے دوران بامقصد سیاحت کی ہے۔ وہ جگہ جگہ گھوما ہے۔ وہ یہاں کے قدرتی مقامات کو دیکھ کر ٹھٹھک سا جاتا ہے اور جب حسن کے اس لازوال خزانے کے بارے میں اظہار کرتا ہے جو اسے جگہ جگہ کھلا ہوا ملتا ہے تو اس کا لہجہ شاعرانہ آہنگ اختیار کرتا ہے[3]۔ طوالت کے خوف سے

---

[1] BERNIER : TRAVELS IN THE MOGUL EMPIRE, PAGE 401

کشمیر جہانگیر کی ایک بڑی کمزوری تھا۔ وہ اکثر اپنی عظیم سلطنت کی مصروفیات بھول کر کشمیر کی عطر بیز ہواؤں میں پناہ لیتا تھا۔ اس کا انتقال بھی کشمیر سے واپس لوٹتے ہوئے راجوری کے قریب چھانکس سرائے میں ہوا تھا۔

[2] لمبائی کا ایک ناپ جو بازو کی لمبائی سے لیا گیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گز۔

[3] کشمیر کے حسن لازوال کی حشر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ شاعر بنتا ہے۔ لیکن جب یہاں کے ذہن، یہاں کی ہنرمندی اور صناعی کا ذکر آتا ہے تو اس کی باریکیوں کو بیان کرتا ہے اور فن کاروں کو داد دیتا ہے جو اپنی روح کا درد اور آنکھوں کی بینائی ان شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

> "کشمیری اپنی ذکاوت کے لئے مشہور ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے لوگوں سے زیادہ ذہین سمجھے جاتے ہیں۔ شعروشاعری اور سائنسی علوم میں یہ ایرانیوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ بڑے ہوشیار اور محنتی لوگ ہیں۔ ان کی

صرف چند جگہوں کے بارے میں اس کے اظہار کا اعجاز پیش ہے جن کو دیکھ کر اس پر سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس اظہار میں اس کے جذبے اور احساس کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً اچھ بل کا ذکر یوں کرتا ہے:۔

> "یہاں سب سے خوبصورت وہ چشمہ ہے جس کا پانی ابھر کر تقریباً .. اکنال زمین میں پھیل جاتا ہے۔ یہ چشمہ دھرتی کا سینہ چیرتا ہوا اس قدر شور مچاتا ہوا باہر نکل آتا ہے جیسے کسی کنوئیں سے پھوٹا ہو۔ پانی کی بہتات اس قدر ہے کہ اسے چشمے سے دریا کہنا زیادہ بہتر ہو گا۔ اس کا پانی برفاب ہے۔ یہاں چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ ہیں۔ چشمے میں مچھلیاں ہی مچھلیاں ہیں۔ بیچ میں ایک شاندار آبشار گرتا ہے۔ راتوں کو دیواروں میں بند لاتعداد چراغ پانی کی سطح کے نیچے سے روشن کئے جاتے ہیں"۔ لہ

وہ ویری ناگ کا ذکر کرتا ہے جس کی تعمیر کا ڈیزائن اس کے مطابق نور محل نے بنایا تھا اور جسے جہانگیر کے حکم سے ۱۶۱۲ - ۱۶۱۹ء میں بنوایا گیا۔

برنیر کے مکاتیب میں بارہ مولہ کا ذکر بھی آیا ہے۔ جسے وہ "بارہ موے" کہتا ہے۔ اسکے پاس کی مسجد کا ذکر بھی کرتا ہے جہاں ایک درویش قلندر کا مزار ہے۔ اور لوگوں کا اس پر بے پناہ اعتقاد ہے۔ وہ اس

بقیہ حاشیہ صفہ نمبر :۔ کاریگری کا احساس ان پالکیوں، پلنگوں، قلمدانوں، چمچوں اور دوسری ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ یہ بڑی شاندار چیزیں ہیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جس چیز سے ان ملکوں کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور جس سے وہ مالامال ہوتے ہیں۔ وہ ایسے گراں قدر شال ہیں جو وہ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں"۔

(جلوۂ صد رنگ از ڈاکٹر برج پریمی ص ۲۵)

لہ F. BERNIER :- TRAVELS IN MOGUL EMPIRE

مزار کے احاطے میں اس پراسرار پتھر کا ذکر بھی کرتا ہے جسے عام طور سے ایک آدمی اٹھا نہیں سکتا۔ عام خیال ہے کہ اس بزرگ کا خیال دل میں رکھ کر گیارہ آدمی اس پتھر کو اپنی گیارہ انگلیوں کی پوروں سے اس طرح اٹھا سکتے ہیں جیسے گھاس کا تنکا اٹھا رہے ہوں[1] لیکن برنیر اس کو دھوکہ دہی پر محمول کرتا ہے۔ اس کا ردعمل ملاحظہ ہو:۔

> "میں نے اسے آخر کار مناسب سمجھا اور دونوں انگلیوں اور انگوٹھے سے اس پتھر کو تھام لیا۔ بڑی مشکل سے ہم اسے اٹھانے میں کامیاب ہوئے۔ سب لوگ میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے ـــ میں اس خوف سے کہ کہیں مجھے سنگسار نہ کیا جائے، چلایا ـــ "کرامت" ـــ اور ایک روپیہ پھینکتے ہوئے ہجوم میں غائب ہو گیا"[2]

برنیر نے جھیلوں کی نشاندہی بھی کی ہے اور کئی جھیلوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اُسے سطحِ آب پر جنگلی ہنس اور دوسرے سرمائی پرندے بھی نظر آتے ہیں۔ مغل صوبے دار جاڑوں میں ان پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ ایک جھیل کے درمیان میں ایک مٹھ کا ذکر کرتا ہے جس کے بارے میں اس نے عام لوگوں کی زبان سے یہ سن لیا تھا کہ مٹھ سطحِ آب پر تیرتا ہے اور اس مٹھ میں رہنے والا سنت کبھی باہر نہیں آتا۔

---

[1] برنیر غالباً "کاہ کاہ پل" نام کے پتھر (گیارہواں والا پتھر) کا ذکر کرتا ہے جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ جب ۱۱ آدمی اس پتھر کے چاروں اطراف کھڑے ہو کر اپنی گیارہ انگلیوں کی پوروں سے دبائیں اور گیارہ بار "گیارہ گیارہ" کے اعداد دہرائیں تب پتھر اپنی جگہ سے ہل کر اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ پتھر حالیہ برسوں تک بجبہاڑہ کے ایک مندر میں موجود تھا۔ معلوم نہیں برنیر کو یہ پتھر بارہ مولہ میں کیسے ملا۔

[2] BERNIER :- TRAVELS IN MOGUL EMPIRE, PAGE 415

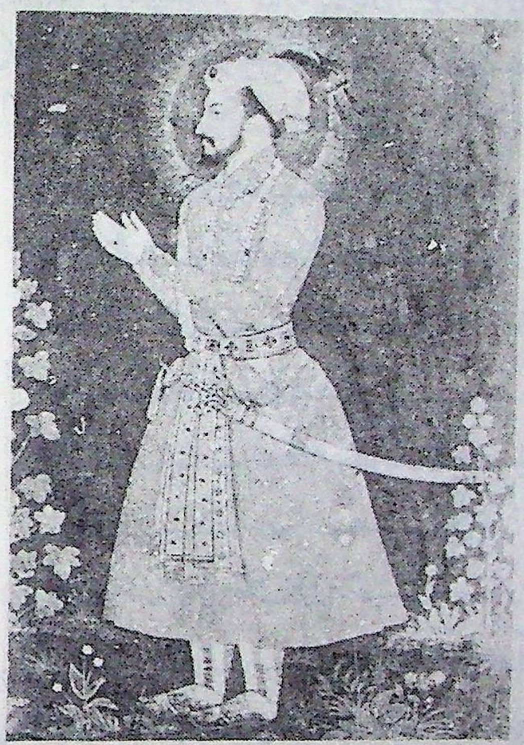

اورنگ زیب عالمگیر۔ ـــــ عہدِ شباب

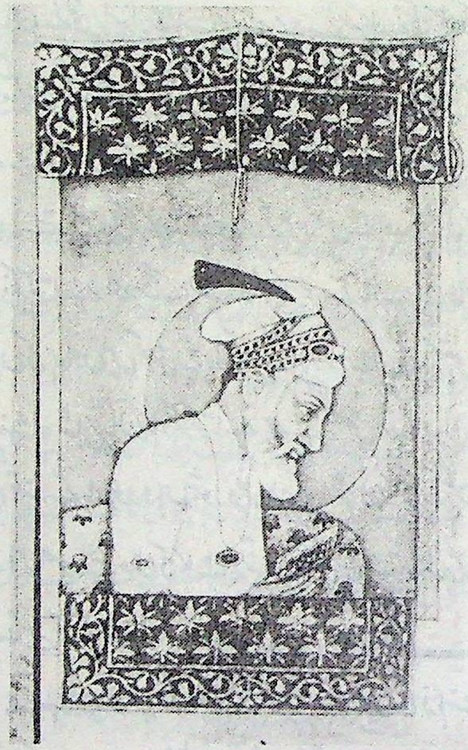

اورنگ زیب عالمگیر ـــــ عالمِ پیری

وہ بڈشاہ کی تعمیر کروائی ہوئی مسجد کا ذکر بھی کرتا ہے

برنیئر اپنے مکاتیب میں کئی اور پراسرار مقامات، جھیلوں، چشموں اور پہاڑوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کشمیریوں کے جودت ذہن کی تعریف بھی کرتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی ضعیف الاعتقادی کا تمسخر بھی اڑاتا ہے۔ اس نے کئی پراسرار مقامات پر سے پردے سرکانے کی سعی کی ہے۔ کہیں کہیں اس کا لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی بعض محیر العقل مقامات کے بارے میں وہ خاموش رہتا ہے۔ وہ اس چشمے کا ذکر کرتا ہے۔ جہاں پانی کے بلبلے زور سے اُبھرتے ہیں اور اپنے ساتھ ریت کے ذرات لے آتے ہیں۔ اور پھر اسی راستے نیچے اتر کر غائب ہو جاتے ہیں جس کے بعد پانی کی سطح بے حرکت ہو جاتی ہے۔ وہ گنگابل کی جھیل کا ذکر کرتا ہے اور سنگ سفید کا بھی کہ جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ لوگوں کا ہجوم بڑھ جانے سے وہاں کی ہواؤں میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور زوروں کی بارشیں آجاتی ہیں۔ اس مقام کے حوالے سے وہ شہنشاہ شاہجہان کا ذکر کرتا ہے جو اپنے بعض مصاحبوں کے ساتھ اس جگہ سیر کے لئے آیا تھا اور شہنشاہ کی تنبیہ کے باوجود وہاں شور و غل بلند ہوا تھا اور اتنی بارشیں ہوئی تھیں کہ پوری پارٹی بال بال بچ گئی تھی۔ اس صورت حال کی کاٹ برنیئر کے عقل و استدلال میں نہیں۔ وہ یہاں خاموشی سے کوئی رائے دئیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔

برنیئر نے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کئی جگہوں پر کشمیریوں کی ذہانت کا اعتراف کیا ہے لیکن وہ ان کی تلاش و تحقیق کی صلاحیت سے مطمئن نظر نہیں آتا۔ وہ اس بات پر اظہار تاسف کرتا ہے کہ وہ اپنے مکتوب الیہ کو پوری معلومات فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ ــــ

> اس موضوع نے میرے خیالات کو میری آمد کے وقت سے ہی محصور کر لیا ہے۔ لیکن مجھے کوئی موافق اور ہم مزاج نہیں ملا۔ کسی ایسے شخص سے بھی ملاقات نہ ہوئی کہ جس کا ذہن مشاہدے اور تحقیق و تلاش کی صلاحیت سے بھرپور ہو۔

جسے ان معاملات کی واقفیت ہو کہ جن کے بارے
میں مجھے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع فراہم ہوتا"[لہ]

برنیر کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ جو شخص کشمیر کے تمام اہم مقامات کی سیر کر چکا ہو، مختلف النوع لوگوں سے مل چکا ہو۔ یہاں ایسے عالموں اور فاضلوں اور شاعروں کو پا چکا ہو جن کا کلام فارسی زبان کے بڑے بڑے شعراء سے کسی درجہ بھی کمتر نہ ہو اسے کشمیر کی سیاحت کے دوران کوئی ایسا عالم اور مورخ کیوں مل نہ سکا کہ جو اس کے شکوک رفع کرتا۔

برنیر یہاں کے لوگوں کے حسن و صورت کا بھی قائل ہے۔ وہ خاص طور پر نسوانی حسن کی تعریف کرتا ہے۔ وہ مغل امرا کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ کشمیر آکر رشتۂ ازدواج بھی قائم کرتے تھے تاکہ ان کی اولاد خاص مغل نسل جیسی معلوم ہو۔

فرانسس برنیر کے مکاتیب میں ایک جگہ اس کے مکتوب الیہ کے پانچ سوال درج ہیں۔ یہ سوال سفرناموں کے ایک فرانسیسی ناشر موسیو تھیوی ناٹ نے اپنے ایک دوست کی معرفت سے برنیر سے پوچھے تھے۔ ان مختلف النوع سوالات میں سے ایک سوال کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اس کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ سوال یوں ہے:-

> کیا یہ صحیح ہے کہ یہودی عرصۂ دراز تک سلطنت
> کشمیر میں رہے ہیں؟ کیا ان کے پاس مقدس الہامی
> کتابیں ہیں اور اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا
> ان کے اور ہمارے عہد نامہ قدیم (OLD TESTA-
> -MENT) میں کوئی اختلاف ہے۔؟

برنیر اس خیال کو ہی رد کر دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے مشاہدات کی بنیاد پر یہودیت

[لہ] BERNIER: TRAVELS IN MOGUL EMPIRE PAGE 414

کے کئی آثار کا ذکر کرتا ہے، ملاحظہ ہو:۔

(ا) پیر پنچال کو عبور کرنے کے بعد سرحدی دیہاتیوں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ یہودیوں سے مشابہ ہیں۔ ان کی شبیہ اور طور و طریقے ایسے تھے جو ایک قوم اور دوسری قوم میں خط فاصل ڈالتے ہیں۔

(ب) دوسرا ثبوت موسیٰ علیہ السلام کا نام ہے جو عام طور پر استعمال میں ہے۔ اگرچہ لوگ مسلمان ہیں۔

(ج) یہاں ایک پرانی روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے پانی کے لیے بارہمولہ کے قریب پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ نکالا۔

(د) عام خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کشمیر میں وارد ہوئے تھے ان کا روضہ ایک لیگ کے فاصلے پر شہر میں ہے۔

(ر) ایک چھوٹی قدیم عمارت ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جسے حضرت سلیمانؑ نے بنوایا تھا۔ اس لئے آج تک یہ پہاڑی تخت سلیمان کہلاتی ہے[1]

اس سوال کے بیشتر حصوں کے امکانات پر برنیر ابتدا میں ہی غور کر چکا ہے اور خود ہی اس تصوّر کو رد کرتا ہے، جب وہ کہتا ہے:۔

- ہو سکتا ہے کہ کچھ یہودی یہاں رہے ہوں لیکن یہاں کی آبادی مسلمانوں اور غیر مسلموں پر مشتمل ہے[2]

---

[1] FRANCOIS BERNIER : TRAVELS IN THE MOGUL EMPIRE, P. 431

[2] IBID - PAGE 439.

> ۰ ۔ مجھے شبہ ہے کہ کیا کوئی اس بات کو ثابت کر سکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ
> نے اپنے قدموں سے اس سرزمین کو کبھی فیض یاب کیا ہو ۰

بہرحال برنیر کا یہ سفرنامہ خاصا دلچسپ ہے اور کشمیر کی تاریخ، یہاں کے جغرافیہ، یہاں کے باشندوں، ان کے رہن سہن، ان کے آدابِ زندگی، یہاں کی صناعی اور کاریگری کے کئی دلچسپ رُخ بے نقاب کرتا ہے۔

برنیر کوئی مورخ نہیں تھا۔ وہ ایک معالج تھا۔ لیکن اس کی آنکھ ایک نہایت ہی باریک بین مورخ اور محقق کی آنکھ تھی۔ اس کے سینے میں ایک شاعر کا دل دھڑکتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ شاہی مصاحبت میں اس کے شب و روز ذہنی عیاشیوں کی نذر نہیں ہوئے بلکہ اپنی بساط کے مطابق اور اپنے معیار کے حوالے سے پورے خلوص کے ساتھ اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو پوری تفہیم اور جزئیات کے ساتھ کاغذ پر اتارا اور ایک کارنامہ انجام دیا۔ برنیر کے یہ مکاتیب اس کے جذباتی ردعمل تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے ان مکاتیب میں اپنے مشاہدات کا رس نچوڑ لیا ہے اور بڑی جگر کاری سے ایک ایسا باب لکھا ہے جس سے ہمارے ذہن کے دریچوں میں ایک لمحے کے لئے ہی سہی، روشنی کی ایک نئی کرن دستک دیتی ہے۔ حیرت ہے کہ قلیل عرصے میں اس سمندر پار رہنے والے پردیسی نے اس قدر مواد کیسے سمیٹا اور صرف سمیٹا ہی نہیں اسے اپنے معیار اور نقطۂ نظر کے مطابق پرکھا اور آنے والی نسلوں کے لئے کاغذ پر محفوظ کر لیا۔ اگرچہ تفصیل میں جانے کا یہاں محل نہیں پھر بھی کشمیر کی تاریخ کے اس دلچسپ باب کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ان نادر خطوط کو صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ے F.BERNER : TRAVELS IN THE MUGHUL EMPIRE
PAGE 399

مغل فنِ تعمیر ۔ چند آثار

کشمیری انسائیکلوپیڈیا سے

• ۔ اس نمبر میں مغل فنِ تعمیر پر کوئی مضمون موصول نہیں ہوا۔ کشمیر کے فنِ تعمیر پر مغلوں کے اثرات واضح اور نمایاں رہے ہیں۔ اسلئے کشمیری انسائیکلوپیڈیا سے چند ایسے نوشتوں کا انتخاب کیا گیا جن میں مغل آثار اور فنِ تعمیر کا ذکر موجود ہے۔ اس سے مغل فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ •

• ——— اِدارہ

اچھ وَل :۔ اننت ناگ سے جنوب مشرق میں نو کلو میٹر کے فاصلے پر اچھ ول (جسے غیر کشمیری اچھابل بھی کہتے ہیں) نام کا چشمہ ایک قدیم تیرتھ ہے۔ اچھ ول شاید اپنے آباد کار راجہ اکھش کے نام پر مشہور ہوا ہے لیکن نیل مت پوران میں اچھ ول چشمہ کا ذکر اکھشپال ناگ کے طور پر ہوا ہے۔ سنسکرت مرکب اکھشپال کی موجودہ صورت اچھاول بنتی ہے۔ اس جگہ پر راجا اکھش نے تعمیرات بنائے تھے۔

پرانے برنگ پرگنہ میں ۳۳-۴۱° طول بلد اور ۷۵-۱۷° عرض بلد کے درمیان واقع اچھ ول کو اس وقت دوبارہ اہمیت حاصل ہوئی جب ملکہ نور جہاں نے ۱۶۲۰ء میں چشمہ کے سامنے باغ تعمیر

کروایا اور اس کا نام بیگم آباد رکھا۔ اس کے علاوہ اسے صاحب آباد بھی کہتے تھے۔ اب یہ دونوں نام لوگوں کے ذہن سے اُتر گئے ہیں اور اب صرف اچھّ ول رہ گیا ہے۔

اچھّ ول کے چشمہ کا ذکر ابوالفضل نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اچھّ ول چشمہ کا پانی پینے سے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ اچھّ ول کا ذکر برنیر (۱۶۶۳ء) نے بھی کیا ہے۔ وہ یہاں کے آبشاروں کی بہت تعریف کرتا ہے خاص طور پر چشمہ پھوٹنے کا جو زمین سے اُچھل پڑتا ہے۔ اچھّ ول باغ کے تین طبقے ہیں۔ اس وقت اس کا تیسرا طبقہ بہت چھوٹا ہے کیونکہ اس کا بہت سا حصہ سڑک کی زد میں آگیا ہے۔ لیکن کچھ حصے کٹنے کے بعد بھی باغ کے قدرتی حسن میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اچھّ ول موجودہ دور کے باغوں میں سب پر فوقیت رکھتا ہے جو مختصر ہونے کے باوصف اور پُر رونق بھی ہے اور پُر بہار بھی لیکن موجودہ باغ مغل دور کے باغ کے برعکس بہت چھوٹا ہے۔

مغلوں کے زمانے میں اس باغ میں سیب، آڑو، شفتالو، خوبانی اور گلاس کے درخت ہوتے تھے۔ جوئباروں کے ساتھ ساتھ پھولوں کے تختے اور سبزہ زار اور پھر روشیں مغلوں کے ذوق جمال کا پتہ دیتی ہیں۔

چشمہ پر مغل دور کی بارہ دری کب کی منہدم ہو چکی ہے۔ اب صرف اس کی ڈیوڑھی اور محراب باقی ہیں۔ پہلے طبقے میں تالاب کے دونوں کناروں پر قرار گاہیں ہیں جن پر چنار سایہ کئے ہوئے ہیں۔ باغ میں جو تعمیرات مغلوں کے بعد بنائی گئیں وہ اکثر پُرانی بنیادوں پر اُٹھائی گئی ہیں۔ تعمیرات کی پنجرہ کاری بھی قابل دید ہے لیکن مغلوں کی تعمیرات سے آنکھیں نہیں ملا سکتی۔ باغ میں آبشار کے نیچے تالاب کے درمیان بنی ہوئی بارہ دری چاندنی رات میں قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے پر اُکساتی ہے۔ اس کا حسن وہی محسوس کر سکتا ہے جو یہاں چند لمحات گزار سکے۔

اچھّ ول باغ ۴۶۷ فٹ لمبا اور ۲۴۵ فٹ چوڑا ہے۔ اردگرد پتھّر کی دیواریں ہیں۔ باغ تین طبقوں میں منقسم ہے۔ مغل دور کے چناروں کے علاوہ ایک پُرانے حمام کے کھنڈر ابھی باقی ہیں۔ چشمہ کا پانی تین نہروں میں بہتا ہے۔ ان میں بیچ کی نہر ۱۶½ فٹ چوڑی ہے۔ یہ دو تالابوں

سے ہو کر گزرتی ہے جن میں سے ایک ۱۸۸ فٹ لمبا اور ۷۴ فٹ چوڑا ہے۔ اسی تالاب کے بیچ میں ۱۸ فٹ چوکور بارہ دری بنی ہوئی ہے جس میں خوبصورت پنجرہ کاری کی ہوئی ہے۔ باغ کے بالائی طبقے میں تین آبشار گرتے ہیں جن میں سے درمیان کا آبشار ۱۲ فٹ اونچا اور ۸ فٹ چوڑا ہے باغ سے نکلتے وقت نہریں تین آبشاروں کی صورت میں گرتی ہیں۔ اسی جگہ درمیانی آبشار زیادہ اونچا اور چوڑا ہے، یہاں آبشار کی اونچائی ۸ فٹ اور چوڑائی ۶ فٹ ہے۔ باغ میں موجود تالابوں اور نہروں کا فرش پتھروں کا بنا ہوا ہے اور ان میں فوارے لگے ہیں۔ صرف تالابوں میں نوّے ۹۰ فوارے چھوٹتے ہیں۔ باغ کا دوسرا طبقہ باقی طبقوں سے بڑا ہے۔ ڈوگرہ دور کے ابتدائی ایام میں اچھ ول باغ کی دیوار خستہ ہو چکی تھی جس کی وجہ سے گلاب سنگھ کو یہ دیوار (۱۸۴۶ء - ۱۸۵۶ء میں) نئے سرے سے تعمیر کرنا پڑی۔

عوامی حکومت بننے کے بعد پہلے طبقہ کے کونے پر ایک ڈاک بنگلہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ باغ کا کچھ حصہ اسلام آباد کتھار سڑک کی زد میں آ گیا۔ کافی تبدیلیوں کے باوجود اچھ ول باغ کی مغل ساخت ابھی قائم ہے اور یہ مغلوں کے ذوقِ جمال کا احساس دلاتا ہے ______ ٥

(اصل : موتی لال ساقی ۔۔ ٥

مترجم : مشعل سلطانپوری) ۔۔ ٥

باغ ارادت خان :- باغ ارادت خان مغل گورنر ارادت خان (۲۲، ۱۶۱۹ء) نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ باغ نادپورہ (سرینگر) کے قریب مشرق میں اس جگہ واقع تھا جسے نوتی بٹ کا دِہر کہا جاتا ہے۔ اس باغ کی خاص بات وہ خوبصورت بارہ دریاں رہی ہیں جن پر بہت ہی باریک اور آنکھوں کو لبھانے والی پنجرہ کاری موجود تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان شاندار عمارتوں میں ایسی ہنر مندی سے پنجرہ کاری کی گئی تھی جس کی دوسری مثال کشمیر میں نظر نہیں آتی۔ روایت ہے کہ ارادت خان نے ان عمارتوں کے معمار فنکار کو دولت سے مالا مال کیا مگر

ساتھ ہی دائیں ہاتھ کا انگوٹھا قلم کروا دیا تاکہ یہ کاریگر کسی دوسری عمارت میں ایسی ہی پنجرہ کاری کا کمال ظاہر نہ کر سکے۔ ارادت خان کے باغ یا اس باغ کی کسی عمارت کے آثار اب نظر نہیں آتے۔ قیاس غالب ہے کہ باغ میں تعمیر ہوئی عمارتوں کا طرزِ تعمیر ویسا ہی تھا جیسا نشاط باغ اور اس عہد کی دوسری تعمیرات کا ہے۔ مگر یہ عمارتیں خالص لکڑی کی تھیں جس کے باعث آثار معدوم ہو چکے ہیں۔

•—(اصل : موتی لال ساقی

ترجمہ : برج پریمی)—•

باغِ داراشکوہ :- داراشکوہ کے باغ کے آثار اب بھی سرینگر سے ۴۸ کلومیٹر دور بجبہاڑہ میں موجود ہیں۔ یہ باغ شہزادہ داراشکوہ (۵۸-۱۶۳۲ء) نے تعمیر کرایا تھا۔

اس وقت باغ کی نمایاں نشانی چنار کا وہ بھاری بھرکم درخت ہے جس کا گھیرا ۵۴ فُٹ ہے۔

اگلے وقتوں میں یہ باغ وتستا کے آرپار دونوں کناروں پر پھیلا ہُوا تھا۔ باغ کے دو حصّوں کو ملانے کیلئے وتستا پر پتھروں کا ایک پُل بنایا گیا تھا۔ باغ میں بہت سے تالاب تھے جو آپس میں پلیوں سے ملا دئے گئے تھے۔ داراشکوہ نے یہ باغ آگرہ کے اُسی طرز پر بنوایا تھا جس کے مطابق شاہجہاں نے تاج محل تعمیر کر کے دریا کے آرپار باغ بنانے کا منصوبہ بنایا تھا اور جسے وہ زندگی کے آخری ایام میں نجی تنازعات کے باعث عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ باغِ داراشکوہ جسے وزیر باغ بھی کہتے ہیں، پہاڑی علاقوں کے مقابلے میں میدانی علاقوں کے باغات کے طرز پر بنایا گیا تھا۔

باغ میں اینٹوں سے بنا ہُوا ایک محل خانہ بھی تھا۔ پتّھر کے پُل اور اینٹوں کے محل خانے کے آثار اس صدی کی تیسری دہائی تک محفوظ تھے۔ لیکن اب یہاں مغل آثار کی صورت میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ناگزیر ہے کہ آج سے سو سال قبل یہاں پُل کے قریب ایک ہموار پتھر تھا جس پر ایک فارسی کتبہ تھا۔ کتبے پر درج عبارت کا مفہوم کچھ اس طرح تھا "خدا کے فضل سے یہ حویلی شاہجہاں بادشاہ غازی کے دور میں داراشکوہ نے سمرقند کے داروغہ محمد زاہد ابوالحسن

کی نگرانی میں ۲۲ رمضان (۱۰۶۰ھ) مطابق ۱۶۵۰ء میں مکمل کی۔

(اصل موتی لال ساقی ۔۔ ۰

ترجمہ:۔ غلام نبی ناظر)۔۔ ۰

بحرار :۔ بحرار یعنی بحر آرا ڈل جھیل کے مغرب میں "سدرکھون" کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ گذشتہ زمانے میں ایک شاندار باغ تھا جو جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) کی ملکہ نور جہاں نے بنوایا تھا۔ سندھ سے نکالی گئی شاہی کوہل کی ایک شاخ اس باغ کو سیراب کرتی تھی۔ نشاط اور شالیمار کی طرح بحرار باغ کی طبقہ بندی کی گئی تھی اور ہر ایک طبقہ پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اونچے حصّے میں نور جہاں نے سات منزلہ عمارت تعمیر کروائی تھی جہاں سے وہ شہنشاہ کے ساتھ چاندنی راتوں میں ڈل کا نظارہ دیکھتی تھی۔ باغ کا مادۂ تاریخ ہے۔ "کاخِ بحر آرا" جس سے تعمیر کا سن ۱۶۲۳ء بنتا ہے۔ باغ سے متعلق قطعۂ تاریخ اس طرح ہے:

چوں بہ کشمیر باغِ بحر آرا
گلشنے تازہ گشت شہر آرا
ہفت منزل نشیمنِ شاہی
بر جبینش شُد است دہر آرا
بہر تاریخ این نشیمنِ خاص
ہاتفی گفت "کاخ بحر آرا"

یہ دلکش اور نہایت خوبصورت باغ انیسویں صدی کے اختتام سے اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور اب اس میں "لیپروسی ہسپتال" قائم ہے۔ "کاخِ بحر آرا" نام سے جو عمارت یہاں نور جہاں نے تعمیر کی تھی اس کے آثار بھی اب نظر نہیں آتے۔

(اصل :۔ موتی لال ساقی ۔۔ ۰

ترجمہ :۔ ارجن دیو مجبور)۔۔ ۰

پتھر مسجد/شاہی مسجد :- پتھر مسجد (شاہی مسجد) سرینگر میں خانقاہِ معلیٰ کی سیدھ میں ولستا کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہ مسجد مغل بادشاہ جہانگیر کے دور میں ملکہ نورجہاں کے کہنے پر ۱۶۲۳ء میں تعمیر کی گئی ہے جو کشمیر میں مغل فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس کا ذکر پتھر مسجد، مسجد سنگین اور نئی مسجد (نو مسجد) اور شاہی مسجد نام سے بھی ہُوا ہے۔

"تاریخ شیعان کشمیر" کے مطابق ملکہ نورجہاں نے یہ مسجد شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کیلئے تعمیر کرائی تھی اور کچھ عرصہ بعد نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند کرائی گئی لیکن حکیم صفدر کی اس رائے سے دیگر مورخ متفق نہیں ہیں۔ کئی جگہوں پر اسکے غیر آباد ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ یہ مسجد ایک عورت کے کہنے پر بنائی گئی تھی اسلئے اسمیں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جب ملکہ نورجہاں سے پوچھا گیا کہ مسجد تعمیر کرنے میں کتنی رقم صرف ہوئی تو اُس نے اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرکے ایسا تلخ جواب دیا کہ لوگ برانگیختہ ہوئے اور اس میں نماز پڑھنے سے گریز کیا۔ اس طرح سے پتھر مسجد بہت عرصہ تک غیر آباد رہی۔

فاضل خان کے وقت (۱۶۹۷ء — ۱۷۰۴ء) میں اس مسجد کی تجدید کی گئی اور اس کے ساتھ ایک حمام اور درسگاہ بھی تعمیر کیا گیا۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں مسجد غیر آباد نہیں تھی۔

۱۷۵۴ء کے قحط میں کشمیر کے گورنر سُکھ جیون نے مسجد میں شالی جمع کی اور اسطرح بہت عرصہ تک اسے بطور گودام کے استعمال میں لایا گیا۔

میر ہزار خان کے وقت میں ۱۷۹۳ء میں اس مسجد کی دوبارہ تجدید کی گئی۔ اس کا مادۂ تاریخ ذیل کے اشعار سے نکلتا ہے ؎

شکر حق کز دعای اہل یقین　　باز آباد گشت خانہ دین
کرد سردار خطہ میر ہزار　　مسجدِ نو بنا بصد تزئین

اختر و نقش او فروزان باد — تا بود بر فلک مہ و پروین
این چنین مسجد از بلندئ قدر — آسمانی بُود بروئے زمین
عاقبت روسیاہ و ملعون شُد — ہر کہ او غلہ می نہد د دریں
خبر از ہاتفی بپُرسیدم — تا کند سال آں مرا تلقین
ہاتفی گفت "عہدِ میر ہزار" — نو شُد آباد مسجدِ سنگین

۱۲۰۸ھ — ۱۷۹۳ء

یہ اشعار اُس کتبے پر کندہ کئے گئے ہیں جو مسجد کے صدر دروازے کی دہلیز کے اوپر نصب کیا گیا ہے۔ مورخ حسن نے تیسرا اور چوتھا شعر درج نہیں کیا ہے۔ اس طرح سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مسجد نئے سرے سے آباد کی گئی ہے۔ اس کے بعد کب سے اس میں نماز پڑھنے سے روکا گیا، اُس بات کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ یہ بات مُسلّمہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں یہ مسجد لوگوں کے مطالبے پر مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں کھول دی گئی۔

پتھر مسجد ۱۸۰ فٹ لمبی اور ۵۴ فٹ چوڑی ہے۔ مسجد کی بُنیاد تراشے ہوئے دیوری پتھروں کی بنی ہے۔ پتھر کے بنے سردل پر کنول کی پتیوں کی شکل میں ڈوریاں اُبھاری گئی ہیں۔ سردل کے اُوپر مسجد کے سامنے کی طرف صدر دروازے کے دائیں بائیں چار چار محرابیں ہیں جو کھڑکیوں کا کام دیتی ہیں۔ انہی محرابوں کے عین سامنے قبلے کی سمت میں بھی نو محرابیں ہیں۔ ان میں سے دروازے کے سامنے کی مرکزی محراب سب سے بڑی ہے۔ محراب کے دائیں بائیں جو چار چار محرابیں ہیں اُن پر محرابی طرز کے روشندان ہیں۔ مسجد کی پوری لمبائی تین حصّوں میں منقسم کی گئی ہے اور یہ کام آٹھ آٹھ ستونوں کی دُو قطاروں سے لیا گیا ہے۔ ہر ستون بارہ کونوں کا ہے۔ مسجد کی چھت چار دیواری کے علاوہ انہی سولہ ستونوں پر کھڑی ہے۔ جب کہ PERCY BROWN اٹھارہ ستونوں کا حوالہ دیتا ہے۔ ہر ستوُن نیچے

پتھروں سے اور اوپر اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ اینٹوں والے حصّے پر چُونے سُرخی کا پلستر کیا گیا ہے۔ مسجد کی چار دیواری پر بھی چُونے سرخی کا ہی پلستر کیا ہوا ہے۔ ستون اُوپر کی طرف ایک دوسرے سے اس طرح ملا دئے گئے ہیں کہ چار دیواری سمیت ہر چار ستونوں کے بیچ میں ایک گنبد بنتا ہے۔ اس طرح سے چھت میں ۲۷ گنبد ہیں جو کھلے ہوئے کنول کی شکل کے ہیں۔ محراب کی سیدھ میں بڑا گنبد کرنیل مہان سنگھ نے ۱۸۲۴ء میں مسمار کرایا۔ مرمّت کے بعد یہ گنبد باقی ۲۶ گنبدوں جیسا خوبصورت نہیں بن پایا ہے۔

گُنبدوں پر پیپر پاشی کی گئی تھی۔ چھت ٹپکنے سے یہ نقاشی اتر گئی تھی۔ اس وقت ان پر بھی لپائی کی گئی ہے اور چھت کے اوپر بھی سیمنٹ کیا گیا ہے۔ چھت کے دامن کے ذرا نیچے مسجد کے اردگرد دیوری پتھروں کا چھجا سا ہے اور چھت کے دامن میں چاروں اطراف گوپے اُبھارے گئے ہیں جن کے اردگرد کنول کی پتیوں کی نقاشی کی گئی ہے۔ ایسی نقاشی مسجد کے سامنے والی دیوار پر بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ قبلہ کی سمت (برلب سڑک) جو دوکانیں بنی ہیں اُن میں آگ لگنے کے باعث اس طرف کے پتھر (آگ کی گرمی کے باعث) ناہموار ہو گئے ہیں۔

پتھر مسجد کے صحن میں دیوری پتھر اس طرح بچھائے گئے تھے کہ سارا صحن ایک ہی پتھر جیسا نظر آتا تھا۔ صحن کا فرش بھی مہان سنگھ نے ہی اُڑوا لیا ہے اور وہاں سے نکالے گئے پتھر اُسی کی نگرانی میں بسنت باغ اور شیر گڑھی کے گھاٹوں میں لگائے گئے۔

کُچھ ہی عرصہ پہلے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے مسجد کی کئی جگہوں پر مرمت کی ہے اور محفوظ رکھنے کی خاطر اس کی دوا پاشی بھی کی ہے۔

۰ــــ (اصل: محمد احسن احسن

ترجمہ: غلام نبی ناظر)

پری محل :- پری محل ڈل جھیل کے جنوب مشرق میں اوبرائے پیلیس ہوٹل اور چشمہ شاہی کے بیچ میں زبروَن پہاڑ کی گود میں واقع ہے ۔ ہیون سانگ کے بیان کے مطابق اس جگہ یا اس کے آس پاس ایک بڑا بودھ وہار اور ستوپ رہا ہے جس میں بھگوان بدھ کا دانت رکھا تھا، مگر اب یہاں پر کوئی پُرانے آثار نظر نہیں آتے ۔

پری محل دارا شکوہ نے شاہجہاں (۱۲۲۷ء ـ ۵۸) کے عہد میں اپنے اُستاد اخوند مُلا شاہ کیلئے علم نجوم کی ایک رسدگاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ چنانچہ وہ یہاں سے تاروں کی گردش کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔

پہاڑی ڈھلوان پر ذرا باہر کو نکلے ہوئے قطعۂ کوہ پر کھڑے پری محل کی طرزِ تعمیر پر یونانی مندروں کے اثر کا گمان ہوتا ہے ۔

پری محل کی خاص عمارت کے دائیں بائیں بالا دریاں ہیں اور مرکزی عمارت کے اوپر لگتا ہے شاید ماضی میں کوئی گنبد رہا ہوگا ۔ باغ کے کُل پانچ طبقے ہیں جن میں فوارے لگے ہیں۔ لیکن کسی ندی یا پن چادر کی چونکہ کوئی نشانی موجود نہیں ہے، اس لئے قیاس یہ ہے کہ فواروں کیلئے پانی کی فراہمی کا کوئی زیرِ زمین بندوبست رہا ہوگا ۔

۱۹۶۹ء ـ ۷۴ میں باغ کو نئے سرے سے ٹھیک ٹھاک کرنے کی خاطر یہاں ڈاکٹر کیلاش ناتھ کول کی نگرانی میں کُھدائی ہوئی جس کے دوران میں زمین کے نیچے سے پکی مٹی کے بنے تنبوشے برآمد ہوئے جن سے اس خیال کو تقویت ملی اور یہاں پانی کی فراہمی کا زیرِ زمین بندوبست تھا۔ مغل طرزِ تعمیر کے اس نمونے کی پرانی شان کو بحال کرنے کی دورِ حاضر میں کوشش ہوئی ہے اور اب یہاں ہر شام بجلی کا چراغاں ہوتا ہے اور گرمیوں میں باغ پھولوں سے لدا رہتا ہے ۔

عقب میں پہاڑی ڈھلوان اور سامنے ڈل جھیل کی موجودگی سے پری محل کا حُسن دوبالا رہتا ہے اور یہ بات دارا شکوہ کی زیباشناسی کی دلیل ہے ۔

پری محل کو کشمیری "کوہ پیٹن" نام سے بھی جانتے ہیں ۔ (اصل: موتی لال ساقی ، ترجمہ: رحمان راہی)

جروگہ شاہی :۔ جروگہ شاہی نام کا محل خانہ مغل شہنشاہ اکبر نے ہاری پربت کے دامن میں مشرق کی جانب ۱۵۹۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس محل خانے کے رتھ ڈل کے کناروں تک پھیلا ہوا ایک باغ بھی تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام "درشنی باغ" تھا۔ محل خانہ کی تعمیر کے نگران خواجہ حسن کابلی مقرر تھے۔ اس کی تعمیر میں سنگِ سیاہ کے علاوہ بلوّر بھی استعمال میں لایا گیا تھا۔ محل خانے کے ستونوں میں نقش و نگاری کے علاوہ لعل و جواہر بھی جڑے ہوئے تھے۔ باغ میں آبشار بھی تھے جن کے جنگلے سنگ مرمر کے تھے۔ محل خانہ کے تین اطراف سفیدوں کی قطاریں تھیں۔ باغ کا مادۂ تاریخ اس شعر سے نکلتا ہے ؎

شاہ گلگشت باغ نمودہ
۱۰۰۳ھ
"باغ" تاریخ باغ فرمودہ

جروگہ شاہی اور درشنی باغ دونوں کو امیر خان جوان شیر (۱۷۷۰ء) نے مسمار کر دیا۔ اُس نے ان کے ملبے سے "سوتہ لانک" اور "امیر آباد" کی حویلیاں تعمیر کرائیں۔ امیر آباد غالباً آج کی شیر گڈھی کے نزدیک واقع تھا۔

۔۔ (اصل : موتی لال ساقی
ترجمہ :۔ جان محمد آزاد) ۔۔

چشمہ شاہی : چشمہ شاہی زبروون پہاڑ کی گود میں جھیل ڈل کے کنارے پر کبوتر خانہ کی سیدھ میں دو کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ اس کے بالمقابل دارا شکوہ کا پری محل ہے۔ چشمہ شاہی باغ کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مغل باغات کی جاذبیت اور ان کا حسن محض انکی وُسعت پر مُنحصر نہیں ہے بلکہ اس کا دار و مدار بہت حد تک ان باغات کی ترتیب و تہذیب اور نفاست پر ہے۔ وہ چشمہ جو باغ کے اوپری طبقے میں پھوٹتا ہے ،

کنول کی شکل میں ایک بڑے پتھر سے پانی ابلتا ہے۔ چشمہ پر بارہ دریاں تعمیر ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے کا باغ آٹھ کنال اراضی پر پھیلا ہُوا ہے جس کے تین طبقے ہیں۔ اُوپر کے طبقے میں پتھر کا ایک صوفہ ہے جس کے بیچ میں تراشیدہ فوارہ بنایا گیا ہے۔ چشمے کا پانی تین فٹ بلند آبشار کی صورت میں دوسرے طبقے میں جا گرتا ہے۔ دوسرے طبقے کے مرکز میں ایک تالاب ہے جس میں فواروں کا پانی اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ اس کے بعد پانی باغ کے ایک گوشے میں بارہ دری سے جا نکلتا ہے۔

تیسرے طبقے کے درمیان میں بھی ایک تالاب ہے جس میں پانچ فوارے لگے ہوئے ہیں۔ باغ میں موجود بارہ دریاں واضح طور افغان دور کی یادگاریں ہیں تاہم یہ بارہ دریاں پُرانی بنیاد پر ہی کھڑی کی گئی ہیں۔ سب سے اُوپر کی بارہ دری کی محرابی کھڑکیوں میں سے ڈل کا نظارہ اور باغ کا زیرین حصہ نہایت دلاویز نظر آتا ہے۔ بارہ دریوں کی تعمیر میں جو سنگِ سیاہ لگے ہیں وہ بلاشُبہ مغل دور کی یادگاریں ہیں۔

باغ کا دُوسرا طبقہ لگ بھگ ۱۸ فٹ ہے جب کہ اس کا اُوپر کا طبقہ اس سے دوگنا ہے۔ اس طبقے کے عین بیچ میں ایک حوض ہے جس میں پانچ ہزار فوارے لگے تھے۔

چشمہ شاہی باغ کی لمبائی ۳۳۹ فٹ اور اس کی چوڑائی ۱۲۶ فٹ ہے۔ مغل گورنر علی مردان خان (۱۶۳۲ء) نے شاہجہاں کے عہد میں اسے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا مادۂ تاریخ یوں ہے:

گفتمش بہر چشمہ تاریخی
گفت بر گوی کوثر شاہی ۱۰۴۲ھ

سکھ گورنر شیخ غلام محی الدین نے ۱۸۴۲ء میں اس باغ کی تجدید کی جس کا پتہ مرزا مجرمؔ کے مادۂ تاریخ سے ملتا ہے:

سالِ تعمیر حال چشمۂ شاہی
گفت مجرم زروی آگاہی
۱۲۵۸ھ

رنبیر سنگھ کے وقت (۸۵ - ۱۸۵۷ء) میں وزیر پنّو نے نشاط باغ کی طرح چشمہ شاہی کی بھی مرمّت کی۔

شیخ محمد عبداللہ کی وزارت کے دوران (۸۲ - ۱۹۷۵ء) چشمہ شاہی کے باغ میں کافی وسُعت لائی گئی۔ باغ میں رنگین برقی قمقموں کا انتظام کیا گیا جس سے شام کے بعد یہاں کا مجموعی حسن نہایت سحر انگیز نظر آتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں چشمہ شاہی کے نزدیک سرکاری مہمان خانہ راج بھون کے نام سے تعمیر کرایا گیا۔ یہ بھون مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی بیوی تارا دیوی کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ راج بھون میں اب گرمیوں کے دوران ریاست کا گورنر قیام کرتا ہے۔

۰ــــ (اصل: موتی لال ساقی

ترجمہ: جان محمد آزاد) ــــ۰

چنگس سرائے :- چنگس سرائے راجوری سے ۴۲ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نوشہرہ سے چنگس تک مناوری توی کے دائیں کنارے پر اب بھی تین مغل سرایوں کے آثار موجود ہیں۔ ان میں مرادپور، نارین اور چنگس کے آثار شامل ہیں۔ مرادپور کی سرائے قلعے کے طرز کی ہے۔ نارین سرائے کے آثار اب بہت کم ملتے ہیں لیکن چنگس سرائے کی فصیل اب بھی قدرے بہتر حالت میں ہے تاہم اس کی نگہداشت کی طرف غفلت شعاری کی وجہ سے سرائے کی مجموعی حالت بگڑ چکی ہے۔ لیکن مشرق کی جانب اس کی محرابی پھاٹک اُس جاہ وجلال کی غمّازی کرتے ہیں جو مغل شہنشاہوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔

چنگس سرائے کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ کشمیر سے واپسی کے دوران مغل شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء) اسی سرائے میں فوت ہُوا تھا جہاں سے اُس کی لاش لے جاکر شاہدرہ (لاہور) میں دفن کی گئی۔ جہانگیر کی یادیں شگفتہ رکھتے کیلئے سرائے کے مغرب میں اب بھی ایک یادگار موجود ہے جہاں شہنشاہ کی انتڑیاں دفن ہیں۔

چنگس سرائے چوکور شکل کی ہے۔ اس کے شمال کی دیوار کے پاس مشرق اور مغرب کی طرف دو پھاٹک ہیں۔ مغربی دیوار کا جنوبی کنارے کے ساتھ ٹاور رہا ہے جو اب پوری طرح شکستہ ہو گیا ہے۔ سرائے میں قیام کا مناسب انتظام تھا۔ جنوبی دیوار کے ساتھ ایک مسجد رہی ہے۔ یہ سرائے بھی قلعے کی شکل میں تھی۔ لیکن اب پوری طرح شکستہ حالت میں پڑی ہے۔ سرائے کے جنوب میں راجوری توی بہتی ہے جسے آگے جاکر مناور توی کہا جاتا ہے۔ سرائے کے منہدم ہونے سے ایک اہم تاریخی مقام کے عنقا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سرائے کے آگے دریا کے کنارے کسی پرانے تعمیر کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔

اس وقت سرائے کی چار دیواری میں ایک پولیس تھانہ تعمیر کیا گیا ہے جس سے اس یادگار کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔

سرائے کی تعمیر میں پتھر، سرخی اور چونے کا استعمال کیا گیا ہے۔

۰— (اصل : موتی لال ساقی

ترجمہ : جان محمد آزاد) —۰

مسجد ملا آخون (پہ شاہ مشید) :۔ اسے مسجد ملا آخون شاہ یا مسجد داراشکوہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سرینگر میں قلعہ ہاری پربت کے جنوب میں دامنِ کوہ میں واقع ہے۔

مسجد کے اوپری حصے میں حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کا روضہ ہے۔ یہ مسجد ۰ھ۔ ۱۶۳۹ء میں مغل شہزادہ داراشکوہ نے اپنے استاد آخون ملا شاہ کے لئے بنوائی اور اس کے قریب ہی ایک حمام بھی تعمیر کروایا۔ مسجد کے آس پاس زائرین کے لئے دو الگ سرائیں بھی بنوائی گئیں۔ مسجد کی دیواریں پختہ اینٹوں کی بنی ہیں جن کے اوپر سنگِ بلور کی نقاشی کی گئی ہے اور اوپر چکنی سلیں ہیں۔ یہ سلیں اندر اور باہر چاروں طرف دیواروں کے ساتھ جوڑی گئی ہیں۔

مسجد کے جنوب میں ایک اور مشرق میں دوسرا دروازہ ہے۔ جنوب کی طرف سے اس کے باہر پانچ ڈوری دار محرابیں ہیں۔ کناروں کی چار محرابوں میں پتھروں کے بنے دو فٹ

مربع جالی دار پنجرے لگے ہیں اور محرابوں کے اوپر دس حصوں میں منقسم آخون مُلّا شاہ کے نام چند استقبالیہ اشعار کندہ ہیں۔

مسجد کے اندر مغرب کی طرف منبر ہے اور اس کی سیدھ میں اُوپر کی جانب سنگِ بلور کا بنا ہُوا کنول کی شکل کا کلش ہے۔ ایسا ہی ایک اور کلش ڈیوڑھی کے اوپری سرے پر بھی چڑھایا گیا ہے۔ اس کے تین اطراف غلام گردش ہے۔ غلام گردش کے ساتھ قبلے کی سمت تین محرابیں ہیں جن پر بیل بوٹے بنائے گئے ہیں، اس کے جنوب میں پانچ اور مشرق میں اندر کی جانب تین محرابیں ہیں، شمال میں چار چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں جن میں شاید اعتکاف کے لئے بیٹھنے والے رہتے تھے۔ مسجد کی بُنیاد میں ۲ فٹ لمبی مسطح سلیں لگائی گئی تھیں جو اب ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہیں۔ اس کے کونوں پر آرائشی (گولائی والے) ستون ہیں۔ غلام گردش کی چھت مٹی کی بنی ہے۔ یہ مسجد ہاری پربت کے ڈھلوان کو کاٹ کر بنائی گئی ہے کیونکہ مسجد کی بُنیاد کے مشرق میں پُختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی سرائے ہے جو ڈھلوان کے اردگرد بنائی گئی ہے۔

اس سرائے میں اوپر سے نیچے تک محراب دار غلام گردش ہے جس کی دیواروں پر نقاشی کی گئی ہے۔ آج کل یہ نقاشی مٹ گئی ہے اور سرائے کی دیواریں چاروں طرف خستہ ہو گئیں ہیں۔ مسجد سے قریب ۵۰۰ گز کی دُوری پر بڈشاہی اینٹوں کا بنا ایک حمام ہے جس میں آٹھ غسل خانے اور ایک چھوٹی مسجد ہے۔ مسجد کے عین بیچ میں دیوری پتھروں کا ۳۶ انچ کا گھیرا اور ۱۰ فٹ اونچا ایک آرائشی ستون ہے جس پر اوپر سے نیچے تک ڈوریاں اُبھاری گئی ہیں اور قبلے کی جانب محراب کے ساتھ پتھروں کا بنا ممبر ہے جو اب بالکل خستہ ہو چکا ہے۔ حمام کے غسل خانوں کی چھتیں مسطح نہیں بلکہ کمانی طرز کی ہیں۔ مسجد اور حمام کے درمیان آج بھی ایک پختہ تالاب کے آثار موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی قسم کا نہایت ہی خوبصورت تالاب تھا اور اس میں ایرانی طرز کے بنے رہٹ کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا تھا۔ یہ مسجد آج کل بے چراغ ہے۔

حمام اور مسجد کا مادۂ تاریخ ایک کتبہ پر کندہ ہے۔ اس مصرع سے تاریخ نکلتی ہے ع

یک جاے وضو آمد و یک جاے نماز

۱۰۴۹ ھ

۰۔ (اصل : بشیر اختر

ترجمہ : غلام نبی ناظر) ۔۔ ۰

ناگر نگر قلاے :۔ یہ فصیل شہرِ سرینگر میں ہاری پربت یا کوہِ ماران کی چوٹی کے گرداگرد واقع ہے ۔ احاطے میں ساڑھے تین میل لمبی اس فصیل کا ایک سرا مشرق کی جانب مزار بہاؤالدین سے شروع ہوکر سعیدہ کدل کے قریب پہنچتا ہے. جہاں سے اُس کا دوسرا سرا شمال کی جانب امداکدل کے قریب ختم ہوتا ہے ۔ امداکدل کے نزدیک شروع ہوکر اس کا اگلا سرا مغرب کی جانب حول اور بادام واری میں سے گذر کر پھر مزار بہاؤالدین تک آپہنچتا ہے ۔ یہ فصیل ۲۸ فُٹ اونچی اور ۱۳ فٹ چوڑی ہے ۔ ہر ۵۰ فٹ کے فاصلے پر اس میں ۳۴ فٹ اونچے (گول) بُرج یا سنگی ستون ہیں. فصیل میں ہر دو فٹ کے فاصلے پر ۴ انچ چوڑے سُراخ بنائے گئے ہیں ۔ جن میں سے دُشمن پر حملہ کرنے کیلئے بندوق کی نالیاں نکل سکیتں ۔ فصیل میں تین بڑے دروازے ہیں جن میں سے جنوب کی طرف کا کاٹھی دروازہ سب سے اونچا ہے ۔ اس دروازے کا محراب ۳۵ فٹ اونچا اور ۲۰ فٹ چوڑا ہے ۔ محراب میں چاروں سمت سنگِ دیوری کے طاق بنے ہیں ۔ جن پر نقش و نگار اُبھارے گئے ہیں ۔ دروازے کے اوپر کی طرف تین حصوں میں اکبر بادشاہ کے وقت کا لگایا ہُوا کتبہ ہے جس پر فصیل کی تعمیر کی تاریخ اور دیگر کوائف درج ہیں ۔ اس محراب کا اوپری حصہ حال ہی میں چُونائی پر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے ۔ فصیل کا دُوسرا دروازہ مغرب کی جانب ہے جو سنگین دروازہ کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ دروازہ کاٹھی دروازے سے چھوٹا ہے لیکن ساخت کے لحاظ سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے اندر اور باہر بلور کی تختیاں چڑھائی گئی ہیں اور دروازے کے دائیں بائیں طاق والے روشن دان ہیں ۔

کھڑکیوں پر نقش ونگار کیا ہوا ہے۔ شاید یہی دروازہ بادشاہ کے آنے جانے کے لئے اکثر استعمال ہوتا ہوگا۔ تینوں دروازوں کے پٹ غائب ہیں البتہ پتھر سے تراشے گئے چوکھٹے اب بھی موجود ہیں۔ فصیل کا تیسرا دروازہ جنوب مغرب کی جانب ہے جسے باچھی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ دروازہ سب سے چھوٹا ہے اور اس پر کوئی نقاشی نہیں ہے، اس دروازے کے دائیں بائیں ۲۵ گز کے فاصلے تک بڑے سوراخوں کی ایک اور قطار ہے۔ اس فصیل میں کہیں کہیں دو فٹ چوڑے اور ۶ فٹ اونچے محرابی دروازے سے ہیں جن میں سے ایک شخص اندر یا باہر آجا سکتا تھا۔ آج کل یہ دروازے کچھ چوڑے ہو گئے ہیں اور دیوار بھی ایک درجن سے زاید جگہوں پر کاٹی گئی ہے۔

فصیل کی تعمیر میں عام طور پر چونا اور سرخی استعمال میں لائی گئی ہے۔ اس کے بیچ میں کئی جگہوں پر دیودار لکڑی کی کڑیاں لگائی گئی ہیں جنہیں دیمک نے چاٹ لیا ہے۔

فصیل کی تعمیر کا حکم اکبر بادشاہ نے ۱۵۹۷ء میں اُس وقت دیا جب وہ تیسری مرتبہ کشمیر آیا۔ کچھ مورخوں کا کہنا ہے کہ کشمیر میں زبردست قحط پڑا تھا اور لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کیلئے بادشاہ نے اس فصیل کی تعمیر کا حکم دیا لیکن کچھ کا کہنا ہے کہ اس فصیل کی تعمیر سے قبل کشمیر میں مغل فوجوں کی کوئی مقررہ چھاونی نہیں تھی اور یہ مقامی لوگوں کے گھروں میں رہتے تھے۔ فوج اور رعایا کے درمیان رنجش کو دور کرنے کے لئے اکبر بادشاہ نے ہاری پربت کے ارد گرد ناگر نگر نام کی نئی بستی آباد کی اور اُسی کے گرد سنگی فصیل تعمیر کرائی۔ اس فصیل کی تعمیر ۱۵۹۷ء میں شروع ہوئی اور جہانگیر کے بقول اس پر ۱۶۲۰ء میں بھی کام چل رہا تھا۔ فصیل کے اندر کی نئی بستی میں فوج کے لئے بارکیں اور مغل سرداروں کیلئے کوٹھیاں تعمیر کرائی گئیں۔ بادشاہ کے کہنے کے مطابق ہاری پربت کے مشرق کی طرف باغ درشن یا جروگہ شاہی نام کا باغ ڈل کے کنارے تعمیر کرایا گیا۔ اس باغ کے چاروں طرف بلور کے تختے جڑے ہوئے تھے اور تین اطراف سایہ دار درخت تھے۔ یہ باغ ۱۶۲۰ء میں خراب ہوا تھا اور جہانگیر نے اسکی دوبارہ تجدید کرائی۔ اس باغ میں اکبر بادشاہ نے اپنے قیام کے لئے ایک چھوٹی بارہ دری بنوائی تھی اور جہانگیر نے اسکی دیواروں پر اُس وقت کے مشہور مصوّروں کے ہاتھوں تصویریں بنوائیں۔

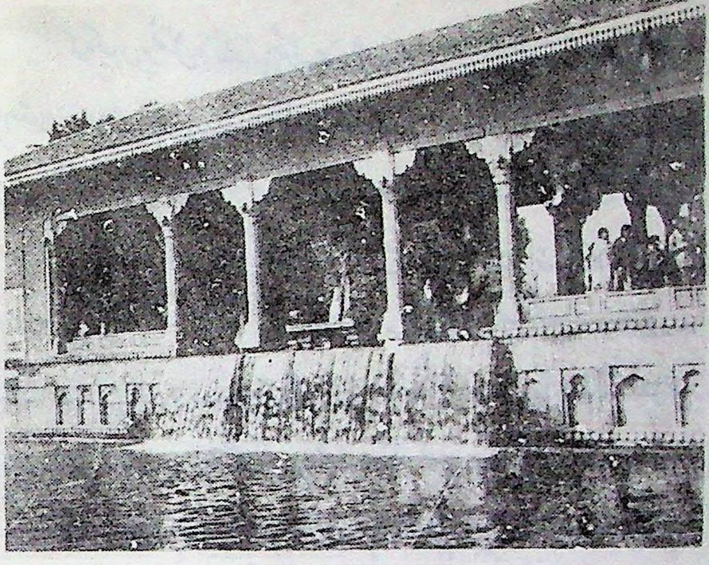

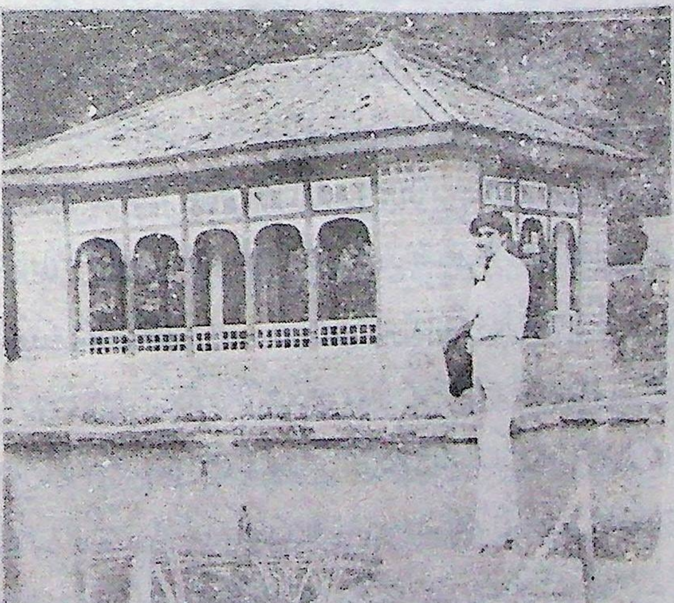

بارہ دری اچھہ بل

زمزمِ حیات ۔ چشمہ شاہی

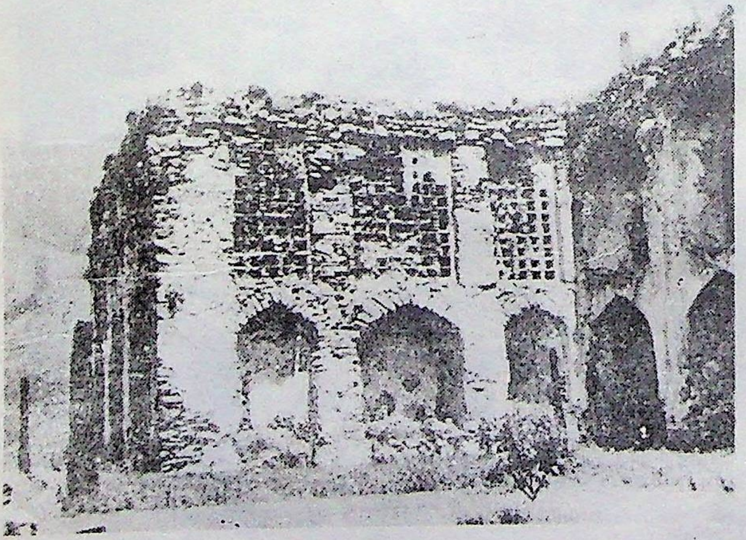

پری محل ـــ مغل طرز تعمیر کا ایک اور پہلو

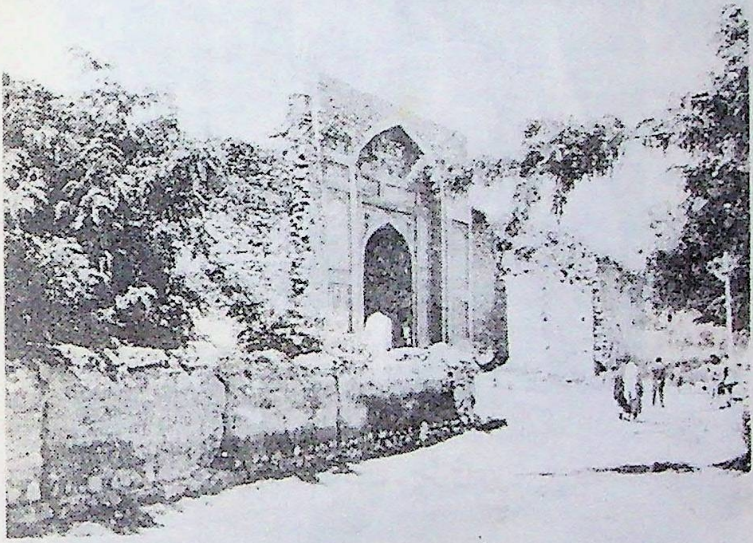

کاٹھی دروازہ (ناگر نگر)

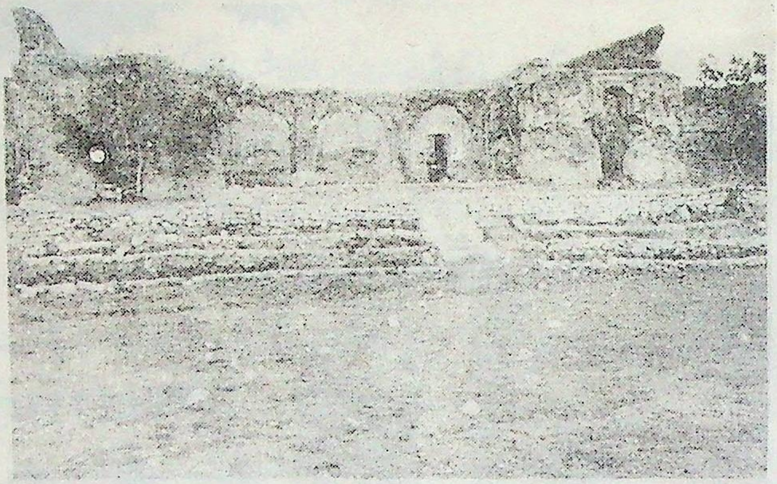

چنگس سرائے (نزدِ راجوری

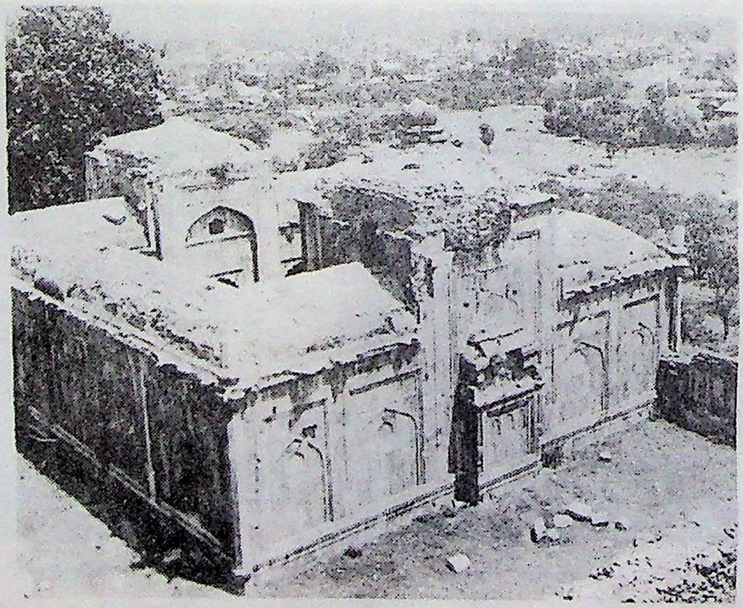

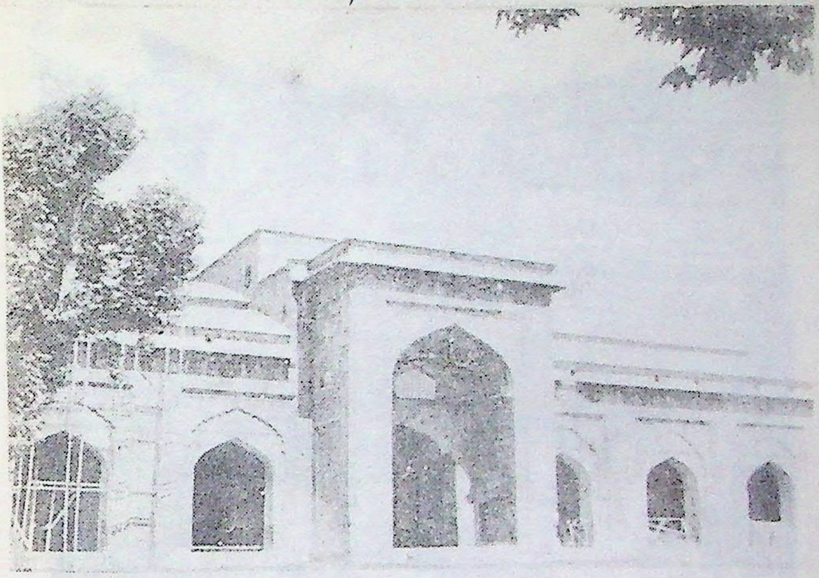

شاہی مسجد، سری نگر

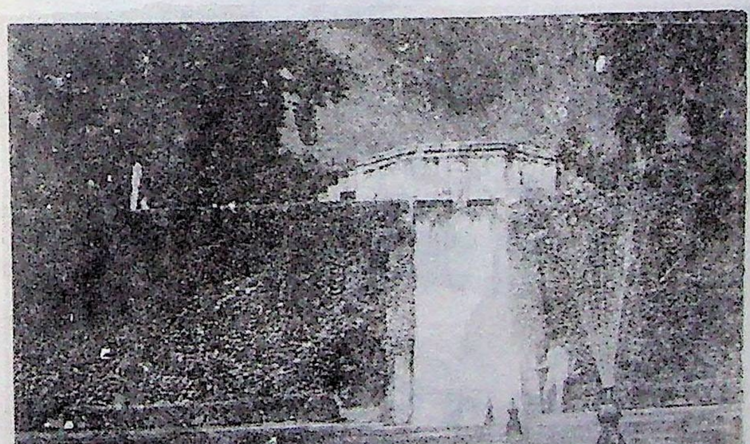

آبشار - نشاط باغ

اُس نے اس کا نام نُور افزا رکھا۔ یہ باغ پٹھان سردار امیر خان شیر نے مسمار کرایا اور اس کے پتھر اپنے محل خانے میں لگوائے۔ آج اس باغ کے چند آثار سنٹرل جیل کے جنوب کی طرف نظر آتے ہیں۔ ہاری پربت کے جنوب میں شہزادہ دارا شکوہ نے ۱۶۳۹ء میں اپنے لئے سنگِ بلّور کا ایک خوبصورت محل اور اپنے اُستاد آخوند مُلّا کے لئے ایک حمام اور مسجد بنوائے۔ ان دونوں عمارات کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ دارا محل کے اوپر کی جانب حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کا جدید طرز پر تعمیر شدہ روضہ ہے۔ ہاری پربت کے مغرب میں چکریشور کا مندر ہے۔ یہ مندر بھی نئے سرے سے تعمیر کرایا گیا ہے۔ ہاری پربت کی فصیل کے اندر آج کئی بستیاں آباد ہیں۔ اس کے مشرق میں شہر کا سب سے بڑا جیل خانہ اور دوسری طرف دماغی امراض کا ہسپتال اور مغرب میں بادام واری ہے۔

۰۔ (اصل : بشیر اختر

ترجمہ : غلام نبی ناظر) ۔۰

نشاط باغ :۔ زبرون سلسلۂ کوہ کے دامن میں ڈل جھیل کے کنارے پر واقع نشاط باغ ملکہ نورجہاں کے بھائی آصف خان نے ۱۶۳۳ء میں بنوایا ہے۔ جب شاہجہاں نے اس باغ کو دیکھا تو اُس کا دل مچل اُٹھا جس کا اشارہ اُس نے آصف خان کو بار بار دیا لیکن آصف خان نے سُنی ان سُنی کر دی۔ اس پر بادشاہ برانگیختہ ہُوا اور ہاروَن میں ہی وہ سارا پانی بند کروا دیا جس سے باغ کی رونق تھی۔

پانی بند ہونے کی وجہ سے آصف خان سخت پریشان ہُوا۔ کہتے ہیں کہ اسی پریشانی کے عالم میں ایک دن اُس پر غنودگی طاری ہوئی۔ اُس کے ایک وفادار ملازم نے جا کر بند کئے گئے پانی کو چھوڑ دیا جس سے فوّارے اٹھکیلیاں کرنے لگے اور آبشار جھُوم اُٹھے۔ آصف خان نے جب آنکھیں کھولیں تو فوراً اس معاملے کی تحقیقات کا حکم دیا۔ اس پر ملازم نے اُس سے کہا کہ "آپ کا دُکھ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور اسی لئے بند پانی کو چھوڑ دیا۔" آصف خان نے ملازم کو برطرف کیا لیکن

دریافت کرنے پر جب ملازم نے بادشاہ کے سامنے اقبال جرم کیا تو بادشاہ اُس کی وفاداری پر خوش ہوگیا اور آصف خان کے نام فرمان جاری کیا کہ وہ اس شرط پہ نہر کا پانی استعمال کر سکتا ہے کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

ابتدائی ایام میں نشاط باغ دامنِ کوہ سے لیکر ڈل کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بارہ بُرجوں پر بارہ طبقے تھے۔ باغ کا پائین طبقہ اب سڑک کی زد میں آگیا ہے۔

نشاط باغ کی لمبائی ۱۷۵۵ فٹ اور چوڑائی ۱۱۰۷ فٹ ہے۔ باغ کے گرد دیوار کے سامنے کے حصے کی اونچائی ۱۳ فٹ ہے۔ موجودہ باغ دس طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے تین طبقے ایک دوسرے سے ۱۶ سے ۱۸ فٹ اونچے ہیں۔ سارے باغ میں اوپر سے نیچے تک درمیان میں تالاب بنے ہوئے ہیں جن میں سے ۱۳ فٹ چوڑی اور ۸ انچ گہری نہر بہتی ہے۔ نہر کے دونوں کناروں پر پتھر کی سلیں لگائی گئی ہیں۔ نہر میں فوارے قطاروں میں لگے ہیں۔ نشاط باغ کے آبشاروں میں کچھ آبشاروں کی اونچائی ۱۲ سے ۱۸ فٹ تک ہے۔ آبشاروں پر بیٹھنے کیلئے ہموار اور چکنی سلیں لگائی گئی ہیں۔

باغ میں دو بارہ دریاں تھیں۔ ان میں سے ایک پہلے طبقے میں اور دوسری اُوپری طبقے میں۔ لیکن باغ کی اصل ترتیب کے حساب سے بارہ دری تیسرے طبقے میں تھی۔ نچلے طبقے کی بارہ دری اب اُٹھالی گئی ہے۔ پہلی دو منزلہ بارہ دری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ یہ لمبان اور چوڑان میں ۵۹×۴۸ تھا۔ بارہ دری میں ایسی پنجرہ کاری کی گئی تھی کہ دل خوش ہوتا تھا۔ اس کے عین بیچ میں ۱۶ فٹ چوکور تالاب تھا جس میں فوارے لگے تھے۔ بارہ دری کی دوسری منزل میں مشرق سے مغرب کی جانب گزرگاہ تھی اور بائیں طرف ۲۵ فٹ لمبا اور ½۱۶ فٹ چوڑا ہال نما کمرہ۔ اس میں بھی پنجرہ کاری کی ہوئی تھی۔ بارہ دری کے دائیں طرف بھی اسی طرز کا ایک چھوٹا ہال نما کمرہ تھا۔ دوسرے طبقے کے درمیان ۲۷ فٹ چوکور خالی جگہ تھی جس میں سے پہلی منزل میں تالاب کا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ بارہ دری کے سامنے والے طبقے پر فوارے لگا تالاب تھا۔

دوسری بارہ دری سب سے اوپر کے طبقے میں ہے جہاں سے پورے باغ کا نظارہ دکھائی دیتا ہے ۔ یہ ایک منزلہ بارہ دری ندی کے آرپار بنی ہے جس پر ایک بالاخانہ ہے ۔ بارہ دری کے نچلے والے طبقے میں بھی ۳ فٹ گہرا ، ۱۲۳ فٹ لمبا اور ۱۰۷ فٹ چوڑا تالاب ہے جس میں ۲۵ فوارے ہیں ۔

باغ میں چھاؤں میں بیٹھنے کے لئے چنار کے قدآور درخت ہیں ، پگڈنڈیوں کے ساتھ ساتھ سرو کے درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہیں ۔ باغ کے عقب میں پہاڑی اور سامنے ڈل جھیل ایک حسین اور دلفریب منظر پیش کرتے ہیں ۔ نشاط کی صُبح دیکھنے اور نظارہ کرنے کے لائق ہے جب ڈل کا لہروں سے کھیلنا اور پرندوں کی چہچہاہٹ قلب و نظر کو سکون عطا کرتے ہیں ۔ اگلے وقتوں میں باغ میں چراغوں سے چراغاں کیا جاتا تھا لیکن مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں یہاں بجلی سے چراغاں کرنے کا انتظام کیا گیا ہے ۔

جس وقت باغ بنایا گیا اُس وقت اس میں اندر آنے کے لئے ڈل کی طرف سے راستہ تھا ۔ لیکن اب باغ کے دو طبقوں کو مسمار کر کے راستہ بنایا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ ڈل کے کنارے کے ساتھ کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے جہاں بیساکھی پر دوکاندار اپنی دوکانیں سجاتے ہیں ۔

افغان دور میں عظیم خان (۱۸۱۴ء) نے باغ کی مرمّت کی ۔ اُس کے بعد ڈوگرہ گورنر پنّو (۱۸۵۷ء) نے یہ فرض انجام دیا ۔ اس کے علاوہ اُس نے باغ میں ایک اور بارہ دری بھی تعمیر کرائی تھی ۔ لیکن اِس وقت اس بارہ دری کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا ۔ سکھ دورِ حکومت میں باغ کی بارہ دریوں میں سے لعل و جواہر نکال کر اُڑا لئے گئے ۔ شیخ محمد عبداللہ کے عہد وزارت کے دوران ۸۰-۱۹۷۸ء میں باغ کی نئے سرے سے مرمّت کی گئی ۔

۔۔ (اصل : موتی لال ساقی

ترجمہ :۔ غلام نبی ناظر) ۔۔

کتاب نامہ

- ABUL FAZL : AIN
- HASSAN : TAREEKH
- BATES : GAZETTEER
- LAWRENCE
- BERNIER FORSTER
- BROWN
- BAMZAI A,K : HIST
- STEIN : RAJ. GEOG.
- SOFI : KA'SHEER
- TEMPLE
- TUZK
- AKADEMI
- KAUL : KASHMIR

جان محمد آزاد

آصف جاہ کا خواب

حدِ نظر تک ——

نشاط باغ میں مرجھائی ہوئی کلیاں نظر آ رہی تھیں ۔ بے رنگ و بو — بے برگ و ثمر — !

پھولوں کے چہرے زرد پڑ چکے تھے ۔ ماحول میں ایک بے نام سی ویرانی چھائی ہوئی تھی !

آصف جاہ ایک عظیم چنار کی چھاؤں میں لیٹا ہوا تھا ۔ سُرخ پتے اپنی ٹہنیوں سے گرتے جا رہے تھے ۔ نشاط باغ کی خزاں نصیب سطح پر زرد اور سُرخ پتوں کی ایک شطرنج سی بچھ گئی تھی ۔ پتوں کی پازیب بج اُٹھنے کے ساتھ ہی آصف جاہ کے دماغ میں ایک آندھی سی اُٹھی ۔ اس کی پلکیں بھیگ گئیں ۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی رگوں میں لہو کی جگہ صرف آنسو بھرے ہوئے ہیں ۔ اُس کی رُوح کی گہرائیوں میں ایک کہرام سا مچ گیا تھا ۔ اُس کا حسین خواب — اُس کی عیش و انبساط کی پیکر تمنّا — اُس کی نظروں کے سامنے پگھل پگھل کر ٹپک رہی تھی ۔ ! اور پر زبرون کی برف ملبوس چوٹیوں سے دُور اُفق کی سرحدوں کے اُس پار گہرا نیلا آسمان خاموش اور گم سُم تھا اور سامنے جھیل ڈل کی پُرسکون سطحِ آب کانپ سی رہی تھی ۔

جھیل ڈل کے کنارے شاہ جہاں کے شاہکار شالیمار سے تین میل دور نشاط صبح کے تارے کی

طرح دمک رہا تھا۔ یہ اتنا تابدار تھا کہ یہ کسی طرح سچ معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس الف لیلوی خواب کو حقیقت بنانے میں آصف جاہ نے بے پناہ عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ مہابت خان کے بعد وہ مُغلیہ سلطنت کا اہم ترین رکن تھا۔ نورجہان کا بھائی ہونے کے علاوہ اُس کی بیٹی شاہ جہان سے بیاہی ہوئی تھی۔ برسوں کی کاوشوں کے بعد آخر وزیرِاعظم آصف جاہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا اور نشاط باغ کی وسیع و عریض جنّت کی ترتیب و تہذیب مکمل ہوگئی۔ باغ نے اپنے قدرتی محلِ وقوع، سدابہار چناروں، شاداب بارہ دریوں اور دلفریب پہاڑی پس منظر کی وجہ سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ یہ عوام و خواص کا محبوب بن گیا۔ اربابِ سلطنت جوق در جوق آکر آصف جاہ کے ذوق کی داد دیتے رہے۔!

آصف جاہ بپیکر حُزن و ملال، چنار کے سائے میں لیٹا اپنی سوچوں میں گم تھا۔ نشاط کی کل تک کی رعنائیاں اُسے یاد آ آکر تڑپا رہی تھیں۔ اُسے وہ دن بھی یاد آیا جب بادشاہ شاہ جہان تے باغ کا شہرہ سُن کر نشاط باغ کی سیر کی۔ اُس روز صبح صادق ہی بادشاہ اپنے سرکردہ رفقا کے ہمراہ نشاط باغ آگیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ جھیل ڈل کی مخملی لہریں آآکر باغ کی مغربی دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ بادشاہ تے محسوس کیا کہ جھیل کا سحر انگیز حسن باغ کی دل کشی میں مدغم ہو کے رہ گیا ہے اور دونوں نشاط اور جھیل قدرت کے پُرجلال حُسن کے دو نادر مظاہر جیسے ایک ہی سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ شہنشاہ نے دیکھا کہ باغ کو اپنی آغوش میں لی ہوئی پہاڑ کی چوٹیوں کے اُس طرف آفتاب کی ارغوانی کرنیں نشاط کی شاداب سطح پر جگمگا رہی ہیں۔ شاہ جہاں باغ کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر آصف جاہ سے اپنی پسندیدگی کا بار بار اظہار کرنے لگا۔

"سُبحان اللہ۔ وزیرِاعظم! نشاط کی یہ طلسماتی فضا، اس کی یہ شگفتگی اور اِس میں جگمگاتی ہوئی اِن ضیاپوش کرنوں نے ہمارا دِل باغ باغ کیا ہے۔ واللہ۔ رنگوں کے اِس سمندر نے تو اِسے رشکِ ارم بنا دیا ہے۔!"

بادشاہ نہ جانے اور کیا کیا کچھ کہتے رہے۔ لیکن آصف جاہ کے لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت تھی۔ شہنشاہ کا یہ خیال تھا کہ آصف جاہ اُن کی اِس زبردست پسندیدگی کو ملحوظ رکھ کر باغ اُن کی نذر کرے گا۔ لیکن آصف جاہ تے بادشاہ کے عزائم کو سمجھنے کے باوجود چپ سادھ لی۔ اُس نے خوابوں کی

جس محبُوبہ کو برسہا برس تک اپنے دل میں بسایا تھا اس سے بھلا وہ کیسے دست بردار ہو سکتا تھا۔!

آصف جاہ کی اِس خاموشی اور سرد مہری نے شہنشاہ کو مغلوب الغضب کیا۔ وہ سوچنے لگا "کیا آصف جاہ اپنے بادشاہ کی خواہش سے ناآشنا رہنا چاہتا ہے۔ اُس کی یہ بے مروّتی اور بے نیازی ہمارے آتشِ شوق کو اور بھی ہوا دے رہی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کب تک ہمارے ذوق کی تسکین سے احتراز کرتا رہے گا۔!"

اُسی روز شالیمار کی روشوں پر مقتدر اُمرا اور صلاح کاروں سے مشورے ہونے لگے۔ بادشاہ اپنے جمالیاتی شعور سے یہ جان گیا تھا کہ شالیمار باغ جھیل ڈل کے کنارے پر واقع ہونے کے باوجود کنارے سے بہت دور تھا۔ چنانچہ جھیل اور شالیمار کے درمیان ایک جھیل لمبی نہر کھودی گئی تھی جس کے دونوں اطراف پر چناروں کے گھنے سائے پانی میں منعکس ہو کر ایک حسین منظر پیش کر رہے تھے۔ لیکن جھیل باغ کے مجموعی حسن میں کوئی اضافہ نہیں کر پا رہی تھی۔ کیونکہ الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے اُس کی اپنی ایک جداگانہ حیثیت تھی۔ شالیمار باغ کے بیچ سے جو نہر گذرتی تھی اُس کے لئے پانی کا ایک نالہ ہارون سے خصوصی طور لایا گیا تھا۔ اِس نالے کے پانی کو کسی بھی اور مقصد کے لئے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا تھا لیکن نشاط باغ کی تعمیر پر وزیر اعظم آصف جاہ نے خصوصی رعایت کے تحت اپنے باغ کے لئے اسی نالے کا پانی حاصل کیا تھا۔

طویل مذاکرات کے بعد شاہ جہان نے ایک حکم جاری کیا جس کے تحت نشاط کو جانے والی نہر کاٹ دی گئی۔ خیاباں کو سیراب کرنے والا پانی رک گیا جیسے نشاط کی شہ رگ کاٹ دی گئی ہو۔ چند ہی دنوں میں نشاط باغ ویران اور سنسان ہو گیا۔ اُس کے قلب میں اُچھلتے کودتے فوّارے، اُس کے حسین آب شار اور سحر انگیز شادابیت ماند پڑ گئی۔ آصف جاہ اُس عظیم چنار کے نیچے لیٹے ہوئے اپنے حسین خواب کی ویرانی پہ تصویرِ غم بنا ہوا تھا۔ اُس کے چاروں طرف سُرخ اور زرد پتوں کی بہار سی آئی ہوئی تھی! ننھے ننھے غنچوں نے اپنی پلکیں بند کر لی تھیں۔ پھول آنے والی بہار کے انتظار میں مرجھا گئے تھے۔ باغ کے ایک دُور افتادہ گوشے میں بےچارہ مالی اپنے مالک کے اِس حزن و ملال پر دل برداشتہ

تھا۔ وہ مالک کی یہ بے قراری برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ کئی دنوں سے یہ ناخوشگوار نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ایک سچے مالی کی طرح اُس کی اپنی ذات بھی پژمردہ ہوتی جارہی تھی۔ اچانک اپنی وفاشعاری سے اُس کے دل میں عزم واعتماد کی ایک نئی کائنات پیدا ہوئی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ سرکاری نگہبانوں سے چھُپ چھپا کر شاہی حکم کے خلاف نشاط باغ کو پانی کی فراہمی بحال کرے گا۔! چاہے اِس جُرم کی پاداش میں اُسے دارورسن کی آزمائشیں ہی کیوں نہ جھیلنی پڑیں۔

دوسرے دن صبح جب آصف جاہ بیدار ہوا تو یہ دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ باغ کے بیچوں بیچ زندگی کا دریا بہہ رہا ہے۔ آصف جاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے خزاں زدہ گلستان میں بہاروں کے کارواں آگئے ہوں۔ آصف جاہ اپنے مالی کی وفاشعاری سے بے حد متاثر ہوا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اُسے بادشاہ سلامت کے غیظ وغضب کی یاد آئی۔ وہ تھرا اٹھا اور اپنے مالی کو حکم دیا کہ پانی کو روک دیا جائے۔!

شہنشاہ کو اطلاع ملی تو اُس نے ملزم کو اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا۔ مالی کو شاہ جہاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر بادشاہ سے رحم کی بھیک مانگتے ہوئے کہا:

" صاحب عالم! میری اِس لغزش کو ارادہ توہین پر محمول نہ کریں۔! میرا جرم تو صرف اتنا ہے کہ میں اپنے مالک کی اُداسی اور ویرانی نہیں دیکھ سکا۔ میرے مالک نشاط کو بغیر پانی کے ویرانے میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے اور میں اپنے مالک کو یہ غم برداشت کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی لئے اُس غلام نے ہارون سے آنے والی نہر کا رُخ نشاط کی جانب موڑ دیا۔ اِس امر کے باوجود کہ یہ سب حضور والا کے احکامات کے سراسر منافی ہے اور اس میں بلاشبہ تاجدار ہند کی دِل شکنی کا احتمال ہے۔ غلام اپنی سنگین غلطی کا اقرار کرتا ہے اور ہر اُس سزا کو بھگتنے کے لئے تیار ہے جو شہنشاہِ جہاں غلام کے لئے مناسب تصور کرتے ہیں۔!"

شاہ جہاں مالی کی باتوں اور اُس کی دلائل سے بے حد خوش ہوئے۔ وفاداری کے زبردست احساس نے اُسے اس غلطی کا مرتکب بنایا تھا۔ بادشاہ کو پہلی بار جذبات کے گہرے میں

حقیقت کی کرن نظر آئی۔ وہ اٹھ کر آصف جاہ کے پاس آئے اور اسے والہانہ طور گلے لگایا۔ مالی کو خلعت سے نوازا گیا۔ نشاط کے لئے پانی کی فراہمی بحال کی گئی۔ آصف جاہ کی کابینات، زبانِ برف کی اس شعلہ بیانی پر جھوم جھوم رہا تھی ——!

○

قلم کاروں سے گذارش

- مضامین وغیرہ صفحے کے ایک طرف خوشخط لکھکر روانہ کریں
- "شیرازہ" کے لئے روانہ کردہ تخلیقات بغیر اطلاع دئے کسی اور رسالے کو نہ بھیجیں۔ تکرار اشاعت پر ادارہ معاوضہ دینے سے معذور ہوگا۔
- صرف غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ تخلیقات ہی بغرض اشاعت روانہ کریں.
- نگارشات پر اپنا پورا نام اور مکمل پتہ لکھنے کے علاوہ "غیر مطبوعہ" لکھنا نہ بھولیں۔

تین نوشتے

کشمیری انسائیکلوپیڈیا سے

کشمیری زبان کا پہلا انسائیکلوپیڈیا کلچرل اکیڈمی کا بہت اہم منصوبہ ہے۔ اس کی پہلی جلد جو ریاست کے آثار قدیمہ کا احاطہ کرتی ہے، شایع ہو کر صاحب نظر حضرات کی پسندیدگی حاصل کر چکی ہے۔ اردو قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم نے اس جلد کے ترجمے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اب تک ۴۹ نوشتوں کا ترجمہ پیش کیا جا چکا ہے زیر نظر شمارے میں مزید تین نوشتوں کا ترجمہ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

㊿ پوشکر

پوشکر سری نگر کے مغرب میں کارکوٹ پوکی کے دامن میں کھاگ اور فیروزپور کے درمیان آباد ہے۔ اس کا پرانا نام پُشکر رہا ہے۔ یہاں ایک چشمہ ہے جسے پشکر ناگ کہتے ہیں اور جہاں بہت پرانے وقتوں سے میلہ لگتا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء تک بھی کشمیری پنڈت ساون پورنیما کے موقعے پر وہاں اشنان کیلئے جایا کرتے تھے۔ اب بھی کوئی کوئی عقیدت مند وہاں اشنان کیلئے پہنچتا ہے۔ چشمہ تواب گاؤں کے مشرق میں ہے جہاں اس کے تین طرف رہائشی بستی ہے۔ مشرقی جانب جگہ کھلی ہے اور یہیں سے چشمے

کا پانی باہر آتا ہے۔

پشکرناگ کا ذکر تو اولائینل مت پُران میں آیا ہے اور وہاں درج ہے کہ اس چشمے میں اشنان کرنے والے کو اتنا اجر ملتا ہے جتنا کہ رات بھر وید منتروں کا پاٹھ کرنے پر ملتا ہے۔ لیکن راج ترنگنی اس تیرتھ کے بارے میں خاموش ہے۔

اگلے وقتوں میں پُشکرناگ پر کونسی تعمیرات رہی ہیں، ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ البتہ کنارہ بندی کے لئے چشمے کے اردگرد پتھر کی ہموار سلیں بچھی ہیں جو کم و بیش ابھی تک برقرار ہیں۔ مقامی باشندوں کا کہنا ہے کہ گذرے ایّام میں چشمے کے آس پاس بڑے بھاری اور کشادہ پتھر بکھرے پڑے تھے جنہیں شاید بعد میں لوگ نئی عمارتوں میں استعمال کر چکے ہیں۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ ضرور کوئی دھارمک تعمیر رہی ہوگی۔ ۱۹۷۸ء تک پُشکرناگ میں ایک مورتی بھی تھی جس کا چہرہ اگرچہ مسخ ہو چکا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ وشنو کی مورتی تھی۔ مورتی کی بناوٹ کوئی ایسی خوبصورت نہیں تھی۔ اس کا پتھر بھی ایسا ہی تھا جیسا چشمے کے اردگرد لگا ہے۔ قیاساً اس مورتی کا تعلق دسویں گیارہویں صدی عیسوی سے تھا جبکہ کشمیر میں بت تراشی کا فن زوال پذیر ہونے لگا تھا۔ کشمیر میں اور بھی کچھ پُشکر تیرتھ ہیں جن میں سے ایک اِشٹہ بُرمی سوریشوری تیرتھ کے آس پاس رہا ہے۔

٥ — اصل (موتی لال ساقی
اردو ترجمہ : پروفیسر رحمٰن راہی)

کتابنامہ

★ GAIAI ★ STEIN : GEOG ★ BATES.

---

(۴) چیمس گمپہ

[illegible] تعمیر کیا ہوا [illegible] گمپہ [illegible] کا داخلہ [illegible] ہے [illegible] دکھائی دیتا ہے۔ گمپہ کے قریب میں ایک [illegible] ہے۔ [illegible] جو گمپہ کی مختلف تعمیرات [illegible] کے لئے مخصوص [illegible] حصار میں بنی ہوئی ہے۔ گمپہ [illegible] یہاں تک اس کی تعمیر کاری کے اسلوب [illegible] کے ساتھ [illegible] ہے۔

گمپہ کے مندروں میں نہایت خوب صورت چتر چٹانوں پر تراشی ہوئی تصویریں اور مورتیاں ہیں۔ گمپہ اور شاکیہ منی کے مندر نہایت حسین اور دلاویز ہیں۔ گمپہ کے مندر میں الماریوں میں چھپے ہوئے مسودات ہیں۔ مندر کی دیوار پر جہاں جہاں خالی رہی ہیں [illegible] منجوشری، شاکیہ منی اور سونگ کھاپا کے چتر بنے ہوئے ہیں۔ دوسرا مندر زیادہ دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے کیونکہ اس میں چتر کاری اور سنگتراشی کے تین ادوار نظر آتے ہیں۔ سب سے پرانے چتر کاری کے نمونے دیو دیویوں کی صورت میں اُبھارے گئے ہیں۔ یہ پھولوں کے ڈیزائین میں بنائے گئے ہیں۔ عمارات کی جبین، چھتیں گو نقش و نگار سے مزین ہیں تاہم ان نقوش کے بنوانے سے سادگی اور متانت منعکس ہوتی ہے اور اظہار کے اعتبار سے یہ طرز تابو کے ساتھ وابستہ نظر آتی ہے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ سبھی چتر ایک ہی دور میں بنائے گئے ہیں۔ ان کے ڈیزائن ہندوستانیت اور کشمیر کی مخصوص چتر کاری کے رنگ و روپ اُجاگر کر دیتے ہیں۔

شاکیہ منی کی نئی مورت ابھی حال ہی میں تراشی گئی ہے۔ پرانی مورت ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ حالت میں ہے۔ اس مورتی پر اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہوئے گُل کاری کے نمونے منقش ہیں ——— اس طرح ایک منڈل کی سی صورت اُبھرتی ہے جس کو دو شیر کندھا دئے ہوئے ہیں۔ رنگ و روغن میں چتر کاری کے اس قسم کے نمونے پرانے ہیں اور اس قسم کی مثالیں الچی اور سُمدہ گمپوں میں بھی نظر آتی ہیں۔ دوسرے دور کے چتر سولہویں

مندری کے ہیں۔ یہ نمونے عقب کی دیوار کے علاوہ دائیں اور بائیں طرف کی دیوار پر بھی بنے ہوئے ہیں۔ عقب کی دیوار پر زھونگ کھاپا کی دو یکساں صورتیں ہیں۔ اِن صورتوں کے کناروں پر بنائی ہوئیں بودھوں اور لاماؤں کی چھوٹی چھوٹی شبیہیں نہایت جاذبِ نظر ہیں۔ مورت بنانے میں حُسن کاری اور ہُنرمندی کا جو امتزاج نظر آتا ہے وہ ہر لحاظ سے مُستحسن ہے۔ دائیں طرف کی دیوار پر پیتساچ گُرو بدھ کی صورت ہے جو ادویہ کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے۔ بائیں جانب کی دیوار پہ وجیر پانی پر چار مُدرائیں بنائے گئے ہیں۔ یہاں کنول کے پھولوں پر وجیر اور گنٹا میں اکندھوں کے اُبھار دائیں اور بائیں جانب ہیں۔ تیسرے دور کے چتر فن کی تازگی اور شگفتگی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ دائیں طرف کی دیوار پر گہیہ سماجہ کی صورت بنی ہے۔ اسی دیوار پر چار بازوں والا اولوکیتشور بھی بنایا گیا ہے جس کے ہمراہ دیوی بھی ہے اور بائیں طرف شاکھیہ مُن اور تارا کے چتر نظر آتے ہیں۔ دروازے پہ دو محافظوں کے چتر بھی بنے ہیں۔

تعمیرات میں تین اور ایسے مندر ہیں جن میں پرانی مورتیاں موجود ہیں مگر ان میں کوئی نمایاں جاذبیت نہیں ہے۔ گُھمپا کے دائیں طرف سمن روق ہے جس میں پرانے مسودے اور اعلام محفوظ ہیں۔ یہاں بھی دیواروں پہ شاکھیہ مُنی اور زھونگ کھاپا کے چتر دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں سے ایک چھوٹے سے مندر کی طرف راستہ جاتا ہے جس میں میتر کی مورت ہے۔ یہ مورت دُو فٹ اونچی ہے۔

٥ — (اصل : موتی لال ساقی
ترجمہ : جان محمد آزاد)

کتابنامہ

★ FRANCKE ★ SNELLGROVE ★ CHOPRA
★ PEISSAL ★ CONNINGHAM : LADAKH.

(۵۲) پھیانگ گنپہ

لیہہ (لداخ) کے مغرب میں بیس کلومیٹر دور پھیانگ گنپہ پہاڑوں کے دامن میں تعمیر کیا گیا ہے ۔
ساتھ کافی حد تک مناسبت رکھتا ہے ۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ گنپہ سے بہت دور تک گرد
مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ۔

پھیانگ گنپہ کے بانی کندگ گرگس پا رہے ہیں جن کی ایک بڑی مورت نے اسمن روز
میں موجود ہے ۔ نیا سمن ردق کچھ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کیونکہ مندر کا کتب خانہ اسی میں ہے ۔ کندگ
کے علاوہ دم چوس اور گرمید کی ایک بڑی مورت بھی یہاں محفوظ ہے جس کو گیارہواں اوتار تسلیم کیا جا
کی استھاں یہیں دائیں طرف موجود ہیں ۔ محققین کا کہنا ہے کہ پھیانگ گنپہ جمی نمگیال (۵۵۷ء) کا تعمیر
گنپا میں کانسے کی جو مورتیاں ہیں وہ آٹھویں صدی کی ہیں ۔ اولوکیشور ناگ ارجن وغیرہ کی مورتیوں کے علا
بھگوان بدھ کی ابھے مدرا میں ایک مورتی بھی موجود ہے جس میں بھگوان بدھ کو ایستادہ دکھایا گیا ہے ۔
ملمع پر گپت اثر براہ راست دیکھا جاسکتا ہے ۔ جاذبِ نظر اور انمول مورتیوں کے علاوہ پھیانگ گنپہ می
پرانے تبرکات واعلام بھی موجود ہیں ۔ پھیانگ گنپہ کا ایک قابل قدر سرمایہ کشمیری نقش ادگار کی وہ مورت
کا تعلق چودھویں صدی عیسوی سے ہے ۔ کانسی کی مورتیوں کے اس قسم کے نمونے باسگو اور ہمس
ہیں ۔

خانقاہ کی عقب کی دیوار پر وجر دھر اور کھاگرس پا سلسلے کے دلآویز چتر ہیں جن میں
اور ملارپا بھی شامل ہیں ۔

— (اصل :۔ موتی لال ساقی
ترجمہ :۔ جان محمد آزاد)

کتابنامہ

* CONNINGHAM : LADAKH * FRANCKE
* SNELLGROVE * HASNAIN : BUDHIST
